وحشی

رضیہ بٹ

کا زور ختم ہوتے ہی بارش کا دم خم بھی ٹوٹ گیا۔ اب ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ مطلع ابھی تک ابر آلود تھا۔ اور مشرقی سمت بادلوں کی گرج چمک سے تاریک رات کا دل دہل دہل جاتا تھا۔

لاہور کی اس اضافی بستی پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ سڑکوں پر پھرنے اور سکوت کو توڑنے والے آوارہ کتے بھی بارش اور سردی کی وجہ سے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ پکے مکانوں اور قلعہ نما کوٹھیوں کے آگے پیچھے مچلنے والی کچی پکی سڑکوں پر پانی جمع تھا۔ کہیں کہیں سڑکیں بارش کا مقابلہ سینہ تانے کر رہی تھیں۔ پانی ڈھل کر کناروں پر آ گیا تھا۔ اور کنارے کنارے اُگے ہوئے درختوں اور استادہ بجلی کے کھمبوں سے ٹکرا کر ڈھلانی راستے پر نالے کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

منہ زور ہوا اور پُر زور بارش سے موسم بالکل بدل گیا تھا۔ خوش گوار سردی پر طاری ہو گئی تھیں۔

وہ پتلون کے پائنچے اٹھائے، کوٹ کے کالر چڑھائے محتاط قدم رکھتا کیچڑ سے بچتا بچاتا سڑک عبور کر کے گیٹ میں داخل ہوا۔ چمن عبور کرتے ہوئے اس نے گھر پر نگاہ ڈالی۔ سب بتیاں گُل تھیں۔ غالباً گھر والے سو چکے تھے۔

اس نے برآمدے کی بتی جلائی ـــــ چپس کا گلابی فرش چمک اٹھا۔ کیچڑ سے لت پت بوٹ فرش کو داغدار کرتے ہوئے دروازے تک پہنچے گیلے گیلے پلشافی پر جھکے ہوئے بالوں کو اک جھٹکے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے صاف شفاف

فرش پر کیچڑ کے بڑے بڑے داغ دھبے دیکھے۔ اک انوکھی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔
بڑے مسرورانہ انداز میں وہ آگے بڑھا۔

اور

ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے سے لگی برقی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔
ٹرن ـــ ٹرن۔ ٹررن۔ ٹرن۔ ٹررن۔ ٹررن۔
گھنٹی کی آواز پورے گھر میں گونج گئی۔
وہ گھنٹی کو مسلسل دبائے گیا۔
آواز گونجتی رہی۔

اور

رات کا سناٹا اس تیز آواز سے ٹوٹتا رہا۔
اس نے اندرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

اور

پھر ڈرائنگ روم کی بتی روشن ہوتے بھی دیکھی۔
کوئی چپل گھسیٹتا دروازے کی طرف بڑھا بھی۔
چٹخنی کے گرنے کی آواز بھی آئی۔
لیکن
اس نے اپنا ہاتھ گھنٹی سے نہ اٹھایا۔
ٹررن ٹرن کی تیز اور مسلسل آواز نے گھر کے ہر فرد کو نیند سے چونکا دیا۔
کھٹاک سے دروازہ کھلا۔

ساٹھ سالہ مجید نے اس کے سراپا کو خشمناک نظروں سے گھور کر دیکھا۔ آدھ کچی
اور غصے سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔
کوٹ کو پیچھے ہٹاتے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے بڑے بے فکرانہ انداز میں
وہ اندر داخل ہوا۔
بڑبڑاتے ہوئے مجید نے برآمدے کی بتی گل کر کے دروازہ بند کیا اور تحیر آلود
نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے غرایا۔
"یہ وقت ہے گھر آنے کا!"
آصف نے جواب دینے کی بجائے صرف سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ مجید کو غصے سے
بے تاب ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔ لبوں کا مبہم تبسم واضح ہو
گیا۔ نڈر، ڈھیٹ اور ہٹ دھرم بچے کی طرح وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔
مجید اس کے گستاخانہ رویے سے جل اٹھا۔
"جانتے ہو کیا بجا ہے؟" وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے گرجا۔
"بارہ" بڑے سکون سے آصف نے جواب دیا۔ اور اپنے کیچڑ سے بھرے
جوتوں کے تلوے پورے اطمینان سے چمکیلے قالین پر رگڑ کر صاف کرنے لگا۔
"وحشی!" مجید اس حرکت پر بل کھا کر رہ گیا۔ تنفر کا لاوہ اس ایک لفظ میں سمویا
تھا۔ اس کے ہونٹ غصے سے تھرتھرا رہے تھے۔ دانت بھنچے اور ماتھے پر بل پڑے
تھے۔ آنکھوں سے شعلے سے برس رہے تھے۔
اک لمحہ کو آصف نے گردن موڑ کر مجید کو گھورا۔ کالی کالی گہری اور خوبصورت آنکھیں
شعلہ فشاں ہو گئیں۔ جوان خون میں ابال اٹھا۔ اس کا جی چاہا۔ اس بڈھے کھوسٹ کا سر
دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش کر دے۔
گنوار ـــ بدتمیز ـــ مجید اس کی ذہنی کیفیت سے قطعاً بے خبر غصے سے گرج

اٹھا۔ میں خاموشی سے تمہارا منہ دیکھے جا رہا ہوں۔ اور تم بڑھتے ہی جا رہے ہو — میں تمہاری یہ گستاخانہ حرکتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تم سے تنگ آ چکا ہوں۔ تم میرے ذہن سے چپٹے ہوئے انگارے کی طرح چپٹے ہوتے ہو — میرا سکون تم نے غارت کر دیا ہے —!

آصف کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ بھنچے لبوں پر پھر وہی تبسم لہرایا۔ آنکھیں پہلے سے زیادہ چمک اٹھیں۔ فاتحانہ انداز سے اس نے مجید کو دیکھا۔

وہ

اسے اس مجرم کی طرح لگا جس نے سزا کی صعوبتوں کے بعد اعترافِ گناہ کر لیا ہو۔

وہ غصے سے بل کھاتے مجید کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

اور

مجید اس مسکراہٹ سے جل اٹھا — آصف کو بے نقط سنا ڈالیں۔ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس کی گرجدار آواز سے گھر والے تو گھر والے ہمسائے بھی جاگ اٹھیں گے۔ لیکن وہ بھی مجبور تھا۔ تنگ آ کر یوں بک جھک رہا تھا۔

آصف کی مسکراہٹ مدھم سی ہنسی بنتی جا رہی تھی۔

"وحشی!" مجید نے نفرت کا بھرپور وار کیا۔

آصف کے ہونٹوں سے تبسم ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اس پر پھر وہی طوفانی کیفیت لہرائی۔

غصے سے اس نے کمرے کے وسط میں پڑی میز کو دھکیلا۔ چینی کا خوبصورت اور بڑا سا گلدان الٹ کر گرا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

نقصان کی پرواہ کیے بغیر اس نے کرسیوں کو بوٹ کی ٹھوکر سے اچھالا۔

اور

پردہ درمیان میں حائل نہ ہوتا تو شیشے کی نوکیلی کرچی اندر سے آنے والی منیرہ کے چہرے پر لگی۔

"دیکھ لو اپنے لاڈلے کے کرتوت!" مجید منیرہ پر برس پڑا — "یہ گلدان دیکھو۔ راہداری قالین کا حال —"

آصف ماں کو دیکھتے ہی کمرے سے نکل جانے کے لیے دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔

"آصف —!" منیرہ نے کالی چادر سے اپنے سر دی اور پریشانی سے کانپتے جسم کو لپیٹتے ہوئے پکارا۔

اس نے صرف پلٹ کر دیکھا — زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"کب انسان بنو گے آصف؟" ماں کے لہجے میں غصہ بھری بیچارگی تھی۔

"انسان؟" — اس نے سر تا پا ماں کو گھورا — اس کی نظروں میں جانے کیا تھا۔ منیرہ نگاہوں کی تاب نہ لا کر میز پر جھک گئی۔

"بدتمیز کہیں کا —!" مجید غرایا — "ایک تو رات کے بارہ بجے کہیں سے آوارد ہوا۔ اس پر ڈھٹائی اور بدتمیزی اتنی —"

مجید غصے میں جانے کیا کیا کہتا رہا۔ منیرہ قالین پر بکھری کرچیاں چنتے دل تھام کر سنتی رہی۔

اور

وہ

پتلون کی جیبوں میں اسی انداز میں ہاتھ ڈالے سینہ تانے کھڑا رہا۔

ہار کر مجید کمرے سے نکل گیا — غصے سے بل کھاتا — بڑبڑاتا وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔

"کچھ تو شرم کرو — ذرا اپنے قد بُت پر نظر ڈالو — اور اپنی حرکتوں پر
لو! آرام نہ اپنے نصیبوں میں ہے — نہ دوسرے کو کرنے دیتے ہو — ناک
میں دم کر رکھا ہے۔ چار دن سکون سے گزرتے ہیں۔ پھر وہی بک بک —
اب نیا وطیرہ شروع کیا ہے۔ شرارتوں کا کام ہے۔ یوں رات کے بارہ بجے
ایک ایک بجے گھر آنے کا — ؟ لاکھوں دفعہ کہہ چکی ہوں۔ دیر سے آنا ہی ہوتا
ہے تو پچھلی طرف سے آجایا کرو۔ مجال ہے جو بات سنو — آنا بھی ادھر سے
ہوتا ہے اور گھنٹی بھی یونہی بجانا۔ گھر والے تو کیا محلے والے بھی جاگ جاتے ہیں۔"

"ہونھہ —" آصف نے اس دُھواں دھار تقریر سے کوئی اثر نہ لیا اور
جانے کو قدم اٹھائے۔

"دن بدن گستاخ ہوتے جا رہے ہو — آخر تمہیں ہوتا کیا ہے۔ دورہ پڑ جاتا
ہے — تنگ کرنے کا؟

آصف کے چہرے پر کرخت سی بیچارگی لہرائی لیکن دوسرے لمحے وہ مسکرا رہا
تھا۔

"بدتمیز — باپ کی عادت کا پتہ بھی ہے — پھر —!"

"باپ!" منیزہ کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی جیسے بم پھٹ پڑا۔ اس کے
ہونٹ بھنچ گئے — خوبصورت سیاہ آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھے۔ خوبصورت
چہرے کا تناؤ مہیب نظر آنے لگا۔

چند لمحے پہلے کا آصف سرتاپا بدل گیا — وہ کالے بادلوں کے سینے میں
مضطرب اور بے قرار بجلی کی طرح نظر آنے لگا۔

بجلی

جو خاموشی سے نہیں۔

گرج اور کڑک کے ساتھ کسی کا خرمن جلانے کو بے قرار ہوتی ہے۔ چند لمحے
گھورتا رہا۔

پھر

پلٹا۔ میز کو زور سے دھکیلا۔

راہ میں پڑی گدے دار کرسی الٹ کر الماری سے لگی، شیشے کی الماری میں سجاوٹ
اور آرائش کی کئی خوبصورت اور نایاب چیزیں ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ الماری کا
شیشہ بھی چھناکے سے زمین پر آرہا۔

تیرا بیڑا غرق آصف — تیرا ستیاناس — ! جاہل ماؤں کی طرح جوان بیٹے کو
لوسنے دے کر وہ اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے لگی۔

آصف جوش میں بھرا پردہ ہٹا کر کوریڈور میں نکل گیا۔

ساتھ والے کمرے کے دروازے میں ثوبیہ آنکھیں ملتے اس ہنگامے کو سمجھنے
کی کوشش کر رہی تھی۔

آصف کی طرف اس نے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن وہ خشم ناک نظروں سے اسے
گھورتا آگے بڑھ گیا۔

شیشے اور چیزوں کے ٹوٹنے کی آواز پر مجید بھی کمرے سے نکل آیا تھا۔ آصف نے
اس پر بھی قہر آلود نگاہ ڈالی۔

اور

سیدھا اوپر جانے والے زینے کی طرف گیا۔

دھپ دھپ کرتا وہ سیڑھیاں چڑھا۔ تیزی سے گیلا صحن عبور کیا اور تیر کی تیزی
سے اپنے کمرے میں جا گھسا۔

کمرے کے وسط میں جا کر وہ رک گیا۔

کتنی ہی دیر وہ سینے پر ہاتھ باندھے اندھیرے میں کھڑا رہا۔ سوچوں میں اتنا مستغرق کہ اپنے وجود سے بھی بے خبر نظر آنے لگا۔

معاً بجلی زور سے کوندی اور آصف کو اپنے آپ کا احساس ہوا — بے دلی سے بڑھ کر بتی جلائی۔

برقی قمقمے کی تیز روشنی میں کمرے کی ہر چیز صاف طور پر نظر آنے لگی۔

اس نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ کشادہ کمرے میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ پلنگ، کرسیاں، میز، چھوٹا سا قالین — پڑے — لیکن ہر چیز بے ترتیب تھی۔ پلنگ پر صبح کے اتارے ہوئے کپڑے تھے — میز پر پلنگ پوش، سلیپر اور بوٹ منٹل پیس کے پاس بکھرے تھے۔ شیو کا سامان چمڑے کے اٹیچی کیس پر رکھا تھا۔

لیکن وہ اس وقت وہ سامان کی بے ترتیبی پر غور نہیں کر رہا تھا۔ اسے اپنا اس کمرے کی کشادہ چھت تلے گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ نفرت کا جال گسل دل و دماغ کو انگارے کی طرح جلا رہا تھا۔

حبس ہی حبس کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے ٹائی کھول دی۔

کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا۔

اور کرسی پر پیر رکھ کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔

کیچڑ آلود بوٹ دیکھ کر اسے ڈرائینگ روم کا قالین یاد آگیا — جسے کچھ پہلے اس نے دانستہ کیچڑ آلود کیا تھا۔

ادھ کھلے تسمے چھوڑ کر وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس نے ایسا کیا تھا؟ اس گھر کی چیزیں خراب کر کے اسے کیا ملتا تھا!

وہ

اپنے احساسات کا تجزیہ کرنے لگا۔

جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تو اس کا دل و دماغ سب تھک چکے تھے۔ صرف یہ احساس باقی تھا۔ کہ یہ سب کچھ دانستہ یا نادانستہ وہ صرف مجید کو زک دینے کے لیے کرتا ہے۔ مجید کو غصے سے تلملاتا دیکھ کر اسے انجانا سا سکون ملتا ہے ایسی روحانی لذت ملتی ہے جس سے وہ سرشار ہو جاتا ہے۔

مجید کی خوشی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ جب بھی اسے حد سے زیادہ مسرور دیکھتا ہے۔ تو لاشعوری یا شعوری طور پر ایسی حرکات کرنے لگتا ہے۔ جس سے اس کی خوشی کا احساس ختم ہو جائے۔ اذیت سے بلبلا اٹھے۔ غم و غصے سے جھلا جائے، تکلیف سے تڑپ اٹھے۔

اور

اس لمحہ اسے خوشی، مسرت اور طمانیت کی لہریں اپنی روح کی گہرائیوں میں اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔

ان دنوں رات بارہ بارہ ایک ایک بجے آنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ گھنٹی مسلسل بجا کر نیند سے بیزار کرنا بھی اسی عمل کا ایک حصہ تھا۔ اور آج جب مجید غصے سے کھول کر پھٹ پڑا تھا۔ تو اسے خوشی کا وہ لمحہ میسر آگیا تھا جس کے لیے وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ اور جس کے لیے اس کی روح بے چین تھی۔

اس کے اس دورے کی محرک اکثر کوئی معمولی سی بات یا واقعہ ہوتی۔ پچھلے ہفتے عامر کا لندن سے خط آیا تھا۔ اس نے اپنا پہلا انجینئرنگ کا امتحان کامیابی سے پاس کیا تھا۔ مجید پر نومیدی روشن اور مسرور چہرے سے منیرہ کو سنا رہا تھا۔ نیلے لفافے کی عبارت اس کے گوش گزار کر رہا تھا۔

ایرمیل کا نیلا لفافہ آصف کے ذہنی تناؤ کا باعث بن جایا کرتا تھا۔ اس لفافے سے اس دفعہ مجید کی مسرتوں کا سرچشمہ پھوٹتے دیکھ کر وہ بے قرار ہو گیا تھا۔

اور

یوں ہفتہ بھر دیر سے گھر لوٹ کر مجید کو سنا کر جیسے اس نے اپنی اس بیقرار آنچ کو پانی کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر لیا تھا۔

ایسا کیوں تھا ——؟

اس کیوں کا جواب

سولہ سترہ سالوں کے طویل سپنوں پر محیط تھا۔

—— ٭ ——

رات

گناہ گار دل کی طرح تاریک تھی۔ بادلوں کی مہیب گرج چمک سے دل دہل رہا تھا۔ آندھی کا انداز مجنونانہ تھا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کو بیچ بیچ کر مار رہی تھی۔ بڑے بڑے پتھر بھی اس کے جنون سے عاجز آ کر ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔

آصف اس ہولناک سمے میں اس عمودی چٹان پر چڑھ رہا تھا جس کے دائیں طرف خوفناک کھڈیں منہ پھاڑے تھیں۔ اور بائیں جانب تند سے بہتا ہوا دریا تھا۔ اونچے اونچے پتھریلے کناروں سے سر پٹختا دریا ہیبت ناک شور مچا رہا تھا۔

آصف جس راستے پر چڑھ رہا تھا۔ وہ اتنا غیر محفوظ اور تنگ تھا۔ کہ اس کے پاؤں کی معمولی سی لغزش بھی اسے یا تو عمیق کھڈوں کے تاریک سینے میں دفن کر سکتی تھی۔ یا کف آلود موجوں والے تند و تیز دریا کے حوالے۔

لیکن

وہ اوپر چڑھنے کی پوری پوری جد و جہد کر رہا تھا۔ خود رو جھاڑیوں کو مضبوطی سے تھامے آگے بڑھ رہا تھا۔ آندھی کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے پتھر لڑھکتے آتے۔ آصف اک سمت سمٹ کر ہٹ جاتا۔ پتھر اک خوفناک آواز کے ساتھ یا تو دریا برد ہو جاتے یا گہری کھڈوں میں گر جاتے۔

غیر محفوظ ہونے کا احساس جان لیوا تھا۔ آصف سہما سہما آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے پاؤں کے تلووں پر آبلے بنا دیکھے نظر آ رہے تھے اور ان آبلوں سے پھوٹتی

درد کی لہروں کو بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی زخمی تھے۔ خاردار جھاڑیوں کو مضبوطی سے تھامنے کی وجہ سے اس کی ہتھیلیاں لہولہان تھیں۔

بجلی زور سے چمکی۔

آصف نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا اور خون کے دھبے تار تار لباس پر جم گئے تھے۔ اسے اپنے آپ پر شدت سے رحم آنے لگا۔ کچھ دیر ستانے کے خیال سے اس نے ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے پناہ لی۔

اندھیرے کا خوف دُور کرنے کے لیے اس نے جیب سے ماچس نکالی۔ دیا سلائی جلانے کی کوشش تند ہواؤں نے ناکام بنا دی۔

ایک

دو

تین

اس نے یکے بعد دیگرے کئی تیلیاں جلا ڈالیں ـــــ آتش گیر مادہ ایک بے ثبات لمحے کی طرح غائب ہو جاتا۔ جھلا کر اس نے ماچس پھینک دی۔ لیکن اندھیروں سے بچنے کی فطری خواہش نے اس کا دامن نہ چھوڑا ـــــ وہ روشنی کے کسی اور ذریعے کے متعلق سوچنے لگا۔

اچانک برق و باراں کا طوفان امنڈ پڑا ـــــ عمودی چٹان سے پانی بہتے بہتے دریا کی صورت اختیار کر گیا۔

اس نے محسوس کیا۔ کہ وہ اس وزنی پتھر سمیت اس بہتے دریا میں ہچکولے کھانے لگا ہے۔

وہ تیزی سے نشیب کی طرف لڑھکنے لگا۔

اک خوفناک چیخ اس کے لبوں سے نکلی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اور

جب آنکھیں کھولیں

تو

سماں بدلا ہوا تھا۔

وہ ایک شاندار اور آراستہ خواب گاہ کے نرم نرم پلنگ پر پڑا تھا۔ ریشمی بستر معطر تھا۔ اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا انگ انگ ٹوٹ چکا تھا ـــــ اس نے اپنے وجود پر نظر ڈالی۔ جا بجا پٹیاں بندھی تھیں۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ماتھے پر بھی پٹی تھی۔

اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کمرہ انتہائی نفاست سے آراستہ تھا چیزیں بیش قیمت اور حسین تھیں۔ سامنے والی کھلی کھڑکی سے باہر کا پُرفضا منظر نظر آ رہا تھا۔ نرم نرم ہواؤں کے معطر جھونکے کھڑکی کے ہلکے آسمانی رنگ کے ریشمی پردوں سے اٹکھیلیاں کرتے اندر آ رہے تھے۔

درد اور تھکن کا احساس خود بخود ختم ہو گیا۔ اس نے نرم اور گداز تکیے سے سر اٹھا کر دائیں جانب دیکھا۔

چمکیلی سطح والی میز پر گرم گرم چائے کی پیالی رکھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پیالی اٹھانا چاہی لیکن میز دور تھی۔ اس کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچ سکا۔

"ٹھہرو آصف" میں دیتی ہوں" اک نغماتی آواز گونجی۔

آصف نے تکیے پر سر رکھے رکھے آواز کی جانب توجہ دی اور پھر سر اٹھا کر

سرہانے کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا۔

وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

نرم نرم ریشمی گلابی لباس میں ریشم ہی کی طرح ملائم اور لوچدار جسم بجلیاں گراتی جمیل ایسی گہری اور سیاہ آنکھیں، پیازی پیازی گالوں سے پھوٹتا حیا کا نور ــــ یاقوتی ہونٹوں پر مچلتا تبسم ــــ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی حسین چوٹی ــــ نسوانی حسن و جمال کا ایسا پیکر آج تک اس کی نظروں سے نہیں گزرا تھا۔

بھیگا بھیگا قاتل حسن دیکھ کر آصف بے خود سا ہو گیا۔

وہ خراماں خراماں اس کی طرف بڑھی اور مسکراتے ہوئے بولی "کیا دیکھ رہے ہو"

"تم ــــ تم کون ہو ــــ؟" آصف نے حسن کا شعلہ اتنے قریب دیکھا تو رعبِ حسن سے زبان لڑکھڑا گئی۔

وہ بے تکلفی سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی ــــ اپنا سیمین بازو اس کی جانب بڑھایا اور پھر دوسرے ہاتھ کا سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔

آصف کسی بدمست شرابی کی طرح بہکنے لگا۔

"میرے ساتھ ٹیک لگا لو ــــ تھک جاؤ گے ــــ" اس نے اپنے نرم نرم ہاتھوں سے آصف کی پشت تھام کر اپنے سینے سے لگا لی۔

آصف مترنم آواز کے جادو ہی سے ہوش نہ کر پایا تھا۔ کہ نرم و گداز سینے کی تپش نے اس کے رگ و پے میں آگ دوڑا دی۔

"آصف!" اس نے بڑی بے تکلفی سے اپنی ٹھوڑی آصف کے شانے پر ٹکا کر اس کے سر سے لگا دیا۔

آصف نے مڑ کر اسے دیکھنا چاہا۔

"آصف ــــ میرے آصف ــــ" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے گرم

گرم گرم آنسو آصف کی قمیض بھگونے لگے۔

سکون و طمانیت کا گہرا احساس آصف کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اسے بازو سے پکڑا۔

اور

وہ

ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں آ گری۔

"رو کیوں رہی ہو؟" آصف نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"تمہارے زخم کب اچھے ہوں گے آصف ــــ کب اچھے ہوں گے؟" وہ اس کی چوڑی چھاتی سے لگی سسکیاں بھرتے کہہ رہی تھی۔

آصف نے جھک کر اس کی سیاہ زلفوں کو اپنے تشنہ لبوں سے چھو لیا ــــ وہ اس کی چھاتی میں اپنا وجود سمو دینے کو بے قرار نظر آنے لگی۔

"یہ زخم آنسوؤں سے نہیں تمہاری مسکراہٹوں سے مندمل ہوں گے مسکراؤ!"

آصف نے جھک کر اسے پھر پیار کر لیا۔

"مسکراؤ!" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

وہ مسکرا دی ــــ روتے روتے مسکرا دی۔

آصف کو یوں لگا۔ جیسے چاندنی کا نور بارش کے قطروں میں منعکس ہو رہا ہو۔ اس کا اندازِ سپردگی آصف کے جوان سینے میں ہلچل مچانے لگا۔

"آصف ــــ!"

"ہوں ــــ"

"تم کہاں تھے آصف ــــ تم نہیں جانتے میں نے کتنی مشکلوں سے تمہیں پایا ہے۔ کتنی ویران راتیں تمہاری یاد میں رو رو کر کاٹی ہیں۔ تمہارے یہ زخم دیکھ دیکھ کر میرے

دل میں زخم پڑ گئے ہیں۔"

"یہ زخم مندمل ہو گئے ـــــ تم جو آ گئیں۔"

"کیا واقعی؟"

"دیکھ لو۔"

اور آصف نے خود بھی دیکھا۔ اس کے بازوؤں پر کوئی پٹی نہ تھی۔ وہ اپنا ریشمی ہاتھ اس کے بازوؤں پر پھیرنے لگی۔

آصف کے حواس پرنشہ سا چھانے لگا۔

خود فراموشی کے عالم میں اس نے بھیگے بھیگے متبسم ہونٹوں کی ملائمت اور حلاوت اپنے ہونٹوں میں جذب کر لی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی

اس نے محسوس کیا۔ کہ اس کا حسین وجود پگھل رہا ہے۔

وہ چیخ اٹھا۔

اور

وہ

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

آصف دیوانہ وار اٹھا ـــ چیختے ہوئے باہر بھاگا۔

دُور

بہت دور

اونچے اونچے سیاہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر وہ اسے اک روشن نقطے کی طرح نظر آئی۔

"آ جاؤ ـــ!" اس نے گونج دار آواز میں آصف کو پکارا۔

آصف اس کی طرف لپکا۔

اک لمحے میں اس نے اسے جا لیا۔ بازوؤں میں سمیٹ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آصف نے اسے دیکھا۔

اس کی شکل بدل چکی تھی۔

لیکن حسن ہر رنگ میں حسین تھا۔

"تم میرا پیار ہو آصف ـــ میرا پیار ـــ" وہ بڑی اپنائیت سے اس کے گلے لگ گئی۔

"پھر تو نہ جاؤ گی؟" آصف اس حسین متاع کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"کبھی نہیں ـــ" وہ اس کے قوی بازوؤں پر جھول گئی۔

"آصف صاحب۔"

مردانہ آواز پر آصف نے پلٹ کر دیکھا۔

اک خوش پوش نوجوان اسے بلا رہا تھا۔ اس نوجوان کے ساتھ آٹھ دس آدمی اور بھی تھے۔ کچھ معمر کچھ جوان۔

آصف نے اپنے بازوؤں میں سمٹی ہوئی حسین جوانی کی طرف دیکھا وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس حسنِ مجسم کی جگہ اس کے بازوؤں میں ثوبیہ تھی۔ اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا تھا۔ کہ نوجوان نے اسے پھر پکارا۔

"آصف صاحب" نوجوان کے پکارنے پر وہ مڑا۔

"فرمائیے۔" وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔

"ہمارے سارے کام ادھورے پڑے ہیں صاحب۔" وہ نوجوان بڑے مہذب انداز میں گویا تھا۔

آصف کو اپنی اہمیت کا احساس ہُوا۔ تو اس نے سُرور سا محسوس کیا۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ عزت، احترام اور خلوص سے اس سے باتیں کرنے لگے۔

"ہم آصف کے سوا اس کام کے لیے کسی کو 'یو ۔۔۔ کے' نہیں بھیجنا چاہتے۔" کسی نے کہا۔

"کب جانا ہو گا؟"

"یہ تو آپ کی مرضی اور سہولت پر منحصر ہے۔"

"پھر بھی!"

"ہماری طرف سے آج ہی چلے جائیے۔"

"بہتر ——"

آصف بڑی شان اور خود اعتمادی سے انہیں رخصت کر کے پلٹا۔ وہاں اب حسن کا شعلہ لرزاں تھا نہ ثوبیہ۔

اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔

اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

دائیں ہاتھ اک انتہائی خوفناک اور مکروہ شے کھڑی تھی۔ جس کا چہرہ اس کے بدن سے خاصا بڑا تھا —— لمبے لمبے نوکیلے دانت —— لال لال چھوٹی چھوٹی آنکھیں، سارے چہرے پر گھنے بال ——

وہ بدہیبت شے اس کی طرف بڑھی۔

اسے اپنا دم گھٹتا ہُوا محسوس ہُوا۔

خوف زدہ ہو کر وہ اور پیچھے ہٹا۔

اس بدہیبت شے کا ہاتھ اس کی گردن پر پڑا۔ اس کا پاؤں عمودی چٹان سے پھسلا۔

اور

وہ

ایک خوفناک چیخ کے ساتھ کھٹ میں آ رہا۔

اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

گھبرا کر اس نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ بتی اب تک جل رہی تھی۔ اور بادلوں کی گرج چمک کے ساتھ بارش بھی برس رہی تھی۔

بستر پر وہ بے ترتیب سا پڑا تھا۔ رضائی گول ہو کر دائیں پہلو پڑی تھی۔ تکیہ آدھا زمین پر لٹک رہا تھا۔

اس نے کروٹ بدلنا چاہی۔ سارا جسم شل تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔

خواب کے حسن و قبح نے اس کے حواس پر خاصہ اثر کیا تھا اور اس کے خوش گوار اور ناخوش گوار اثرات سے اس کی ذہنی کیفیت بھی عجیب سی ہو رہی تھی۔

یہ خواب کوئی انوکھا نہ تھا۔ ایسے خواب وہ اکثر دیکھا کرتا تھا۔ لاشعور میں دبے ہوئے خوف اور مدفون خواہشات فرار کا یہی راستہ پاتی تھیں —— وہ خواب دیکھتا اور بھول جاتا ——

لیکن

آج کے خواب کی ہر چیز اس کے ذہن میں مچل رہی تھی۔

ثوبیہ

اس نے ثوبیہ کو بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔ لذت کا احساس اب تک باقی تھا۔ لیکن ثوبیہ سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس

نے

اس کے بارے میں کبھی ان خطوط پر سوچا بھی نہ تھا ــــ وہ تو گھر میں رہتے ہوئے بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ تو کیا ثوبیہ بھی اس کے لاشعور کی مدفون خواہش تھی؟ وہ سوچنے لگا۔

ثوبیہ!

ثوبیہ!

وہ

ثوبیہ کے بارے میں سوچتے سوچتے پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

ــــ ٭ ــــ

ثوبیہ صاحبہ ــــ کیا ارادے ہیں ــــ؟ آج بستر پر پڑے پڑے چھٹی گزار دو گی؟ بھرے بھرے جسم والی سانولی سی شکو، محترمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"اوہ شکو ــــ آؤ ــــ" ثوبیہ رضائی ہٹا کر اٹھتے ہوئے بولی ــــ آؤ۔ آؤ ــــ!"

"کب سے بیمار ہو ــــ" شکو بے تکلفی سے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اور ہنستے ہوئے ثوبیہ کو کندھوں سے پکڑ کر پھر سے پلنگ پر لٹا دیا۔

"بیمار کون؟"

"تم ــــ"

"میں بیمار کب ہوں ــــ؟"

"تو پھر گیارہ بجے تک یوں بستر میں سانس کھینچے پڑے رہنے کا مطلب؟"

"بس یونہی ــــ رات نیند نہیں آئی ــــ اس لیے ــــ"

"اوہو ــــ خیر سے راتوں کی نیندیں کب سے حرام ہونے لگیں؟"

"توبہ شکو ــــ تم سے خدا سمجھے ــــ" ثوبیہ کہنی کے بل اٹھتے ہوئے ہنسی۔ "تمہیں تو بات کا بتنگڑ بنانے کا مرض ہو گیا ہے۔ پہلے نیند نہ آنے کی وجہ تو پوچھ لیتیں ــــ"

"اچھا وجہ بیان کرو؟" شکو نے تن کر کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ۔ نوٹس لائی ہو؟" ثوبیہ نے اپنے تراشیدہ بالوں کو انگلیو سلجھاتے ہوئے کہا۔

"پہلے نیندیں حرام ہونے کا جھگڑا چکاؤ۔ پھر نوٹس کی بات ہوگی۔"

"کیا رعب ہے!"

"بالکل۔"

"بتانا کوئی ایسا ضروری تھوڑا ہی ہے — اپنی بات ہے تمہیں کیوں؟"

"نوٹس بھی ہمارے اپنے ہیں — تمہیں کیوں بتائیں — سنبھالو اپنے راز — ہم چلے —"

شکو روٹھنے کا مظاہرہ کر کے اٹھنے لگی۔ ثوبیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ثوبیہ نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا — "کیا مزاج پایا ہے۔ بیٹھو!" شک بیٹھ گئی۔

"ہاں تو نیند کیوں نہ آئی رات کو —؟" وہ مذاق کے موڈ میں تھی۔

"وہی پرانا قصہ" ثوبیہ کچھ سنجیدگی سے بولی۔

"آصف کا؟"

"ہاں"

"پھر کیا ہوا؟"

"رات تو اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔"

"کیوں؟"

"صاحب زادے رات دیر سے آنے لگے ہیں — اب تو بارہ ایک بجے سے پہلے لوٹتے ہی نہیں — ہفتہ بھر سے یہی وطیرہ ہے۔ روز منیرہ خالہ بیچا

دروازہ کھولنے کو جاگتی رہتی ہیں۔ رات شاید ان کی آنکھ لگ گئی۔ مجید چچا نے دروازہ کھولا — بس وہ طوفان ٹکرائے — میں تو ہڑبڑا کر اٹھی — گھنٹہ بھر دل کی دھک دھک کیے گیا — میں تو یہاں آ کر عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہوں شکو!"

"ہوں —"

"خیال تو کرو — آدھی رات کا وقت اور یہ ہنگامہ — مجید چچا تو یوں گرج رہے تھے۔ جیسے تکا بوٹی کر دیں گے اس کی — میں تو ڈر رہی تھی — کہیں وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے پہ اتر آیا تو کیا ہوگا — توبہ — اپنے ہاں کوئی اونچی آواز سے بات بھی نہیں کرتا۔ یہاں — آئے دن دھینگا مشتی۔ مجھے تو ہوسٹل میں جگہ ملے تو میں وہاں چلی جاؤں —"

"ہوسٹل میں جگہ کہاں؟"

"پھر تو سوچ رہی ہوں پڑھائی چھوڑ دوں —"

"پاگل —!"

"یہاں رہنا بھی تو اپنے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ عجیب سا ماحول ہے گھر کا — منیرہ خالہ ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرتی رہتی ہیں۔ یا آصف کو کوستی رہتی ہیں — مجید چچا کا موڈ بھی بگڑا ہی رہتا ہے۔ جب کبھی خوش ہوں تو آصف پر نہیں پاتا۔ جب تک ان کا موڈ بگاڑ نہ لے اسے چین نہیں آتا —"

"واقعی —؟"

"ہاں شکو — تین ماہ تو مجھے بھی یہاں آئے ہو چکے ہیں۔ میں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ جب بھی مجید چچا خوش ہوتے ہیں آصف کا موڈ بگڑ جاتا ہے۔ خاص کر عامر کا خط دیکھ کر تو اسے اپنے پر قابو ہی نہیں رہتا — تم جانو۔ عامر کا

خط مجید چچا کی خوشی کا باعث تو ہوتا ہی ہے۔ بس جس دن وہ نیلا لفافہ آیا۔ آصف کا پارہ چڑھ گیا۔ مزاج اتنا بگڑتا ہے کہ خدا کی پناہ — جناب کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرتے ہیں۔ جس سے مجید چچا غصے سے بھڑک اٹھیں۔ ان کا مزاج بگڑ جائے اور وہ تلملاتے رہیں —"

"اچھا خاصا نفسیاتی مسئلہ ہوا یہ تو —" شکو سنجیدگی سے سننے کے بعد بولی۔

"بالکل —" ثوبیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

یوں لگتا ہے گھر والوں کا سلوک آصف سے کچھ اچھا نہیں —"

"کچھ —! ثوبیہ جلدی سے بولی —" بالکل اچھا نہیں کہو — مجید چچا کو تو میں نے ان سے کبھی ہنس کر بات کرتے نہیں دیکھا — جن دنوں وہ ٹھیک ٹھاک بھی ہو، ان کے ماتھے کی تیوری چڑھی رہتی ہے۔ خالہ بھی جب بگڑیں۔ تو آگا پیچھا دیکھے بغیر وہ بے نقط سناتی ہیں۔ کہ توبہ —"

"تو مظلوم آصف ہے —" شکو مسکرائی۔

"مظلوم تو خیر نہیں — تنگ کرنے پہ آئے تو ایسی ذہنی اذیت دیتا ہے کہ بلبلا اٹھتے ہیں دونوں — خاص کر مجید چچا — وہ خود لطف لیتا ہے انہیں اذیت دے کر —"

"تم خالہ کو سمجھایا کرو —"

"تو یہ کرو انہیں کون سمجھا سکتا ہے — دو ایک بار میں نے دبی زبان سے کہا بھی — کہ ان سے ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کریں۔ جواب ملا۔ اب اسے گود میں اٹھائے پھروں، اچھا کھانے کو، اچھا پہننے کو دیتے ہیں۔ وہ ہے ہی کم بخت — جان جلا دیتا ہے — اس کی حرکتیں تم بھی دیکھ رہی ہو —

پیار کے قابل ہیں —؟"

"ہوں —"

"اب انہیں کون سمجھائے شکو کہ یہ حرکتیں اسی لیے پیار کے قابل نہیں کہ انہیں پیار نہیں ملتا۔"

"ہمارے ہاں اس نفسیاتی نکتے کو کون سمجھتا ہے ثوبیہ — آصف کے تو خیر حالات ہی ایسے ہیں۔ عام گھرانوں میں کیا ہوتا ہے؟"

"خالہ تو تقدیر کو کوس کر صبر کر لیتی ہیں —"

"تقدیر کا سہارا لے کر اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈال لیا جاتا ہے۔"

"واقعی —!"

دونوں سنجیدگی سے اس نفسیاتی مسئلے پر گفت گو کرنے لگیں۔

کچھ دیر مغز ماری کرنے کے بعد ثوبیہ اکتا کر بولی —" چھوڑو! اس بحث کو۔ ہمیں کیا — ہو سکتا ہے قصور آصف کا ہی ہو — ہم کہاں کے ماہر نفسیات آ گئے — نفسیات کی دو ایک کتابیں پڑھ کر ہم اس قابل تھوڑا ہی ہو گئے کہ عملی زندگی میں کتابی علم بگھارتی پھریں —"

"نفسیات پڑھنے نہ پڑھنے کا کیا سوال —" شکو اس معاملے میں دلچسپی لے رہی تھی — یہ تو عام اور سادہ سی بات ہے۔ صرف سمجھنے کے لیے بھی تھوڑی سی عقل چاہیئے —"

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو — تین مہینے مجھے بھی یہاں رہتے ہو گئے — یوں لگتا ہے جیسے آصف کی زندگی میں کوئی زبردست خلا ہے —"

"اس خلا کو تم پورا کر دو ثوبیہ بی —!" شکو نے اسے چھیڑا۔

مردہ کہیں کی" ثوبیہ نے اس کا ہاتھ مروڑا

"کیا ہرج ہے ـــ ثواب کا کام ہے ـــ" شکو اپنی پنسل لگی آنکھوں کو شوخی سے نچاتے ہوئے بولی ـــ "یہ خلا غالباً پیار سے محرومی کا ہے۔ تم دے دو ڈھیروں پیار ـــ"

"چپ بھی کرو گی اب ـــ!" شکو کے منہ پر ثوبیہ نے اپنے پالش شدہ ناخنوں والا ہاتھ رکھ دیا۔

پھر دونوں ہنسی مذاق کرنے لگیں۔

"ایسا شکیل سا آدمی ہے ـــ یہ بڑی بڑی گہری گہری آنکھیں ـــ یہ اتنا چوڑا سا سینہ ـــ یہ ایسا لانبا قد ـــ کیا خوب رُو جوان ہے ـــ" شکو ہاتھ اور آنکھیں گھما گھما کر اسے چھیڑنے لگی ـــ

ثوبیہ مخصوص ادا سے آنکھیں جھپکاتے، ہونٹ ٹیڑھے میڑھے کر کے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

"گبرو جوان ہے ـــ" کیا ہُوا جو ذرا سا وحشی ہے ـــ"

"ذرا سا ـــ؟" ثوبیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ـــ "اچھا خاصا وحشی ہے شکو!"

"گویا تمہیں تجربہ ہو چکا ہے؟"

"اچھا خاصہ ـــ"

"یہ بات ہے ـــ"

"ہاں ـــ" تراشیدہ بالوں کی لٹ کو کانوں کے گرد خم دیتے ہوئے ثوبیہ ہنس دی۔

"کیا تجربہ ہے اس کے وحشی پن کا ـــ؟" شکو دلچسپی سے بولی۔

"اجی! تین ماہ سے مابدولت یہاں رہ رہے ہیں ـــ کم بخت کو ہماری موجودگی کا احساس ہی نہیں ـــ کبھی جرأت کر کے بات کرو تو جواب اس طرح

دیتا ہے کہ پیار کی جگہ خوف آنے لگتا ہے ـــ"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اسی لیے تو ہوسٹل میں جانا چاہتی ہوں ـــ یہاں تو ـــ!" وہ ہنس دی۔

"دال گلتی نظر نہیں آتی ـــ؟" شکو نے لقمہ دیا۔

"نہیں شکو مذاق رہا ایک طرف ـــ میں یہاں سے فوراً چلی جانا چاہتی ہوں" ثوبیہ سنجیدہ ہو کر بولی ـــ "پڑھائی کے لیے یہاں آئی ہوں لیکن اطمینان اور یکسوئی سے پڑھنا نصیب ہی نہیں ہوتا ـــ میں تو اس وقت کو کوستی ہوں جب ہوم اکنامکس میں داخلہ لے لیا تھا ـــ ابّو کی تبدیلی ہو گئی اور مجھے یہاں قید ہونا پڑا۔"

"شکر کرو یہاں جگہ مل گئی ـــ دُور کے چچا ہی ـــ رہ تو سکیں یہاں ـــ ورنہ دو سال کی محنت ضائع ہو جاتی ـــ اب کم از کم ایف اے کا امتحان تو دے سکو گی نا ـــ؟"

"اسی لیے تو صبر شکر کر کے بیٹھی ہوں ـــ لیکن یہ ارادہ پکا ہے کہ اگر ابّو اپنی کوشش کے باوجود لاہور واپس نہ آ سکے تو میں بی اے میں آرٹس لے لوں گی۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے۔ تمہارے ابّو واپس آنے کی کوشش تو کر رہے ہیں۔ شاید لاہور تبدیل ہو کر آ ہی جائیں ـــ!"

"میں تو دن رات یہی دعائیں مانگتی ہوں ـــ"

کچھ دیر دونوں پھر سنجیدہ سے موضوع پر باتیں کرنے لگیں ـــ پھر پھر کر بات پھر آصف تک آ پہنچی۔

"میں نے کہا۔ موقعہ اچھا ہے جانے نہ دو ـــ" شرارت سے مسکراتے ہوئے شکو نے ثوبیہ کے کان میں کہا۔

"ہٹ کم بخت ـــ تو ہی دامن [illegible]

خفگی سے ڈانٹا ــــ

"میں یہاں دن رات رہتی تو اب تک اسے پالتو جانور کی طرح سدھا بھی لیا ہوتا ــــ"

"ماہر ہو نا ــــ"

"تمہاری طرح اناڑی بھی نہیں ــــ تین مہینے ہو گئے ــــ ابھی تک اسے راغب ہی نہ کر سکیں ــــ ارے بھئی! اسے رام کر لو ــــ کوئی تو نام لیوا ہو گا۔ ورنہ اپنی طرح بُرا حال ہو گا ــــ" شکو نے اتنے مضحکہ خیز انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ کہ ثوبیہ کو ہنسی آ گئی۔

"عشق لڑانے کی مشق آج ہی سے شروع کر دو ــــ کم بخت مستقبل کا کچھ تو آسرا بن جائے گا ــــ" شکو ہنسی ضبط کرتے ہوئے سنجیدہ بننے کی کوشش میں بولی۔

ثوبیہ نے ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے پھوٹنے والی ہنسی کو روکا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی ــــ "اب چپ بھی ہو گی یا نہیں ــــ!"

"چپ کرانے کا ایک ہی طریقہ ہے ــــ"

"کونسا ــــ؟"

"چائے پلاؤ ــــ" دھیان اور طرف لگے ــــ"

"اللہ ــــ" ثوبیہ پلنگ سے اترتے ہوئے بولی "باتوں میں اس طرح الجھایا کہ مجھے تمہارے راشن کا خیال ہی نہ رہا ــــ دو منٹ میں چائے لاتی ہوں ــــ تم یہ رسالہ دیکھو!"

میز سے رسالہ اٹھا کر اس نے شکو کی طرف بڑھایا ــــ اور چپل پہن کر چست قمیص کو کھینچ کر گھٹنوں کے برابر کیا ــــ سر جھٹک کر بالوں کو ٹھیک کیا۔ کرسی پہ سے دوپٹہ اٹھا کر کندھوں پر ڈالا۔

اور

"ابھی آئی" کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

ثوبیہ قبول صورت لڑکی تھی ــــ جسم کی حسین ساخت نے شکل و صورت کی کمی پوری کر دی ــــ یوں بھی جدید فیشن سے آگاہ تھی ــــ رکھ رکھاؤ بھی اچھا تھا۔ حسن کے زاویے اسے معلوم تھے ــــ وہ یہ جانتی تھی۔ کہ کس قسم کے پہرے پہ بالوں کا کونسا سٹائل اچھا لگتا ہے۔ جسم کی موزونیت کو ابھارنے کے لیے کس قسم کا لباس ہونا چاہیئے ــــ جاذب نظر بننے کے کیا گُر ہیں ــــ باتیں کرنے کا کونسا انداز دلکش و دلنشین ہے۔ حرکات کو اداؤں کے سانچے میں کب اور کیوں ڈھالنا چاہیئے ویسے بھی اس میں جنسی کشش کچھ زیادہ ہی تھی ــــ عورتوں سے زیادہ مرد اس سے مرعوب ہوتے تھے۔ معمولی شکل و صورت کے باوجود اس سے متاثر ہوتے تھے خاندان کے اکثر نوجوان لڑکے اسے پسند کرتے تھے۔

لیکن

ایک آصف تھا۔

جو تین ماہ کی یک جائی کے باوجود اس سے مرعوب نہ ہوا تھا ــــ وہ اکثر بیزار سا ہی نظر آتا ــــ روکھا پھیکا رویہ ــــ اس کی موجودگی سے غافل۔

لیکن اس کی رکھائی ــــ اس کا تغافل اور اکثر اوقات اس کا وحشیانہ پن ہی ثوبیہ کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ عشق و محبت تو خیر نہیں ــــ اسے آصف سے ہمدردی ضرور ہو گئی تھی ــــ شکو کے مذاق پر وہ اسے مصنوعی خفگی سے ڈانٹ تو رہی تھی لیکن دل میں کوئی چور گدگدی سی کیے جا رہا تھا۔

ــــ ❊ ــــ

خالہ جان! لائیے! میں ناشتہ بنا دوں؟"

"نہیں بیٹی — میں کر رہی ہوں کام — تم تیار ہو جاؤ کہیں کالج سے دیر نہ ہو جائے —"

"آج میرے دو پیریڈ خالی ہیں — دیر سے جاؤں گی —"

"اچھا —"

منیرہ بڑے سے باورچی خانے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے تیل کے چولھے کے سامنے بیٹھی انڈے پھینٹ رہی تھی۔

باورچی خانہ خاصا کشادہ تھا۔ کھڑکیوں پر جالیاں لگی تھیں — دیوار کے ساتھ سیمنٹ کے چبوترے بنے تھے۔ دائیں ہاتھ الماری تھی۔ چمکتے اور صاف ستھرے برتن — مرچ مصالحوں کے پلاسٹک کے خوبصورت ڈبے اور باورچی خانے کی ضرورت کی اور چیزیں سب قرینے سے رکھی تھیں۔ دو تین رنگین سیڑھیاں فرش پر پڑی تھیں۔ کھانا پکانے کا کام چونکہ منیرہ خود ہی انجام دیتی تھی۔ اس لیے پیڑھی استعمال کرتی تھی۔ کھڑے ہو کر پکانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ چبوترہ برتن رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جس پر چولھا رکھنے کی گنجائش تھی۔

"رکھو آج بھی نہیں آئی —" ثوبیہ رنگین پیڑھی کو پیر سے کھسکا کر منیرہ کے قریب لے آئی۔

"کم بخت دو دن کی چھٹی لے کر گئی تھی — آج پانچواں دن ہے — ان لوگوں

کے یہی تو نخرے ہیں —"

ثوبیہ نے پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے برتن منیرہ کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور انڈے پھینٹنے لگی۔

منیرہ نوکروں کے یوں سر چڑھ جانے اور مزاج اونچے ہونے کا گلہ کرنے لگی۔

ثوبیہ نے بڑے سلیقے سے آملیٹ بنایا — منیرہ نے گھی میں تر پراٹھے پکائے — چائے دم کی — چھوٹے ملازم فیضی نے برتن ٹرے میں لگا دیئے۔

"چچا جان — اکمرے میں ناشتہ کریں گے یا یہیں آئیں گے؟" ثوبیہ نے نل کے نیچے ہاتھ دھوتے پوچھا۔

"ناشتہ کمرے ہی میں منگوایا ہے —" منیرہ ٹرے میں چیزیں رکھتے ہوئے بولی۔

"میں دے آؤں —؟"

"فیضی لے جائے گا — تم خود ناشتہ کر لو۔"

"نہیں میں خود دے کر آتی ہوں — فیضی ٹرے گرا دے —" اس نے بڑی سرعت سے ناشتے کی ٹرے سجائی — اور مجید کے کمرے کی طرف لے کر چل دی۔

"ماشاء اللہ! کتنی ہونہار بچی ہے — کتنی سعادت مند — خوش بخت ہیں والدین جن کی اولاد ایسی ہو — ایک ہمارے نصیب — کڑیل جوان بیٹا جان کا روگ بنا ہوا ہے — قسمت —!"

ماتھے پر ہاتھ رکھ کر وہ خود ہی بڑبڑاتی رہی — آصف ابھی تک بگڑا ہوا تھا اس دن مجید سے تصادم کے بعد اس کو ذہنی تسکین تو ہو گئی تھی لیکن مجید کا موڈ بدستور خراب رہا تھا — دوسرے دن آصف کی معمولی سی بات پر اس نے اسے بے طرح سنا ڈالی تھی — بار بار وحشی نے کہا تھا — ثوبیہ کے سامنے اپنی بیٹی آئینہ کے روبرو — آصف جھکنے کی بجائے اور تن گیا تھا — اذیت کا وہ

راستہ جو اس نے اختیار کیا تھا۔ اب تک نہ چھوڑا تھا۔ رات بارہ ایک بجے سے پہلے گھر نہ آتا۔ گھنٹی اسی طرح مسلسل بجائے جاتا — اس کھیل سے اس کی روح تک محظوظ ہوتی — کیوں کہ اس سے مجید لاڈلے کی طرح کھیلتا رہتا۔

منیرہ سوائے آصف کو سرزنش کرنے کے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ مجید کو کچھ کہنے یا سمجھانے کی اس میں جرأت و ہمت ہی کہاں تھی۔

ثوبیہ واپس آئی۔ منیرہ نے چوبی چوکی اپنے سامنے رکھ کر اس پر اپنا اور ثوبیہ کا ناشتہ چن دیا۔

اس خوبصورت بنگلے میں آئے انہیں دوسرا سال تھا — کھانے کا کمرہ کافی کشادہ اور خوبصورت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ لیکن وہاں کھانا بہت کم کھانے کا موقع ملتا۔ اکثر مہمانوں کی آمد پر ہی یہ کمرہ کھلتا — عام طور پر کھانا باورچی خانے ہی میں کھا لیا جاتا تھا۔ جب جس وقت بھوک لگتی۔ آ کر کھا لیتا۔

ثوبیہ پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

منیرہ نے آملیٹ کی بھری پلیٹ اس کے سامنے کر دی۔

آصف بھائی نے ناشتہ کر لیا — ثوبیہ چائے کی پیالی سیدھی کرتے ہوئے بولی۔

"نہیں —"

"انہیں بلا لیں!"

"وہ کب کرتا ہے ناشتہ —"

"کیوں؟ —"

"بس اس دن سے بگڑا ہوا ہے —"

"کس دن سے؟"

"جب باپ سے لتاڑ پڑی —"

"قصور تو اس دن آصف بھائی کا کچھ ایسا نہ تھا — جانے مجید کو کیا ہو گیا تھا؟"

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹی — تم ہی بتاؤ میں کیا کروں — میں تو چکی کے پاٹوں میں پس رہی ہوں —"

"اس دن امینہ آپا بھی تھیں — ان کے بچے بھی — سب کے سامنے مجید چچا نے انہیں اس طرح جھڑکا — وحشی کے بغیر تو اسے مخاطب ہی نہیں کیا۔"

"ہے بھی تو وحشی —" منیرہ نے دکھے دل سے کہا — "کیا کروں اسے کیسے سمجھاؤں میں تو عاجز آ چکی ہوں۔ اب جوان ہے۔ اسے اپنے حالات کو سمجھنا چاہیئے —"

"شروع ہی سے ایسے کرتے ہیں —؟"

"کیا بتاؤں بیٹی — اکھڑ اور ضدی تو شروع ہی سے تھا — عامر کے ولایت جانے کے بعد تو بات تک ہی ہاتھ سے نکل گیا ہے — ہٹ دھرمی، گستاخی اور بدتمیزی تو اب شیوہ ہی بنا لیا ہے۔"

"انہیں عامر سے ضد ہو گئی ہے خالہ جان — دیکھیں نا جب بھی ان کا خط آتا ہے یہ بگڑ جاتے ہیں —"

"ضد کوئی آج ہوئی — شروع ہی سے ہے — اپنا اپنا مزاج ہی ہے نا — وہ بھی اسی گھر میں پل بڑھ کر جوان ہوا — دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے — وہ جتنا منکسر المزاج ہے یہ اتنا ہی نٹ کھٹ۔"

"غالباً ان کی بھی خواہش ولایت جانے کی ہو گی؟"

"خواہش تو تھی لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کرتی؟"

"سنا ہے ان کے نمبر بھی عامر بھائی سے زیادہ تھے ——"

"ہاں ——"

"پھر تو ان کا غصہ اور ضد حق پر ہے۔"

"حق پر کیسے بیٹی! میں تو کہتی ہوں —— اسے اب اپنے حالات کو سمجھنا"

دونوں چائے پیتے ہوئے آصف کی باتیں کرتی رہیں۔

"آصف بھائی کا ناشتہ اوپر بھجوا دیں؟ ثوبیہ نے برتن سمیٹتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"دو دن بھجواتی رہی ہوں۔"

"پھر؟"

"جوں کا توں واپس کر دیتا ہے۔"

"آپ نے ان سے پوچھا نہیں؟"

"کیا؟"

"ناشتہ کہاں کرتے ہیں؟"

"جہاں کھانا کھاتا ہے وہیں ناشتہ بھی کر لیتا ہوگا۔"

منیرہ کے سپاٹ لہجے اور کھردرے جواب سے ثوبیہ کو ذہنی کوفت ہوئی۔

اسے اپنے امی یاد آ گئیں جو کسی بھی بچے کے روٹھ جانے پر ناشتہ پیچھے پیچھے لیے پھرا کرتی تھیں اور اس وقت تک ناشتہ خود نہ کرتیں۔ جب تک بچہ نہ کرلے

لیکن

ثوبیہ کی امی

اور

منیرہ

کے حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا ——

"خالہ جان!"

"ہوں"

"آپ آصف بھائی کے لیے خود ناشتہ لے جائیں نا —— آپ کا کہا تو نہیں موڑیں گے۔ اس طرح تو وہ گھر بار اور آپ سب سے بالکل بیگانہ ہو جائیں گے۔"

"آگے کون سا نہیں بیگانہ۔"

ثوبیہ مصر رہی —— کہ منیرہ خود آصف کو ناشتہ کرانے کے لیے جائے اس نے جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا۔ ٹرے میں چیزیں رکھیں۔

منیرہ جانتی تھی۔ کہ آصف اپنی ہٹ دھرمی پہ آیا ہوا ہے۔ وہ کبھی ناشتہ نہیں کرے گا۔ ثوبیہ کے کہنے سے رضامند ہو گئی تھی۔

لیکن

عین اسی وقت مجید نے اسے بلا بھیجا —— گھر پہ رکھے ہوئے روپے پیسے کے حساب کتاب کے لیے ثوبیہ کی سکیم ادھوری رہ گئی۔

"فیضی کے ہاتھ بھجوا دو ٹرے ——" وہ چابیوں کا گچھا سنبھالتے ہوئے پیڑھی سے اٹھیں —— "اتنے تردد سے تیار کیا ہے تو بھجوا ہی دیکھو کرے گا تو کبھی نہیں —— یہ میں جانتی ہوں ——"

وہ بڑبڑاتی باورچی خانے سے نکل گئیں۔

ثوبیہ چند ثانیے ٹرے رکھے بیٹھی رہی —— کچھ سوچ رہی تھی وہ۔ پھر وہ اٹھی —— شش و پنج کے عالم میں چند ثانیے کھڑی رہی۔

ذہن میں کوئی خیال ہلچل مچا رہا تھا —— شاید وہ اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

چند ثانیوں کی کش مکش کے بعد اس نے کچھ فیصلہ کیا۔ دوپٹہ ٹھیک سے کندھے ڈالا — قمیص پر ہاتھ پھیر کر سلوٹیں دور کیں۔
کچھ سوچ کر مسکرائی۔
کچھ سمجھ کر سنجیدہ ہو گئی۔
پھر — جھکی — اور لڑکے اٹھائی۔
لڑکے ہاتھوں میں لیے وہ پچھلے زینے سے اوپر چل دی۔

مجید کا یہ بنگلہ لاہور کی اس بستی میں تھا جو چند ہی سالوں میں چٹیل میدان میں آ گئی تھی — خوبصورت بنگلے — پکے مکان، حسین کوٹھیاں، چند سالوں میں گئی تھیں — بلیک مارکٹنگ — سمگلنگ اور ہیرا پھیری نے مکانوں کی کر جنم دیا تھا — مجید کے بنگلے کے عین سامنے اس اوورسیر کی دو منزلہ کوٹھی جس کی تنخواہ صرف اڑھائی سو روپے تھی۔ دائیں طرف کپڑے والوں کا بنگلہ تھا۔ چند سال پہلے کپڑے کی معمولی سی دکان کرتے تھے۔ لیکن اب کارخانے کے مالک تھے۔ پچھلی طرف وسیع و عریض کوٹھی ان دو بھائیوں کی تھی۔ جن کا بظاہر کوئی کام سننے میں آیا تھا۔ کہ ان کے کوئی قریبی عزیز کسی نہایت اہم اور کلیدی عہدے فائز ہیں۔ انہی سے پرمٹ حاصل کر کے یہ فیض حاصل کرتے ہیں۔ اس رشتہ دار کو ان کے محنتانے کا پورا معاوضہ دینے کے بعد لاکھوں کی ریل پیل تھی — کچھ مکا اور بنگلے ان لوگوں کے بھی تھے۔ جنہوں نے بمشکل روپیہ جمع کر کے زمینیں خریدی تھ اور پھر ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے توسط سے مکان اور بنگلے کھڑے لیے تھے۔ کرائے پر اٹھے ہوئے یہ بنگلے کارپوریشن کے قرضے کی اقساط بے با کر رہے تھے۔ لیکن یہ مکان اور بنگلے آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ اکثریت ہیرا سے بنے ہوئے مکانات کی تھی۔

مجید بھی ایسے ہی نگینوں میں سے تھا۔ دوائیوں کی دکان تو اس نے نام ہی جیب سے سپرٹ بنانے کا پرمٹ حاصل کیا تھا۔ پیسہ ہی پیسہ ہو گیا تھا۔ ایکسائز انسپکٹر سے دوستی تھی۔ کھانے پلانے کے علاوہ "خدمت" بھی کر دیتا تھا۔ اس کے بدلے بندوں تھوڑے سے پرمٹ پر مزا روں کا فائدہ کما رہا تھا۔

دو سال ہوئے اس نے یہ بنگلہ تعمیر کرایا تھا۔ چیف والے خوبصورت بر آمدے دو کمرے وسیع و عریض کمرے — ٹائیلوں والے غسلخانے، غرضیکہ اپنی خواہش کی تکمیل بڑے ذوق و شوق سے کی تھی۔ بنگلے کو آراستہ بھی خوب کیا تھا۔

دو منزلہ بنگلہ — نیچے ان کی اپنی رہائش تھی۔ اوپر تین کمرے تھے۔ ایک آصف کا۔ دوسرا عمر کا۔ جو اس کے ولایت جانے کے بعد یہیں رہتا تھا۔

اور تیسرے میں گھر کا فالتو سامان بند پڑا رہتا تھا۔

ثریہ محتاط قدم، لمحتی چائے کی ٹرے لیے زینہ طے کرنے لگی۔ لکڑی کے جنگلے اور گولائیوں والا زینہ طے کر کے وہ اوپر آ گئی۔

آصف سامنے ہی دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے سفید قمیض اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں سلیپر تھے۔ کندھے پر تولیہ۔ ہاتھ میں گول آئینہ اور چھوٹی سی قینچی لیے — شیو کے بعد اپنی مونچھوں کی تراش درست کر رہا تھا۔

ذرا سا آئینہ نیچا کر کے اس نے سیڑھیوں سے ابھرتے ثریہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے لاپروائی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ثریہ کا دل ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود دھڑک اٹھا۔ چہرے پر اک آوارہ مسکراہٹ لیے وہ اس کی طرف بڑھی۔

"آپ ناشتہ کے لیے نیچے نہیں آئے!" — وہ ذرا بچ کر سمٹ کر اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

"آپ سے کس نے کہا ناشتہ لانے کو ۔۔۔؟" وہ انتہائی کھردرے لہجے میں بولا۔

"میں ۔۔۔ میں ۔۔۔!" وہ اس درشت لہجے سے گھبرا گئی۔

"لے جایئے ۔ مجھے ان چونچلوں کی ضرورت ہے نہ عادت ۔۔۔" وہ تلخی سے بولا۔

ثوبیہ سی کھڑی دوپٹے کے کونے کو مسلتی رہی۔

"لے جایئے!" وہ دروازے سے ہٹتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔

ثوبیہ ندامت کے بھرپور احساس سے مٹی کا بت بن گئی۔

آصف نے بڑھ کر کرسی کی پشت سے اپنی پتلون اٹھائی۔ اٹیچی کیس سے سفید قمیض نکالی اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

ثوبیہ کچھ سنبھلی۔ آصف کے رویے سے اسے دکھ پہنچا۔ اس کے ساتھ تو آصف کو اس قسم کا سلوک نہ کرنا چاہیئے تھا ۔۔۔ متنفر وہ گھر والوں سے تھا۔ شاکی وہ والدین سے تھا۔ اس کا کیا قصور!"

اس کا جی چاہا۔ ٹرے زمین پر الٹ کر سارا ناشتہ پاؤں تلے مسل دے۔ اپنی سبکی کے احساس سے وہ لچلی گئی تھی۔ لیکن ۔۔۔

اس نے تو بہت کچھ سوچ کر قدم اٹھایا تھا۔ آصف کو راہِ راست پر لانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ پہلے ہی قدم پر حوصلہ ہار دینا مناسب نہ تھا۔ اس نے اپنی ڈھارس خود ہی بندھائی۔ سبکی کے جان لیوا احساس کو ذہن سے جھٹکا اور ٹرے سے چیزیں نکال کر میز پر سجانے لگی۔

حالات و حوادث نے آصف کو پتھر کی وہ سل بنا دیا تھا جس پر کائی جم چکی تھی۔ ثوبیہ نے اس کائی کو کھرچنے کا تہیہ کر لیا۔

بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ وہ آصف کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

آصف غسل خانے سے نکلا ۔۔۔ ثوبیہ اسے دیکھ کر دانستہ مسکرا دی۔ آصف کے لہجے کو ہراساں سا ہو گیا۔

پھر پلنگ کے تکیے پر پڑی ٹائی اٹھا کر اس کی جانب کمر کر کے کھڑکی میں رکھے آئینے میں ٹائی کی گرہ لگانے لگا۔

"ثوبیہ صاحبہ! میں کہہ چکا نا۔ میں ان چونچلوں کا عادی ہوں۔ نہ ان کی ضرورت سمجھتا ہوں۔" وہ پشت کیے بولا۔

اس کے لہجے میں کچھ نرمی پا کر ثوبیہ کی ہمت بندھی۔

"عادی ہو سکتے ہیں نہ ہوں لیکن ضرورت سے تو انکار نہیں کر سکتے۔" ثوبیہ نے فی الفور جواب دیا۔

اس نے جیسے کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ بے چین ہو کر وہ پلٹا۔ اس کے ہاتھ ٹائی کی گرہ پر تھے۔ اور وہ پوری آنکھیں کھولے ثوبیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہنی اضطراب ہاتھوں کی خفیف لرزش سے عیاں تھا۔

ثوبیہ کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے دیپ جھلملا گئے۔ بھنوؤں کی دائیں کمان کھینچ کر آصف ثوبیہ کو دیکھتا رہا ۔۔۔ دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں اس رات کا دیکھا اسپتا قوس و قزح کے حسین رنگوں کی طرح بکھر گیا۔

ثوبیہ کا تبسم اور واضح ہو گیا۔ جیسے آنکھوں کی زد میں جلنے والے چراغ تند و تیز جھونکے گزر جانے کے بعد سنبھل کر جگمگا اٹھتے ہیں۔

آصف نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اس تبسم سے حظ اٹھانے کی بجائے وہ کچھ ت زدہ سا ہو گیا تھا۔

اس نے جلدی سے ٹائی باندھی۔ کھونٹی سے کوٹ اتارا۔ بوٹ پہنے۔ اور جانے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

"ناشتہ نہیں کریں گے ——؟" توبیہ شکست خوردہ آواز میں بولی۔
اس نے جواب دینے کی بجائے سر گھما کر اسے اک بار پھر غور سے دیکھا۔
"میں آپ کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔ سب کچھ ٹھنڈا ہو جائیگا۔" وہ بڑے انداز میں بولی۔
وہ اسے اسی انداز میں گھورتا رہا۔
وہ اک ادائے دلربا سے مسکرائی۔ اور پھر لجا کر سر جھکاتے ہوئے بولی۔
"کھنا آپ چچا جان سے اور نصہ ناشتے پر۔"
"توبیہ! وہ ایک دم برس پڑا۔ "اپنے معاملات میں آپ کی دخل اندازی میں نہیں کروں گا ——"
وہ غصے سے پیر پٹختا باہر چلا گیا۔
توبیہ ندامت اور کھسیانے پن سے مٹی ہو کر رہ گئی۔ ناشتہ اس کا منہ چڑانے لگا۔
"وحشی کہیں کا ——" اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا —— اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوسرے لمحے وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے کی طرف بھاگ رہی تھی۔
کتنی نادم —— کتنی خفیف اور کتنی سبک ہو رہی تھی وہ۔

——

ندامت جھنجھلاہٹ بن کر توبیہ کے اعصاب پر سوار تھی۔ سارا دن بدمزگی سے گزرا۔ کالج میں بھی موڈ بگڑا ہی رہا۔ شکو نے مذاق سے اسے بہلانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن وہ اس کے مذاق سے چڑ گئی۔
"جہنم میں جائے میری بلا سے ——" جس وقت بھی آصف کا خیال آیا۔ اس کے دل سے یہ بے آواز جملہ پھسل پڑا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ جو بڑی ہمدردی سے اس کو ناشتہ کرانے گئی تھی۔ دن میں کئی بار اسے وحشی کہہ کر دل کا غبار نکالا۔
اس نے آصف سے اپنی ساری ہمدردیاں سمیٹ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اسے دل ہی دل میں کوسا۔ اسے قصوروار ٹھہرایا۔ مجید چچا کو سچا گردانا۔ ہر طرح سے اپنے دل کے احساس کو تسکین دینے کی اس نے کوشش کی۔
لیکن —— جتنی اس نے کوشش کی۔
اتنا ہی اسے اپنے ذہن پر مسلط پایا۔
وہ روہانسی ہو جاتی —— مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ پڑھائی میں قطعاً دل نہ لگتا۔ کالج سے بے دلی سے جاتی —— آصف سے اول تو کبھی سامنا ہو ہی نہیں پایا تھا۔ اگر وہ دن کے وقت گھر پر ہوتا۔ اور اس سے اس کا سامنا ہو بھی جاتا تو توبیہ ماتھے پر شکنیں ڈال لیتی۔ منہ بسور کر قریب سے گزر جاتی۔
لیکن —— ان باتوں کا آصف پر اثر ہی کہاں تھا بظاہر تو وہ پتھر کی ایسی سل تھا جس تک منجمد ہو چکی تھی۔

آصف کا ڈیرہ وہی تھا۔ رات بارہ ایک بجے واپس آتا۔ مسلسل گھنٹی بجانا اور پھر دھپ دھپ کر کے گوالئیوں والے زینے پر چڑھ کر اوپر چلے جانا۔

لیکن اس کے باوجود اتنے دنوں سے کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ منیرہ اس کے آنے تک جاگتی رہتی — اور جونہی وہ گھنٹی پر ہاتھ رکھتا دروازہ کھول دیتی — بیدی کے اٹھنے اور دروازہ کھولنے کا موقع ہی پیدا نہ ہوتا۔

دن گزرتے گئے لیکن ثوبیہ کو ذہنی کشمکش سے نجات نہ ملی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آصف کی آمد کا لاشعوری طور پر انتظار کرتی رہتی ہے۔ ورنہ کیا وجہ کہ اس کے آنے تک اسے نیند ہی نہیں آتی اور اگر آ بھی جاتی ہے تو عین وقت پر آنکھ کھل جاتی ہے۔

کسی ایسی ہی رات تقریباً بارہ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی آصف آ چکا تھا یا نہیں۔ اس کا اسے علم نہ ہو سکا۔ وہ کافی دیر بستر میں پڑی جاگتی رہی پھر — اٹھی — چادر شانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر کوریڈور میں نکل گئی۔ کوریڈور کی بتی جلا کر وہ کئی ثانیے بلا مقصد کھڑی رہی۔ مجید اور منیرہ کے کمرے کی بتیاں بند تھیں اور دونوں کے خراٹے فضا کے سکوت کو درہم برہم کر رہے تھے۔

منیرہ بھی سو چکی تھی۔ ثوبیہ نے سمجھا آصف آ چکا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑی۔

عین — اسی وقت گھنٹی کی ٹررن ٹرن نے فضا کو مرتعش کر دیا۔

غیر ارادی طور پر وہ لپک کر ڈرائنگ روم میں گئی۔ بتی جلائی۔ اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

آصف اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔

پھر غور سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جانی پہچانی

سپنوں کی حسین کیفیت لہرائی۔

پھر — دفعتہً کچھ خوف کی پرچھائیوں نے اس چمک کو دھندلا دیا۔

ثوبیہ اس کے انہماک سے لجا گئی — اور اک غیر محسوس لیکن فاتحانہ سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے سبک اور نازک سی لہر کی طرح بل کھا کر دروازہ بند کر کے پلٹی۔

آصف کمرے سے جا چکا تھا۔

ثوبیہ کو اس رات کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ تصور کے دریچوں میں وہ اس عکس کو بار بار دیکھتی رہی۔ جو خاموشی سے ذہن پر دلفریب رنگ بکھیرتا چلا گیا تھا۔ اس نے کتنی شدت سے خواہش کی۔ کاش اس کو صرف دیکھنے کی بجائے آصف کوئی بات بھی کرتا۔ اس کی محویت کا انداز کتنا دلفریب تھا۔ سیاہ گہری گہری آنکھوں میں محویت کی گھلی گھلی کیفیت۔

اس رات سوتے جاگتے میں اس نے کئی بار ان آنکھوں کو — ان آنکھوں میں گھلی گھلی محویت کی کیفیت کو دیکھا۔

اور — اسی کیفیت سے شہ پا کر دوسری رات وہ دانستہ جاگتی رہی۔

گھنٹی کی آواز پر وہ ایک دم بستر سے نکلی — نرم نرم ہاتھوں سے بالوں کے خم اور گہرے کئے۔ چادر شانوں پر ڈالی۔

اور — کوریڈور میں آ گئی۔

منیرہ اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ زکام کی شدت سے اس کا برا حال تھا۔

"میں کھولتی ہوں خالہ جان —! اس نے جلدی سے کہا۔" آپ کی طبیعت خراب ہے۔ کہیں ہوا نہ لگ جائے —"

منیرہ اسے دعائیں دیتی کمرے میں چلی گئی۔

ثوبیہ نے دروازہ کھولا۔

آصف نے آج پھر اسے دیکھا۔

ثوبیہ کے لبوں پر گہرا تبسم لہرا گیا۔ آنکھیں اک ادائے مستانہ سے جھپکا کر وہ دروازہ بند کرنے کو مڑی۔

آصف آج بھی خاموشی سے کمرے سے چلا گیا۔ ثوبیہ کوریڈور میں کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

تیسرے دن پھر ثوبیہ نے دروازہ کھولا۔ منیرہ سے اس نے کہہ دیا۔ کہ وہ ٹسٹ کے لیے رات گئے تک پڑھائی میں مشغول رہتی ہے اس لیے آصف کو دروازہ کھول دیا کرے گی۔ منیرہ طبیعت کی خرابی سے مجبور تھی۔ اس کا کتنا بوجھ ثوبیہ نے بانٹ لیا تھا۔ ثوبیہ کے لیے اس کے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلتی تھیں۔

آصف کے رویے میں فرق آیا۔ نہ آنے کے وقت میں تبدیلی۔

ثوبیہ بھی اس کے آنے تک جاگتی رہی۔ اگر کبھی آنکھ لگ بھی جاتی تو طاقت اتھائی اسے وقتِ مقررہ پر بیدار کر دیتی۔

تیسرے — اور — پھر چوتھے روز ثوبیہ نے دروازہ کھولا۔ آصف کے رویے میں اس نے بڑا تغیر محسوس کیا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے کی بجائے اس پر کڑی سی نظر ڈالتا — بھنویں اکثر تن جاتیں چہرے سے غصے کے واضح آثار مترشح ہوتے۔

اس دن بھی ثوبیہ نے دروازہ کھولا۔

"آصف!" اس نے جانے کیوں اسے پکارا۔

آصف نے گھور کر اسے دیکھا — کیوں —؟

استفسار اتنا کھردرا اور تلخ تھا۔ کہ وہ کوئی بات ہی نہ کہہ سکی۔

"آپ دروازہ کیوں کھولتی ہیں؟" وہ ترش لہجے میں بولا۔

"خالہ جان کی طبیعت اچھی نہیں۔ اور چچا جان کو آدھی رات تک جاگنے کی ضرورت

نہیں۔" اس نے بھی اکتا کر تلخ لہجہ اختیار کیا۔

لیکن وہ تو شاید اس کی پوری بات سنے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ آج اس جھنجھلائے ہوئے شکاری کی طرح نظر آرہا تھا۔ جسے بڑی تگ و دو کے بعد بھی شکار نہ ملا ہو۔

ثوبیہ کے صبر و قرار نے ایک بار پھر ہمت ہار دی۔ اس نے آصف سے قطع تعلق اور لاپروائی کا عزم کر لیا۔

لیکن دل — اس دل کا کیا کرتی جو اس اکھڑ اور وحشی انسان کا دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

اگلی رات وہ حسبِ معمول آصف کے انتظار میں جاگتی رہی لیکن اس کی مجروح انا اسے دروازہ کھولنے کے ارادے سے باز رکھ رہی تھی۔ اس نے جاگتے رہنے کے باوجود فیصلہ کر لیا۔ کہ آج وہ آصف کے لیے دروازہ نہیں کھولے گی۔

بارہ بجے — اور پھر — ساڑھے بارہ — پونے ایک بجے اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے مندنے لگیں۔ شاید اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔

ڈز — ڈز — ڈز — کسی نے مجید کے کمرے کی بیرونی کھڑکی پیٹ ڈالی۔ اور ادھ کچی نیند میں ڈوبی ثوبیہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

ڈز — ڈز — ڈز — کوئی برابر کھڑکی پیٹے جا رہا تھا۔

ثوبیہ ادھوری نیند سے بوجھل آنکھیں ملتی کچھ خوف اور کچھ پریشانی کے عالم میں پلنگ سے کودی اور کوریڈور میں پہنچ گئی۔

مجید اور منیرہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔

کوئی کھڑکی برابر پیٹے جا رہا تھا۔

"کون ہے۔" مجید نے بتی جلاتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

جواب میں کھڑکی پہلے سے بھی زیادہ زور سے پیٹی گئی۔

منیرہ کا دل بھی بے طرح دھڑک رہا تھا — آنکھیں ملتے وہ اپنے بستر پر ہراساں بیٹھی تھی۔

ثوبیہ گھبرا کر اندر آ گئی۔

"کون ہے؟" — اس نے سہم کر پوچھا۔

"کون ہے؟" مجید پھر گرجا۔ شاید وہ جان گیا تھا۔ کہ کھڑکی پیٹنے والا کون ہو سکتا

"بولتے کیوں نہیں — کون ہو — !" غصے سے پیچ و تاب کھا کر وہ چیخا۔

"دروازہ کھولو — !" اطمینان سے جواب دیا گیا۔

آواز پہچاننے میں کسی کو دشواری نہ ہوئی۔

وہ آصف تھا۔

"دروازے کا بچہ — !" مجید غصے سے بے قابو ہو گیا۔ منیرہ بھی سہم کر پاہوئی — ثوبیہ حیران سی کھڑی رہی۔

منیرہ اٹھ کر دروازہ کھولنے کو جانے لگی۔

لیکن ثوبیہ نے جلدی سے کہا۔ "آپ بستر سے نہ نکلیں میں کھول دیتی ہوں۔"

مجید غصے میں بڑبڑاتے ہوئے آصف کو بے نقط سنانے لگا۔

ثوبیہ نے دروازہ کھولا۔ آصف پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دیئے اپنے مخصوص انداز میں چلا آ رہا تھا۔

آج اس کے لبوں پر گہرا تبسم تھا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

مجید کے کوسنے دینے کی آوازیں ڈرائنگ روم میں صاف طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ منیرہ دہرا رہی تھی۔ "اس کو سمجھا لو۔ ناک میں دم کر دیا ہے کم بخت نے۔ کے لئے کھانا نہیں تو آنے ہی نہیں دیتا۔ پھر تم مجھے کہتی ہو۔ کہ میں رویہ تبدیل نہیں کرتا۔

اس کی حرکتیں انسانوں کی سی ہیں — ؟ وہ تو میرے سینے پر ناسور بن کر رہ گیا ہے ہر حرکت اذیت دینے کو ہی کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے۔ اس نے یہی وطیرہ رکھا تو میں اسے اس گھر میں قدم رکھنے نہیں دوں گا۔ بہت دیکھ لیا — مجھ سے اب یہ عذاب برداشت نہیں ہوتا —"

ثوبیہ دروازہ بند کر کے مڑی تو آصف کو کمرے کے وسط میں کھڑے پایا۔ وہ بڑے غور سے مجید کی آواز سن رہا تھا۔

ثوبیہ ڈر گئی کہیں آج پھر کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے۔

لیکن وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

آصف مسکرا رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

وہ اس سائنس دان کی طرح مسرور اور شادماں نظر آ رہا تھا جس کا کوئی انتہائی مشکل اور لاینحل مسئلہ کامیابی سے ہمکنار ہو گیا ہو۔

ثوبیہ نے اس کی جانب دیکھا۔

خلاف توقع اور خلاف معمول وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے آواز سی ہنسی ہنس دیا۔

وہ گھبرا سی گئی۔

"ثوبیہ — !" اس نے آہستگی سے پکارا۔ اس کے کان ابھی تک مجید کی بک بک پر لگے ہوئے تھے۔

"جی —" وہ سٹپٹا سی گئی۔ آج اس کے التفات کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

"آپ دروازہ کھولنے کے لیے جاگتی رہتی ہیں — ؟" وہ بھنوؤں کی دائیں کمان قدرے اوپر اٹھا کر مسکرایا۔

"جی ـــ میں" وہ ہکلا گئی۔ پلکیں بار بار جھپکا کر اس نے آصف کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ ہونٹوں کے خم سمیٹے، سکیڑے اور اک ادائے محجوبانہ سے سر کو جھٹکا دے کر اچٹتی سی نظریں اس پر ڈال کر مسکرا دی۔

اس کی ادا ایسی کافرانہ تھی۔ کہ آصف کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ اک لمحہ کو وہ بھول گیا۔ کہ وہ اپنی کس حس کی تسکین کے لیے یہاں کھڑا ہے۔ مجید کی آواز دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اسے اپنے سامنے کھڑی ثوبیہ کے سوا کسی شے کا احساس نہ رہا۔

ثوبیہ ـــ جو ـــ شاید اس کے لاشعور کی مدفون خواہش تھی۔

اور ـــ جسے اس رات خواب میں اس نے والہانہ انداز میں بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا۔ لذت کا وہ احساس اسے اب تک تر و تازہ محسوس ہوتا تھا

ثوبیہ نے بڑے دنوں بعد آج ان گہری آنکھوں میں انہماک کی گھلی گھلی کیفیت دیکھی۔ اک نشہ سا اس کے حواس پر چھا گیا۔

آصف اسے اسی انداز سے دیکھتا رہا۔

ثوبیہ کا چہرہ تمتما گیا۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے اس نے مینٹل پیس پر رکھے گلدان سے پھول توڑنے کے بہانے منہ پھیر لیا۔

وہ اسے اب بھی آنکھوں میں سپنوں کا مکھڑتا حسن لیے دیکھ رہا تھا

خاموشی سے گھبرا کر ثوبیہ نے ذرا سا رخ پھیر کر کہا۔ "آج آپ نے اپنی اطلاع دینے کا نیا طریق نکالا ـــ؟"

وہ چونکا اور پھر سنبھل گیا ـــ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔

"اوہ ـــ! وہ جانے کیا سمجھ کر ہلکا سا کھانسی۔ اور دلفریب انداز میں مسکراتے

ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ جاتے جاتے پردے سے ذرا سا چہرہ نکال کر اتنا ضرور کہا۔

"میری تکلیف کا اتنا ہی خیال ہے تو ذرا جلدی گھر آجایا کیجئے نا؟"

آصف کھویا کھویا اس پردے کو دیکھتا رہا جس کے پیچھے ثوبیہ غائب ہوئی تھی۔

"اسے کہہ دو جہاں سینگ سماتے ہیں چلا جائے ـــ وہ اب میری قوت برداشت سے باہر حرکتیں کرنے لگا ہے ـــ دل جلاؤ لا ہے کم بخت نے۔ مجید شاید منیرہ کی کسی بات سے پھر بھڑک اٹھا تھا۔ آصف، ثوبیہ کو بھول کر اس طرف پھر متوجہ ہو گیا۔ اس کی خوشیوں کو جیسے ٹھکانہ نہ مل رہا تھا۔ وہ اس وقت تک ڈرائنگ روم میں کھڑا رہا۔ جب تک مجید کے غرانے، تلملانے اور گرجنے کی صدائیں آتی رہیں۔

مجید کے مشتعل سراپا کا خیال کر کے آصف کے دل میں خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس کروٹیں لے رہا تھا۔ انتقامی حس تسکین پا رہی تھی نا؟

—— ٭ ——

"آصف!" — "آصی"! "آصی بیٹے!"

پھینٹ کے بڑے پھولوں والی سرخ رضائی تہہ کرتے ہوئے منیرہ آصف کو پکار رہی تھی۔

چار سالہ آصف آفت کا پرکالہ ہی تو تھا — ذرا دھیان ادھر ہوا اور جناب گلی میں غائب — گلی بھی کیا اچھی خاصی سڑک تھی — بیل گاڑیاں یکے، تانگے سارا دن گزرتے ہی رہتے —

دو تین دفعہ بلانے پر جب آصف نہ بولا تو منیرہ رضائی وہیں پھینک باہر لپکی کہ شاید منیر کے ساتھ وہ بھی باہر نہ نکل گیا ہو —

لیکن برآمدے میں آتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ آصف گلی میں نہیں گیا تھا بلکہ بڑی شان سے سائیکل پر براجمان تھا۔ اور منیر ایک ہاتھ سے اسے سہارا دیئے دوسرے سے سائیکل کا ہینڈل تھامے صحن میں چکر کاٹ رہا تھا۔

"واہ — وا —!" منیرہ انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

"آج دفتر سے چھٹی ہے شاید —"

"نہیں تو —" منیر نے جواب دیا۔

"پھر —؟"

"کیا کروں — تمہارے لاڈلے کا حکم ہے کہ سائیکل کی سواری کراؤ۔"

"اور آپ حکم کے بندے — جو کچھ اس نے کہا پورا کر دیا۔"

"جی صاحب — ہم تو ماں بیٹے کے غلام ہیں۔ منیر منیرہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر چہکا۔

"ہٹیئے بھی — وہ پیار اور شرارت بھری نظروں کی تاب نہ لا کر بولی۔

"کیوں — غلط کہا ہم نے —؟" منیرہ کو شوخ نظروں سے اب بھی دیکھ رہا تھا۔

"آؤ بیٹے —" منیرہ نے ہاتھ بڑھا کر آصف کو سائیکل سے اُتارنا چاہا۔

"نہیں آتے —" وہ منیر کی طرف جھک گیا۔

"ابو کو دفتر سے دیر ہو جائے گی؟"

"نہیں —"

"صاحب ماریں گے ابو کو۔"

"میں صاحب کو ماروں گا۔ ایسے ماروں گا۔" وہ تاؤ میں آ کر مکے دکھانے لگا۔ ہوا ہی میں مکا بازی کر کے اس نے اپنے غصے کا مظاہرہ کیا۔

"دیکھا ہمارا بیٹا" منیر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اور اس کی معصوم حرکت پر منیرہ بھی مسکرا دی۔

"چلو اب بس کرو۔ منیرہ نے ہاتھ بڑھایا۔ "ابو کو جانے دو۔"

"توبہ ہے تم تو بیٹھ لیے کر پیچھے پڑ جاتی ہو — دفتر جانا ہی ہے۔ کونسا گھر تمہارے گھومنے لگا بیٹھا رہوں گا۔" منیر شوخ نظروں سے منیرہ کو دیکھ رہا تھا۔

"روز ہی لیٹ ہو جاتے ہیں —"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ فکر مجھے ہونی چاہیئے۔"

"آپ کو ہونے سے رہی۔ آپ کا بس چلے تو دس بجے تک یہیں بیٹھے رہا کریں۔"

"کیا دل کی بات کہہ دی منیرہ۔ اللہ قسم کس کافر کا دل دس بجے بھی یہاں سے ہلنے کو چاہتا ہے۔ کم بخت نوکری لے ڈوبی ہمیں تو۔ ہم بھی کوئی رئیس ہوتے تو ٹھاٹھ سے

گھر بیٹھے اپنے بیٹوں سے کھیلا کرتے۔ بیٹوں کی امی سے دل لگی کیا کرتے۔"

وہ حسین شوخ نظروں سے منیرہ کو دیکھتے ہوئے بڑے مزاحیہ انداز میں کہتا تھا۔ "واللہ زندگی کا لطف ——"

"بس بس۔ ہوش کی دنیا میں آیئے۔ آٹھ بجنے والے ہیں۔" منیرہ اس کی سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائی۔

"اچھا جناب! آ گئے ہوش کی دنیا میں —— فرمایئے؟"

"دفتر تشریف لے جایئے؟"

"بہتر صاحب —— سنبھالو اپنے لاڈلے کو۔"

"آؤ آصف ——!" منیرہ نے آصف سے کہا۔

"نہیں آتے ——" وہ اکڑ بیٹھا۔

"جاؤ بیٹے —— واقعی دیر ہو رہی ہے —— شام کو تیار رہنا۔ ہم بازار لے چلیں گے۔" منیرہ نے زبردستی آصف کو سائیکل سے اتار لیا۔

ابو ——! وہ چیخ کر منیر کی طرف دوڑا۔

"گندے نہیں کیا کرتے بیٹے۔" منیر نے جھک کر اسے پیار کر لیا۔ "شام کو بازار لے گے —— مٹھائی لے کر دیں گے۔"

"مٹھائی نہیں۔ ٹافی۔"

"اچھا بھئی۔ ٹافی۔"

"دو ٹافیاں۔" آصف نے گول مٹول ہاتھ کی دو انگلیاں باپ کو دکھائیں۔

"اچھا۔ اچھا دو ہی لے دیں گے۔"

"کھلونے بھی۔"

"ہاں ہاں جو کہو گے لے دیں گے۔"

"ابو گڑیا بھی۔ وہ۔ سونے۔ جاگنے۔ والی۔ ایسی۔" وہ آنکھیں بند کرتے اور پھر کھولتے ہوئے بولا۔

منیر اور منیرہ اس کی معصوم حرکت پر مسکرا دیئے۔

"کتنی شدید خواہش ہے ہمارے منو میاں کو گڑیا کی ——" منیر شرارت بھری نظروں سے منیرہ کو دیکھ کر بولا۔ "ایک تم ہو کہ دھیان ہی نہیں دیتیں۔ ایک عدد گڑیا لاؤ اس کے لیے پیاری پیاری موہنی سی۔ بالکل اپنی طرح کی۔ تم تو میدان ہی چھوڑ بیٹھیں۔"

"ہائے اللہ!" منیرہ شرما سی گئی۔ منیر اسے اکثر چھیڑا کرتا تھا۔ اور وہ یونہی شرما جایا کرتی تھی۔

آصف کی گڑیا کے لیے صندلی نہ تھی۔ وہ دو سال کا تھا جب اللہ میاں نے اسے پیاری سی گڑیا دی تھی۔ چھوٹی بہن سے حسد یا حسد کرنے کی بجائے وہ اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ گڑیا صرف دو ہفتے ہی بعد چل بسی۔ منیرہ بھی سخت بیمار ہو گئی۔ شکل جانبر ہوئی۔ بچی کا بستر میاں بیوی کو جو تھا سو تھا۔ آصف تو اسے کھو کر تڑپ اٹھا۔ کئی دن بخار میں مبتلا رہا۔

وہ اب اس گڑیا کو تو بھول چکا تھا۔ لیکن مصنوعی گڑیوں سے شدید لگاؤ تھا۔ اس کے پاس کھیلنے کو کئی گڑیاں تھیں۔ لڑکے کا گڑیوں سے کھیلنا عجیب سی بات تھی۔ لیکن وہ جب بھی کھانے لیتا۔ گڑیا کی فرمائش سرفہرست ہوتی۔

ان دنوں وہ سونے جاگنے والی بڑی سی گڑیا کے لیے ضد کیا کرتا تھا۔

"اتنی بڑی گڑیا لوں گا؟" آصف نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"اچھا بھئی۔ اس دفعہ تو تمہیں ضرور لے دیں گے۔ تمہاری امی تو لانے سے رہیں۔" اس نے پھر منیرہ کو چھیڑا۔

بچی کی پیدائش کے بعد منیرہ کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی

سے شاید کچھ نقص واقع ہو گیا تھا۔ تب سے اب تک کوئی امید ہی نہ ہوئی تھی۔ منیر اکثر منیرہ کو چھیڑا کرتا تھا۔ بچوں کے لیے اس کی خواہش بھی شدید تھی لیکن علاج معالجے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

"اب جائیے بھی" منیرہ نے آصف کی انگلی پکڑ کر اپنی طرف کر کے سائیکل کے لیے راستہ بنایا۔

"اللہ قسم، جی نہیں چاہ رہا جانے کو۔"

"ابو نہ جاؤ۔" آصف باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"ہاں ہاں نہ جائیں۔" منیرہ نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا "تمہارے لیے گڑیا لینے جائیں یا ٹافیاں۔" ہیں نا۔"

"بھئی اس ماہ تو ضرور گڑیا لے کر دیں گے۔"

"کیوں نہیں۔ ایسی ہی ضروری ہے نا۔ سات آٹھ روپے سے کم کیا ہوگی۔"

"ہوا کرے اپنے بیٹو کی خواہش ہے۔ ہم اپنے خرچ میں کمی کر لیں گے۔ سگریٹ نہیں پئیں گے۔ لیکن گڑیا ضرور لائیں گے۔ تم جو نہیں لاتیں ہم ہی لے آئیں گے۔"

منیر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ سائیکل منیرہ نے تھام رکھی تھی۔

کچھ دیر یونہی دل لگی کرنے کے بعد منیر نے سائیکل سنبھالی۔

"ابو!" آصف اس کی ٹانگوں سے پھر لپٹ گیا۔

"کیا کرتے ہو آصی۔" منیرہ نے غصے سے ڈانٹا۔ "ساری پینٹ مسل دی تم نے — گندی کر دی ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے۔"

"رہنے دو۔ رہنے دو۔" منیر نے کہا۔ بچہ ہے وہ کیا سمجھے تمہاری صفائی کو۔"

"آپ نے تو اسے پیار میں بگاڑ دیا ہے۔"

"پگلی پیار سے بھی کوئی بگڑتا ہے۔"

"کیوں نہیں بگڑتا۔"

"پھر اپنے متعلق کیا خیال ہے۔ تم تو حد سے زیادہ بگڑ چکی ہو گی کیوں۔؟"

"میں۔ میں کیوں۔" وہ اس کی بات نہ سمجھی۔

"تمہیں تو میں شدت سے پیار کرتا ہوں۔" منیر نے ہنستے ہوئے منیرہ کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"ہٹئے بھی۔" پانچ سالہ بیاہی منیرہ شوہر کی بات سے نئی دلہن کی طرح شرما گئی۔ اور — منیر کسی مغرور نغمے کی طرح گنگناتا اس پر شوخ نظریں ڈالتا دروازے کی طرف چل دیا۔

آصف پھر دوڑا۔ لیکن منیرہ نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

ادھ کھلے دروازے سے وہ اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ سڑک کا موڑ مڑنے سے پہلے منیر نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

کنڈی چڑھا کر منیرہ آصف کو ساتھ لے کر اندر آ گئی۔

منیرہ مُنّے کے ساتھ دو کمرے کے اس چھوٹے سے مکان میں زندگی کی خوشیوں کے مزے لوٹ رہی تھی۔ چاہنے والا محبوب شوہر اور پھول کی طرح شگفتہ آصف اس کی زندگی کو پُر بہار بنائے تھا۔ گو آمدنی زیادہ نہ تھی۔ تاہم بڑے سکون سے کٹ رہی تھی۔

ان دنوں یوں بھی زندگی تصنع اور بناوٹ کے خول سے آزاد تھی۔ پاکستان نیا نیا معرض وجود میں آیا تھا۔ قربانی کے ہمہ گیر جذبے کا عکس ذہنوں پر ابھی تک مرکوز تھا۔ تعمیر و ترقی انفرادی نہیں اجتماعی نظریے کے تحت تھی۔ زندگی دولت سے عبارت نہ تھی بلکہ قناعت کا دوسرا نام تھا۔ دولت حاصل کرنے اور عیش و آرام کا فطری رجحان تو موجود تھا لیکن اس سلسلے میں یوں دوڑ دھوپ شروع نہ ہوئی تھی۔ کہ قناعت کا دامن

ہی ہاتھوں سے چھوٹ جائے۔ شاید اسی لیے لوگ ذہنی انتشار سے محفوظ تھے۔

منیر اور منیرہ بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ جو زندگی کے متعلق بڑا جان دار نظریہ رکھتے ہیں۔ مستقبل سے دونوں پُرامید تھے۔ ایک دوسرے کے پیار میں ڈوبے پُرخلوص تعاون سے دن گزار رہے تھے۔

آصف کو ساتھ لیے وہ کمرے میں آئی۔ بستر جھاڑے۔ رضائیاں تہہ کیں۔ میز کے اتارے ہوئے کپڑے کھونٹی پر ٹانگے۔ سپیل پلنگ کے نیچے جوڑ کر رکھے پانی کا گلاس آصف کو باورچی خانے میں رکھنے کو کہہ کر جھاڑ پونچھ اور صفائی میں لگ گئی۔

آصف میاں نے برآمدے ہی میں گلاس کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیا۔

گلاس ٹوٹنے کی آواز پر منیرہ دوڑی آئی۔

آصف کے گالوں پر ایک تھپیڑ جڑ کر وہ خوبصورت گلاس کے ٹکڑے دیکھنے لگی —

آصف رونے لگا۔

وہ آصف کو کوستے ہوئے ٹوٹی کرچیاں جمع کرنے لگی "کم بخت نے ایسا پیارا گلاس توڑ دیا۔ کتنا خوبصورت تھا۔ تم سے مضبوطی سے نہ پکڑا گیا۔ زبان چلانے میں تو خوب تیز ہو۔ کام ذرا سا نہیں ہو سکا۔

آصف اپنی مٹھیاں آنکھوں میں گھسائے جا رہا تھا۔ رُوں رُوں کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ باپ کا لاڈلا تھا۔ کبھی اس نے پھول تک نہ مارا تھا۔ ماں اکثر باپ کی غیر حاضری میں دو چار لگا کر معاملہ برابر کر دیا کرتی تھی۔ آصف کی ذہنی نشوونما کا اسے علم نہ تھا۔

بچہ اسی لیے باپ سے زیادہ پیار کرتا تھا۔

ماں سے لگاؤ زیادہ نہ تھا۔

آصف کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھ کر وہ گلاس کو بھول گئی۔ بازوؤں میں بھر کر اسے پیار کرنے لگی۔ اسے منیر کا خیال آ گیا۔ اگر وہ اسے آصف کو یوں تھپیڑ لگاتے دیکھ لیتا تو جانے منیرہ کی کیا گت بناتا۔

بہلا پھسلا کر اس نے آصف کو خوش کر لیا۔

اور

پھر

گھر کے دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

—

برآمدے میں سلائی کی مشین رکھے بیٹھی تھی۔ آصف کو اس نے نہلا دھلا کر سلا دیا تھا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر یہی وقت تھا جو وہ سوئی سلائی کے لیے نکال سکتی تھی۔ آصف کے سامنے تو مشین لے کر بیٹھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ماں سے زیادہ وہ خود کاریگر بننے کی کوشش کرتا۔ کبھی ہاتھ توڑ رہا ہے۔ کبھی پہیے کو گردش دے رہا ہے۔ کبھی خود مشین پر چڑھ بیٹھا ہے۔ منیرہ ڈانٹتی تو مشین کے سوراخوں میں کوئی نہ کوئی چیز پھنسا دیتا۔

منیرہ مشین کا کام آصف کو سلا کر ہی کیا کرتی۔ آج بھی اسے اپنی دو تین قمیضوں کو ٹھیک کرنا تھا۔ نیلی دری برآمدے میں ڈالے وہ چوکی پر مشین رکھے کام میں مصروف تھی۔ صحن کی درمیانی دیوار سے سر نکالے بی ہمسائی باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ جہان بھر کے قصے منیرہ کو سنا رہی تھی۔ محلے کے مکینوں کے بارے میں اس کی معلومات خاصی وسیع تھیں۔ فلاں گھر میں کیا ہوا۔ فلاں میاں بیوی کب جھگڑے۔ فلاں کی آمدنی کیا ہے۔ فلاں کے گھر کون آیا، کون گیا۔ اسے سب معلوم تھا۔ اس وقت بھی وہ مزے لے لے کر کونے والے مکان میں رہائش پذیر نئے بیاہتا جوڑے کی باتیں منیرہ کو سنا رہی تھی۔

منیرہ بھی کام میں منہمک ہونے کے باوجود پوری دل چسپی سے اس قصے کو سن رہی تھی۔

"کیا بتاؤں بہن۔ میاں تو بے دام غلام ہیں۔ جس وقت دیکھو"

لیکن دروازے پر دستک نے بی ہمسائی کا جملہ ادھورا ہی رہنے دیا۔

"تمہارا دروازہ ہے شاید۔" بی ہمسائی کہتے ہوئے اپنے صحن میں غوطہ لگا گئی۔

"کون ——؟" منیرہ نے مشین کی ہتھی پر ہاتھ روک کر دروازے کی طرف توجہ دی۔ دروازہ پھر کھٹ کھٹایا گیا۔

منیرہ کام چھوڑ کر جلدی سے اٹھی۔ دوپٹہ درست کیا۔ پاؤں میں سلیپر اڑسے۔ اور جلدی سے ڈیوڑھی کی طرف لپکی۔

"کون ہے۔" اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر پوچھا

"میں —— ہوں۔ بھابی۔ اعظم ہوں۔" بھاری بھاری رکتی رکتی آواز آئی۔

اعظم اسی محلے میں رہتا تھا۔ منیرہ کے دفتر ہی میں کام کرنے کی وجہ سے دونوں کی آپس میں خاصی دوستی تھی۔ منیرہ، اعظم کو اچھی طرح جانتی تھی لیکن آج اس کی آواز کچھ بھاری بھاری تھی۔ شاید زکام کا اثر ہو۔ لیکن پھر بھی منیرہ کو کچھ بے اطمینانی سی ہوئی۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اس نے تھوڑا سا پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ اعظم ہی تھا۔

لیکن —— جس حلیے میں اعظم کھڑا تھا۔ منیرہ ششدر سی رہ گئی۔

اس کے بال بکھرے تھے۔ رنگ اڑا اڑا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں سخت پریشانی اور اضطراب کے عالم میں ہاتھ مسل رہا تھا۔ وہ شاید کانپ بھی رہا تھا۔

سامنے ہی وہ تانگہ بھی کھڑا تھا جس سے ابھی ابھی اعظم اترا تھا۔

"کیا بات ہے اعظم بھائی؟" منیرہ کے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے۔

"بھابی ——!" اعظم کی بھاری آواز پھٹ گئی۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر کر دل پھیر لیا۔

"خیریت تو ہے اعظم بھائی۔؟" منیرہ کے سارے وجود میں سنسناہٹ سی محسوس

ہونے لگی۔ کسی نامعلوم خدشے سے اس کا دل بیٹھ ہی تو گیا۔

"جلدی چلیئے بھابی — منیر کو!"

"ایکسیڈنٹ؟"

"ایکسیڈنٹ — !"

اک گھٹی ہوئی چیخ منیرہ کے لبوں سے نکلی۔ اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ اور وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی اسے اتنا ہوش ہی نہ رہا کہ اعظم سے پردہ کرتی ہے۔

"ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جلدی ہسپتال چلیئے۔ منیر کی حالت!"

"منیر — اُوہ تڑپ کر چیخی۔ ٹاٹ کی اوٹ میں کھڑی بی ہمسائی دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر لپک کر آئی۔ اس نے منیرہ کو تھام لیا۔ ورنہ وہ تو چکرا کر گر چکی تھی۔

بی ہمسائی بھی اس ناگہانی افتاد سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

سامنے گھر والے مرد نے یہ ماجرا دیکھا تو دوڑا آیا۔ دائیں ہاتھ والی پڑوسن بھی پہنچ بچے، مرد، عورتیں دم بھر میں منیرہ کے دروازے کے سامنے جمع ہو گئے۔

ہر کوئی تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ لیکن اعظم بیچارے میں ہر ایک تفصیل سنانے کی قوت ہی نہ تھی۔ صرف یہی بتا سکا۔ کہ منیر بُری طرح کچلا گیا ہے اس کی حالت مخدوش ہے۔

"بچ تو جائیں گے؟" کسی نے پوچھا۔

اعظم نے جواب دینے کی بجائے منیرہ سے کہا "جلدی کرو بھابی۔ کہیں دیر سے — منیر — ہم سے روٹھ ہی نہ جائے۔"

اعظم تانگے کی طرف پلٹا۔ کئی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ منیرہ بُت بنی پھٹی نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔

جانے کس نے پلنگ کی چادر گھسیٹ کر اس پر ڈالی۔ کس نے سہارا دیا۔ کون اسے ساتھ لگا کر تانگے پر بٹھا۔ اور کون گھر پہ رہا۔ منیرہ بے جان لاش کی طرح ہسپتال پہنچی۔

کچھ رشتہ داروں کو بھی خبر مل چکی تھی۔ رشتے کا ایک بھائی لپک کر تانگے کی طرف آیا اور منیرہ کو سہارا دے کر اس وارڈ کی طرف لے گیا۔ جس طرف منیر کا ناطہ حیات سے ٹوٹ رہا تھا۔

عین اسی وقت ایک نرس منہ لٹکائے باہر نکلی۔ کسی کو بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ منیر حیات کی قید سے آزاد ہو چکا ہے۔

مضمحل آواز میں نرس نے منیر کی موت کی خبر سنائی۔ اک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ دوست احباب۔ رشتے دار جو بھی اس موقع پر موجود تھے۔ آنسو ضبط نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ وہ لاگیر جو اس کی کچلی کچلائی زندہ لاش لے کر ہسپتال آئے تھے۔ اس جواں مرگ کے لیے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

منیرہ چند لمحے ساکت سی کھڑی رہی۔

پھر — اک دل دوز چیخ ماری۔ "منیر — !" وہ پاگلوں کی طرح اس دروازے میں داخل ہوئی۔ جہاں سے نرس نکلی تھی۔

سفید بستر پر تازہ تازہ خون۔ چور چور جسم اور بند آنکھوں والا منیر پڑا تھا۔

موت کا ہولناک مذاق۔ بے بس زندگی کی شکست۔ جس نے دیکھا دل تھام کر رہ گیا۔

منیرہ پچھاڑیں کھا کھا کر گری۔ منیر کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہلایا۔ چیخ چیخ کر پکارا۔ اس نے سینہ پیٹ ڈالا۔ بال نوچ لیے۔ سر سے چادر جانے کہاں گری۔ وہ منیر سے لپٹ لپٹ گئی۔

لیکن — منیر — وہ تو یوں چپ سادھے پڑا تھا۔ جیسے منیرہ کو پہچانتا ہی نہ ہو۔ منیرہ کی آنکھوں میں ذرا سی نمی دیکھ کر تڑپ جانے والا منیر آج اس کے بارش کی طرح برسنے والے آنسوؤں سے بھی متاثر نہ ہو رہا تھا۔

اتنے پکّے پکّے وعدے کرنے والے منیر کا ناطہ اتنا کچّا تھا!

منیرہ نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

شام تک لاش مل گئی۔ منیرہ کو بھی نیم بے ہوشی کے عالم میں گھر لایا گیا۔

گھر میں اک کہرام مچ گیا — قیامت بپا ہو گئی — وہی پُرسکون — اور خاموش سا گھر — جہاں منیر اور منیرہ ایک دوسرے کے پیار میں ڈوبے راہِ زندگی پر گامزن تھے، میدانِ حشر کی طرح دکھائی دینے لگا۔

منیرہ کو تو کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ وہ تو ہوش میں آ آ کر بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس کی بیوہ نند بھی بھائی کے اس اچانک صدمے سے بے حال ہو رہی تھی۔ منیرہ کی دونوں بھابیاں روتے دھوتے گھر کا سامان سمیٹ سمیٹ کر لوگوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا رہی تھیں۔ اپنے پرائے سبھی ماتم کناں تھے۔

ننھا آصف سہم کر باورچی خانے کے تاریک کونے میں جا چھپا تھا۔ جانے کس نیک دل کی نظر اس پر پڑی اور اسے گود میں لے کر پیار کرنے کے بعد بی ہمسائی کے گھر جا کر سُلا دیا۔

لاش کی حالت کے پیشِ نظر کفن دفن کی تیاری بہت جلد کی گئی۔

اور — اسی رات — منیر کو اس کی والدہ کی قبر کے پہلو میں ہمیشہ کی نیند سُلا دیا گیا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور اتنی جلدی ہوا کہ منیرہ کے حواس کئی دن ٹھکانے نہ آ سکے۔ کبھی تو وہ بلند آواز میں بَین کرنے لگتی۔ کبھی گھنٹوں چپ چاپ خلاؤں میں

گھورتی رہتی۔

اور

کبھی

تعزیت کو آنے والوں کا دامن پکڑ پکڑ کر پوچھتی،

"کوئی یوں بھی لُٹ جاتا ہے۔"

آنسوؤں اور ہچکیوں کے سوا اس کے اس مختصر سوال کا جواب کسی سے بھی نہ بن پڑتا۔

— ٭ —

کے لمحے لمحے سے خوش گوار امیدیں وابستہ کرنے والا منیر اس

مستقبل

خاموشی سے اٹھ گیا۔ کہ منیرہ کی ساری ہستی تہس نہس ہو کر رہ گئی۔

منیر اور منیرہ کے والدین حیات نہ تھے۔ منیر کی بیوہ بہن خود حالات کی تلخیوں کا شکار تھی۔ منیرہ کا اس کے پاس اٹھ جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ لے دے کے دو بھائی تھے اب اس کا وہی آسرا تھے۔

سیلن اور بدبو والی تنگ گلی کے جہاں دھوپ کا کبھی گزر ہوا ہی نہ تھا۔ اک بوسیدہ سے مکان میں منیرہ کے دونوں بھائی رہائش پذیر تھے۔ نچلے حصے میں بڑا بھائی رہتا تھا۔ اس کے بسے چوڑے خاندان میں آٹھ چھوٹے بڑے بچوں کے علاوہ نابینا خسر بھی شامل تھا۔ نواں بچہ بیوی کے تھل تھل کرتے وجود میں پرورش پا رہا تھا۔ آمدنی قلیل تھی۔ گزارہ بھی مشکل سے ہوتا تھا۔

نچلے حصے کی بیٹھک بھی بڑے بھائی کے قبضے میں تھی۔ بیٹھک، کا ایک دروازہ گلی اور دوسرا لمبی تاریک اور کچی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ اس ڈیوڑھی میں دن کو بھی رات ہی کا سماں رہتا تھا۔

بیٹھک میں اک پرانے طرز کا بڑا سا چوبی پلنگ تھا۔ جس کے تکیے میں لگے آئینے زمانے کی دھول سے دھندلا گئے تھے۔ اس پلنگ پر اک ملگجی سی چادر ضرور پڑی رہتی۔ لیکن بچوں کی افراط نے اسے کبھی ڈھنگ سے پڑا رہنے نہ دیا تھا۔

دو چار بے رنگ و روغن کرسیاں بھی تھیں۔ اور ایک عیاشی کی ماری ٹانگوں والی میز جس پر کڑھائی کا بنا رومال بچھا رہتا۔ رومال کبھی سفید ہوگا۔ لیکن اب تو دھوئیں اور مٹی نے اس کا رنگ ہلکا نسواری کر دیا تھا۔

فرش پر چوڑی چوڑی دھاریاں والی دری بچھی تھی۔ جس کا رنگ کبھی کا اڑ چکا تھا۔ اور اب فرش اور دری میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ سامنے کی دیوار میں دو الماریاں بھی تھیں جن میں اللہ جانے کیا کیا ٹھنسا رہتا تھا۔ البتہ ان کے اوپر محرابی طاقوں میں بھٹی پھٹی بوسیدہ کتابیں۔ تیل کی شیشیاں اور حکیم صاحب سے وقتاً فوقتاً لائی ہوئی چوشاندے کی پڑیاں سبھی خلط ملط پڑی تھیں۔ بے قلعی دیواروں پر کئی قطعے، پھولوں کی تصویریں اور وقت کی مشہور ایکٹرسوں کے فوٹو چسپاں کر کے کمرے کو شاید خوش گوار تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

ٹوٹی پھوٹی منسل پیس پر کتابیں، کنگھا تیل کی شیشی، ٹوٹا ہوا آئینہ، پالش کی ڈبی سبھی کچھ دھرا رہتا تھا۔

بیٹھک کا ایک دروازہ صحن میں بھی کھلتا تھا۔ چھوٹا سا صحن، جس کا سرخ اینٹوں کا فرش میل جم جانے سے سلیٹی رنگ کا نظر آتا تھا۔ دائیں کونے میں پانی کا نل تھا جس کے نیچے نہایا بھی جاتا۔ کپڑے بھی دھوئے جاتے اور برتن بھی۔ میلے برتنوں کا ڈھیر اکثر اسی نل کے نیچے جمع رہتا۔ مکھیاں دعوتِ طعام کے مزے لوٹا کرتیں۔

سامنے والے کونے میں مٹی کا چولھا بنا تھا۔ اوپر دیوار کے ساتھ لکڑی کا تختہ جڑ کر مرچ مصالحوں کے ڈبے اور دوسرے ضروری برتن رکھ دیے گئے تھے۔ بڑی سی بے رنگ پیڑھی چولھے کے قریب بچھی رہتی۔ جس پر منیرہ کی بڑی بھابی خورشید بیٹھ کر بچوں کی فوج کے لیے کھانا بھی پکاتی۔ کھلاتی بھی اور ساتھ ہی ساتھ ڈیوڑھی پر بھی نظر رکھتی۔ اوپر جانے آنے والوں کا دھیان رکھنے کا کام بھی اسی

پیڑھی پر بیٹھ کر کرتی۔

دیوار کے ساتھ جھلنگا سی چارپائی پر خورشید کا نابینا باپ بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہتا۔ اور جب کھانسی کے ساتھ بلغم تھوکتا تو سامنے کی دیوار اور صحن کا ملگجا فرش بھر ڈالتا۔

صحن پار کر کے ایک لمبا تاریک سا دالان تھا جس میں بچوں کی فوج کیڑوں کی طرح رینگتی رہتی۔ اسی دالان میں دو چارپائیوں پر گندے مندے بستر ڈھیر کیے رہتے۔ چارپائیوں کے نیچے لوہے اور لکڑی کے ٹوٹے صندوق بھی رکھے ہوتے۔ جن کے منہ کبھی بند نہ ہوتے ادھ اندر سے اٹھر ٹھسے ہوئے کپڑے باہر نکلنے کو کوشاں نظر آتے۔ صحن میں بچوں کے جوتے، کھانے کے برتن اور پہننے کے کپڑے سبھی یوں بکھرے رہتے۔ جیسے آندھی کے بعد درختوں سے پتے جھڑ کر بکھر جاتے ہیں۔

خورشید بچوں کی افراط اور پیسے کی قلت سے بے حد چڑچڑی ہو گئی تھی۔ سارا دن بچوں کو بددعائیں دیتے گزر جاتا۔ صفائی کے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ اتنے لاؤ لشکر کو سنبھالنا ہمت کا کام تھا۔ میلے کچیلے بچے دالان میں رینگتے رینگتے گلیوں میں پہنچ کر جوانی کی حدود میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ گندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ میلے میلے لمبے لمبے فراکوں والی لڑکیاں اور گھٹنوں سے نیچے ڈھلکی نیکروں سے باہر نکالے کرتوں والے لڑکے سارا دن دھما چوکڑی مچائے رکھتے۔

اوپر والے حصے کے دونوں کمرے چھوٹے بھائی بدرالدین کے قبضہ میں تھے۔ آمدنی تو اس کی بھی وافر نہ تھی۔ لیکن اس کی بیوی سردار سلیقے والی عورت تھی۔ کچھ ویسے بھی صفائی پسند تھی۔ اس لیے اوپر والا یہ حصہ بوسیدہ ہونے کے باوجود صاف ستھرا تھا۔

صحن کے ساتھ ہی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ جسے سردار ہمیشہ لیپ پوت کر صاف ستھرا رکھتی۔ آٹے کے کنستر اور گھی کے ٹین بھی چمکتے رہتے۔

دونوں کمروں میں سامان ترتیب سے رکھا رہتا۔ لکڑی کے دونوں پلنگوں پر کروشیے

کی جھالر لگی پھول دار چادریں پڑی رہتی تھیں۔ بکس قرینے سے اوپر نیچے رکھے ہوتے اور سردار پرانی چادروں سے کئی دار غلاف بنا کر ان پر ڈال دیا کرتی۔

اس کے بچے صاف ستھرے رہتے۔ لیکن ان کی اخلاقی تربیت ڈھنگ سے نہ ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ نیچے والوں سے نت لڑائیاں تھیں۔ خورشید کے میلے کچیلے بچے جب بھی اوپر آتے بے دریغ پلنگوں پر چڑھ کر لت پت پیروں کے نشان بنا دیتے۔ سُرخ اینٹوں کے فرش پر پھلوں کے چھلکے، اور کاغذ پھینکنے کے علاوہ بلا تکلف تھوکتے بھی پھرتے۔ سردار اُن کے کان مروڑ دیتی۔ بے نقط سناؤ الٹی اور جب اس کی آواز خورشید کے کانوں تک پہنچتی تو اچھی خاصی لڑائی کا سامان ہو جاتا۔ پھر نیچے سے خورشید اور اوپر سے سردار دونوں بلا سوچے سمجھے بکے جاتیں۔ سردار آدھا دھڑ جنگلے سے لٹکا کر ہاتھ ہلا ہلا کر برستی۔ خورشید بازو اٹھا اٹھا کر غراتی۔ تو سارا محلہ سنتا۔ ایک دوسرے کے میکے والوں میں کیڑے ڈالے جاتے۔ برا بھلا کہا جاتا۔ اور پھر کئی کئی دن ایک دوسرے سے تنفر ہو کر بات چیت بند کر دی جاتی۔ اب تو بچوں نے بھی اس کار خیر میں اپنی ماؤں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ جب مائیں شروع ہوتیں تو بچے بھی ایک دوسرے کو کوسنے لگتے اور اکثر گتھم گتھا ہو جاتے۔

اس قسم کے گھر اور اس طرح کے ماحول میں تقدیر نے منیرہ کو لا پٹخا۔

منیرہ — جو — اپنے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی تھی۔

چھوٹا سا گھر — جہاں وہ اور منیر زندگی بھر ساتھ دینے کی قسمیں کھا کر ایک دوسرے کے سہارے راہِ زندگی پر گامزن تھے۔

جہاں ان کے مسرت بھرے قہقہوں کی گونج تھی — اور — جس کی فضا میں ان کے پیار کے سینکڑوں رازوں کی باس رچی تھی۔

وہ گھر اُجڑ گیا ـــــ زندگی بھر ساتھ دینے کی قسمیں ٹوٹ گئیں۔
مسرتوں کے قہقہے چیخیں بن گئیں ـــــ راز بکھر گئے۔
اور ـــــ بدنصیب منیرہ اپنے پھول سے لاڈلے بچے کو لے کر بھائیوں کے
در پہ آن پڑی۔

منیرہ نے بچھڑنے کے بعد گھر سے بچھڑنے کا چرکہ بھی کھایا ـــــ تڑپ کر روئی
اور رو رو کر تڑپی۔

لیکن نوشتۂ تقدیر یہی تھا ـــــ کر کیا سکتی تھی۔

زخم تازہ تازہ تھا۔ بھائیوں نے بہن کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ بھابیوں
نے بھی آنسو بہانے میں ساتھ دیا۔ آنے جانے والوں نے بھی زخم پر مرہم رکھنے کی
کوشش کی۔ لیکن منیرہ کا غم ایسا تو نہ تھا ـــــ جو ان باتوں سے مٹ جاتا۔

روتے دھوتے دن گزرنے لگے۔ ماں بیٹا جب بہت بے چین ہوتے تو منیرہ کی
قبر پر جا بیٹھتے۔

آصف ماں کے سمجھانے کے باوجود یقین نہ کرتا۔ کہ اسے سائیکل کی سواری کرانے
بازار سے ٹافیاں خرید کر دینے۔ اور کندھوں پر بٹھا کر گھوڑا بننے والا ابو یوں مٹی کا
ڈھیر بھی بن سکتا ہے۔

خود منیرہ بھی ویرانگی کے عالم میں قبر سے لپٹ کر یہی سوچا کرتی۔ اتنا شوخ، اتنا
چلبلا اور ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا منیر منوں مٹی کے نیچے کیونکر دم سادھے پڑا
ہے۔ جنون کے عالم میں کئی بار اس نے مٹی کے ڈھیر کو جھنجھوڑ ڈالا تھا ـــــ لیکن
جانے والا منہ موڑ کر جا چکا تھا اسے اب ان ہیجانی حرکات سے واسطہ بھی کیا
رہ گیا تھا۔

گھر چلو" آصف بُری طرح مچلا ہُوا تھا۔

"امّی ـــــ" آصی بیٹے۔ یُوں تنگ نہیں کیا کرتے" گلوگیر آواز میں منیرہ
کہہ رہی تھی۔

"اپنے گھر چلو امّی ـــــ ابّو کے پاس ـــــ ابّو کے پاس چلو ـــــ؟ اس نے چیخ کر
ماں کا بازو کھینچا ـــــ "میں یہاں نہیں رہتا۔ اپنے گھر چلو۔"

"آصف"

"ابّو پاس چلو نا"

"ابّو ـــــ؟" منیرہ کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ آصف جوں جوں مچلتا گیا منیرہ کے
آنسو تیز ہوتے گئے۔

ابّو، گھر آئے ہیں۔ میری ٹافیاں لائے ہیں امّی۔ گڑیا بھی"

اور پھر بسورنا بھول کر وہ اپنے گرد کھڑے خورشید کے بچوں کو اپنے ابّو کے
بارے میں بتانے لگا۔

"میرے ابّو اتنا پیار کرتے ہیں مجھے" اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے۔
"چیزیں بھی لا کر دیتے ہیں۔ کھلونے بھی۔ جب اللہ میاں پاس سے آئیں گے۔ تو
اتنی بڑی گڑیا لائیں گے ـــــ ہاں ـــــ ہیں نا امّی؟"

وہ پھر ماں کی طرف متوجہ ہو گیا جو خورشید کے پاس پیڑھی پہ بیٹھی آنچل سے منہ چھپائے
سسکیاں بھر رہی تھی۔

"امی۔ ابو۔؟" آصف ایک دم منہ بسورنے لگا۔

"ہائے ہائے کیا بچہ ہے۔ ہر وقت ایک ہی رٹ۔ تم بھی کمال ہی کرتی ہو منیزہ یوں رونے دھونے سے تو وقت گزرنے سے رہا۔ بچے کو بہلاؤ تم تو الٹا ہی خود بھی آنسو بہانے بیٹھ جاتی ہو۔ یوں بھی دن گزریں گے بھلا۔ کچھ کام کاج میں دھیان لگایا کرو اسے باہر گلی میں کھیلنے بھیجا کرو۔ تم تو سارا دن بس اسے گلے سے لگائے بیٹھی رہتی ہو۔ بچہ ہے کیا سمجھ سکتا ہے۔ تم تو بچہ نہیں ہو!"

منیزہ نے آنسو پونچھے۔ لیکن آنسو رکے نہیں۔ آج خورشید کے لہجے میں ہمدردی کی جگہ اس نے تلخی سی محسوس کی۔ اس کا سینہ غم سے پھٹنے لگا۔

خورشید اپنا بھاری بھرکم وجود بیلے پیڑھی سے اٹھی۔ منیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اور جھلنگا سی چارپائی پر بٹھا دیا۔

"اللہ کی رضا پر بندہ راضی ــــ کب تک یونہی روتی رہو گی۔ صبر اور حوصلے سے کام لو۔ ابھی تو پہاڑ سی زندگی پڑی ہے۔ اور اس چھوکرے کو تو دیکھو۔ چلو باہر کھیلو جاکر!" خورشید نے آصف کو سختی سے کندھے سے پکڑ کر باہر ڈیوڑھی میں دھکیلا۔

منیزہ ہکا بکا رہ گئی۔ اور ششدر کھڑے آصف کو سینے سے لگا لیا۔

"تم تو سستا ناش کرو گی بچے کا۔" خورشید بیزاری سے بولی۔ "ہمارے بچے بھی تو ہیں۔ گلیوں میں ہی کھیلتے پھرتے ہیں۔ تم کب تک اسے گھٹنے سے لگائے رکھو گی؟"

منیزہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ آصف اپنا کندھا دبا رہا تھا۔ بیچارہ معصوم بچہ جس نے آج تک گرم و نرم بانہوں کا لوچ اور خلوص و پیار کی نرمی ہی دیکھی تھی۔ اسی طرح جھنجھوڑے جانے پر ہکا بکا کھڑا اماں کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

خورشید ماتھے پر شکنیں ڈالے پیڑھی پر آ بیٹھی اور موٹی موٹی لکڑیاں چولھے میں گھساتے ہوئے آگ دہکانے لگی۔ منیزہ کے رونے اور آصف کو یوں پیار کرنے پر اسے خواہ مخواہ

غصہ آ رہا تھا۔

دراصل ــــ اس کے خلوص سے ملمع اور ظاہرداری کی چادر کھسک رہی تھی۔ منیزہ مہینہ بھر سے اسی کے ہاں پڑی تھی۔ سردار بیکے گئی ہوئی تھی۔ اس بیسے ماں بیٹا مسلسل ایک ماہ سے نیچے ہی مقیم تھے۔ تین چار ماہ جو منیزہ نے یہاں گزارے تھے زیادہ عرصہ نیچے ہی مقیم تھے۔ تین چار ماہ جو منیزہ نے یہاں گزارے تھے۔ زیادہ عرصہ نیچے ہی رہی تھی۔ خورشید کب تک یہ بلائے ناگہانی برداشت کرتی۔ آخر پھٹ ہی پڑی۔

منیزہ رویے کی تبدیلی تو کچھ عرصے سے خود ہی محسوس کر رہی تھی۔ آج بھابی کے لہجے کی تلخی سے دل غم سے پھٹنے لگا۔

چولھے میں آگ جلاتے ہوئے خورشید بڑبڑا رہی تھی۔ صبح شام آنسو بہانے کے سوا کام ہی نہیں۔ تقدیر سے یوں کون لڑ سکتا ہے۔ بھلا کوئی اور کام کاج کرو۔ دھیان بٹے گا۔ دنیا میں یونہی ہوتا رہتا ہے۔

بھابی کو بڑبڑاتے چھوڑ کر وہ آصف کو لے کر اوپر اسی چھجا نما گیلری میں چلی گئی۔ جہاں رو رو کر وہ دل کا غبار نکال سکتی تھی۔

یہ چھجا نما گیلری ہی اب اس کا مسکن تھی۔ گھر میں کوئی فالتو کمرہ تو تھا نہیں جو اسے دے دیا جاتا۔ اسی شکستہ گیلری میں ٹھونس کر ایک چارپائی بچھا دی گئی تھی۔ دوسری طرف اس کے دو چار بکس رکھ دیے گئے تھے۔ باقی سامان کچھ تو اوپنے پونے فروخت کر کے چالیسویں تک کا خرچہ پورا کیا گیا تھا۔ کچھ نیچے کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ چھجا نما گیلری کا جنگلہ ٹوٹا پھوٹا تھا۔ گلی سڑی چکیں لٹک رہی تھیں۔ ایک چادر باندھ کر گلی اور سامنے والے گھر سے پردے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ پہلے پہل تو منیزہ کا اس جگہ دم گھٹتا اسے یوں لگتا جیسے جیتے جی وہ بھی منیزہ کی طرح قبر میں آ لیٹی ہے۔ لیکن اب یہی جگہ غنیمت تھی۔ اور کچھ نہیں تو جی بھر کر رو تو لیتی تھی یہاں۔

آج بھی وہ آصف کو گلے لگا کر جی بھر کر روئی۔

لیکن ــــ یہ ایک دن کی بات تھی نہ دو کی۔

بھابیوں کا رویہ اور بھی بدلتا ہی گیا۔

بظاہر سردار نے بڑی ہمدردی ظاہر کی لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی اپنے متھکنڈے استعمال کرنے لگی۔

آصف پلنگ پر جا چڑھتا تو بُری طرح ان کے کان مروڑ ڈالتی۔ وہ رو دیتا تو الٹا منیرہ کو ہی سنانے لگتی ــــ "کچھ تمیز تو سکھاؤ اسے۔ ہمارا کیا ہے۔ تمہارا بچہ ہی خوار ہوگا۔ یہی عمر سیکھنے کی ہے۔ ہم کچھ کہیں تو تمہیں بُرا لگتا ہے۔"

منیرہ بیچاری کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہ کیا کرے۔ زندگی اجیرن تھی۔ آصف لاڈ پیار کا عادی تھا۔ وہ کیوں کر بھابیوں کو راس کرتی۔ کلیجے پر پتھر کی سِل رکھ کر دن گزارنے لگی۔

دونوں بھابیوں نے کام کاج میں دل لگانے کی تلقین شروع کر دی تھی۔ وہ بچی نہ تھی۔ سب سمجھتی تھی۔ یوں چارپائی پر بیٹھا کر تو اسے کوئی کھلانے سے رہا۔ دونوں بھائیوں نے مہینہ مہینہ منیرہ کو اپنے ہاں رکھنے کی باریاں مقرر کر لی تھیں۔ مالی حالات دونوں کے اتنے اچھے نہ تھے۔ اس لیے وہ بھی مجبور تھے۔

تقدیر پر شاکر ہو کر منیرہ نے بھی حالات کی تلخیوں کو گلے لگانے کا تہیہ کر لیا۔ اپنی ازدواجی زندگی کی بہاروں کو بھول کر بیوگی کی خزاؤں سے دل لگانے لگی۔ بھابیوں کے رویے بدل گئے تھے۔ اب وہ جس بھابی کے پاس ہوتی۔ نوکرانیوں کی طرح کام کرتی۔ میلے برتن مانجھتی ــــ میلے کچیلے کپڑے دھوتی۔ جھاڑو دیتی۔ کھانا پکانے میں مدد دیتی۔

اور ــــ واقعی ــــ کام کاج میں دل لگا کر وہ منیرہ کا غم تو کیا آصف کو بھی بھول گئی تھی۔ دوسرے بچوں کی طرح اب آصف بھی گندا منڈا پھرتا رہتا۔ جیب میں گڑ کے چنے ہوتے۔ چہرے پر میل کے دھبے ــــ سارا دن اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر گھومتا پھرتا رہتا۔

منیرہ نے دل پتھر کر لیا تھا۔ گوئی مٹول صاف ستھرا آصف اب خورشید کے بچوں ہی کی طرح گندگی کا کیڑا بن گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی لیکن کر کچھ بھی نہ سکتی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ ہر روز نہلا دھلا کر آصف کے کپڑے بدلتی تھی تو خورشید نے باتوں باتوں میں جتلا دیا تھا۔ کہ یوں نوابوں کی طرح یہاں رہنا مشکل ہے روز کپڑے دھونے کے لیے صابن کہاں سے آئے گا۔

منیرہ نے خاموشی سے اپنا طریق بدل دیا تھا۔ ہفتہ ہفتہ بھر اس کے کپڑے نہ بدلتی۔ منہ ہاتھ بھی ڈھنگ سے نہ دھلاتی۔ صبح سے شام تک جُٹی رہتی تھی۔ وقت بھی کہاں ملتا تھا اپنے لال کو سنوارنے کا۔

لیکن ــــ ان ساری باتوں کے باوجود کسی نے آصف کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ نہ رکھا۔ وہ اوپر آتا تو سردار کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی۔ "فتنہ ہے فتنہ" قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہتی۔

نیچے جاتا تو خورشید ڈانٹتی۔ منہ پھلا کر نقلیں اتارتی۔ بیچارہ بچہ ان باتوں کو کیا سمجھتا ٹک ٹک ممانیوں کا منہ دیکھے جاتا۔

ــــ ٭ ــــ

رات کا چکر چلتا رہا۔

دن آصف کے ساتھ مہمانیوں کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔

معصوم بچے ان کے عناد کی وجہ تو نہیں سمجھتا تھا۔ ہاں اس کے ننھے سے دل میں منزل کے خلاف نفرت کا لاوہ پکنے لگا۔

اور — اس نفرت کے اظہار کا جو طریق اس کی سمجھ میں آیا۔

وہ — ان کا کہا نہ مانتا تھا۔

"آصف اس کٹورے میں پانی دینا!" سردار لگن میں آٹا ڈالتے ہوئے بولی۔

آصف باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے سردار کی طرف دیکھا۔ ضرور لیکن کٹورہ نہیں پکڑایا۔

"سنتے نہیں ہو؟" سردار جھلا کر بولی۔

آصف وہیں کھڑا رہا۔ لیکن کٹورے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سردار کو تاؤ آ گیا۔

"ڈھیٹ کہیں کا۔ سنتا نہیں تو۔ کیا کہہ رہی ہوں! وہ لگن وہیں رکھ کر اس کی طرف لپکی۔

آصف ڈھٹائی سے وہیں کھڑا رہا۔

"کیسا نڈر اور ڈھیٹ ہے یہ بچہ۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھے جا رہا ہے۔ اور کہنا سننا ہی نہیں۔" سردار نے کٹورہ آصف کے کندھے پر مارا۔

"بدتمیز۔" وہ غرائی۔

"جی تو۔" وہ اسی تنزی سے جواباً بولا۔

سردار تو اس جواب سے شعلے کی طرح مشتعل ہو گئی۔ آٹے بھرے ہاتھوں سے آصف کو گھسیٹتے ہوئے صحن میں لا کر منیرہ کے سامنے پٹخا۔ جو سردار کے بچوں کے پرانے کپڑے مشین پر آصف کے لیے مرمت کر رہی تھی۔

"دیکھ لو اپنے لاڈلے کے کرتوت!"

"کیوں۔ کیا ہوا بھابی؟" وہ گھبرا گئی۔

"مجھے کہتا ہے بدتمیز!" اس نے غصے سے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا۔

منیرہ تو گنگ سی دونوں کو دیکھتی رہ گئی۔ سردار کی بات کا اسے یقین ہی نہ آیا۔

"تمہارے لاڈ پیار نے ستیاناس کیا ہے اس کا۔ کہنا تو کبھی مانتا ہی نہیں! اب زبان درازی بھی شروع کر دی۔"

"آصف بیٹے! آپ نے کیا کہا ممانی جان کو؟" منیرہ نے آصف کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر پیار سے پوچھا۔

"لو۔ اب اس سے تو یوں پوچھ رہی ہے جیسے میں نے جھوٹ کہہ دیا۔ اللہ میری توبہ! میرا بچہ ہوتا۔ تو گدی سے زبان کھینچ لیتی۔ ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ اب یکنے جھکنے پہ بھی اتر آیا ہے مجھے تو اپنے بچوں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہی کچھ سیکھ جائیں گے۔"

"چلو معافی مانگ لو۔" منیرہ سردار کی باتوں سے بھڑک کر غصے سے بولی۔

لیکن — آصف ڈھٹائی سے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے سے جرم عیاں تھا۔

"مانگو معافی!" اسے جھنجھوڑتے ہوئے منیرہ چیخی۔

"کیوں نہیں۔ ایسا ہی فرماں بردار ہے نا۔ ممانی سے معافی مانگے گا۔"

"مانگو معافی —!"

"نہیں مانگتا —"

ماں کی سختی پر اس نے پٹاخ سے جواب دیا — سردار طنزیہ ہنسی۔

اور منیرہ نے پٹاخ سے ایک تھپڑ آصف کے گال پر جڑ دیا۔

سردار کے کلیجے پر ٹھنڈک پڑ گئی۔ "اس طرح سختی کرو گی تو کام بنے گا۔ ورنہ دیکھ لینا۔ کیا بنتا ہے بڑا ہو کر۔ خود سر تو ہے ہی۔ ضدی بھی جہان بھر کا ہے۔ بگڑ گیا تو سنبھالے گا نہیں۔"

وہ بڑبڑ کرتی باورچی خانے میں چلی گئی۔

منیرہ کو غصہ آیا۔ بھابی کی باتیں بری بھی لگیں اور اسی تاؤ میں دو چار اور لگانے کو ہاتھ بھی اٹھایا۔ لیکن آصف کی رونی صورت سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آج پہلی بار اس نے آصف کو یوں بے دریغ مارا تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف منیر کی شاکی نظریں چبھتی محسوس ہوئیں۔ بچے کو کھینچ کر سینے سے لگا کر وہ دیوانوں کی طرح پیار کرنے لگی۔

آٹا گوندھتے ہوئے باورچی خانہ سے سردار بولی۔ "اسی لیے تو بچہ بگڑ لیا ہے۔ ادھر آیا، ادھر پیار کر لیا۔ زمانے سے نرالی ہی ہے اس کی مامتا!"

چھوٹے چھوٹے کئی واقعات رونما پذیر ہوتے رہے۔ آصف کی شخصیت ریزہ ریزہ ہوتی رہی۔ اکثر بلا قصور ہی اسے ڈانٹ پڑتی۔ بلا وجہ ہی ماں سے طمانچے کھاتا۔ گھر کے بچے اپنا قصور اس کے سر منڈھنے سے کبھی نہ چوکتے۔

اس دن سردار کا بیٹا کہیں سے گیسی غبارے لے آیا۔ دوپہر کو جب سردار اپنے کمرے میں سستانے کو لیٹی۔ تو بچوں نے گیسی غبارے کے کھیل سے خاصہ اودھم مچایا ہوا تھا۔ آصف بھی بچہ تھا۔ گیسی غبارے کو شوق سے دیکھنے لگا۔ سعید کبھی غبارے کو اونچا چھوڑ دیتا۔ کبھی کھینچ کر ہاتھ میں پکڑ لیتا۔

"مجھے دو!" آصف بھی گیسی غبارے سے کھیلنا چاہتا تھا۔

"جا جا۔ نہیں دیتا۔" اس نے جواب دیا۔ اور آصف پرے ہٹنے کو الٹے قدم پیچھے ہوا میز پر چینی کی دو پلیٹیں پڑی تھیں۔ سعید کے پیچھے ہٹنے سے دھکا لگا۔ میز ہلی اور پلیٹیں چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔

بچے سہم کر ادھر ادھر بھاگے۔ سردار کو سستی ہوئی باہر نکلی۔

"کس نے توڑیں پلیٹیں؟" — وہ گرجی۔

"آصف نے" سعید نے بے دھڑک آصف کا نام لے دیا۔

آصف اس بہتان پر بھونچکا سا رہ گیا۔ "میں۔ میں۔" اس کی زبان ہکلا گئی۔

سردار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ آصف کو گردن سے پکڑ لیا۔ سعید اور دیگر بچے موقعہ پا کر کھسک گئے۔

"تیرا بیڑا غرق۔ تیرا ستیاناس۔ اتنی مہنگی پلیٹیں توڑ ڈالیں۔"

وہ اس کے پھول کے رخساروں پر الٹے ہاتھوں سے طمانچے لگاتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ منیرہ خورشید کے بچوں کے گندے گندے دھبوں والے کپڑے نل کے نیچے بیٹھی مل کر دھو رہی تھی۔ سردار کی آواز اور آصف کے رونے پر بھاگی بھاگی اوپر آئی۔

"میں نے نہیں توڑیں۔ سعید نے توڑی ہیں امی۔" آصف سسکتا ہوا ماں کے سینے سے لپٹ گیا۔

"تو مانے گا تھوڑا ہی۔ ایک چوری اس پر سینہ زوری۔" سردار نے غصے سے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "کیسی خوبصورت پلیٹیں تھیں۔ تجھ پر خدا کی مار۔ میرا ہی نقصان کرنا تھا۔"

ٹوٹی ہوئی پلیٹوں کی کرچیاں بکھری پڑی تھیں۔ منیرہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔

سردار نے تو آج جی کا غبار نکالنے کی قسم کھالی تھی۔ وہ وہ سنائیں۔ کہ ایک بار تو منیرہ کا دل خودکشی کر لینے کو چاہا۔

لیکن — خودکشی — وہ کیوں کر کر لیتی۔

اس کی اندھیری راہوں کی روشنی آصف کی صورت میں موجود تھی۔ اسے وقت کا انتظار تھا۔ وقت کا — جب آصف بڑا ہو کر اس کے سارے دکھ بانٹ لے گا۔

اسی لیے اس نے صبر سے کام لیا۔

خورشید نے بھی آصف پر زیادتی کی۔ تو اس نے ضبط اور حوصلے سے کام لیا۔ وہ دونوں

تو شاید اس بن مانگے بوجھ کا انتقام آصف سے یوں لے رہی تھیں۔

اس شام خورشید اپنے نوزائیدہ بچے کو لیے چارپائی پر بیٹھی تھی۔

ڈیڑھ سالہ کالا کلوٹا بندریا کا سا بچہ ہمک ہمک کر ماں کی گود میں آ رہا تھا۔ آصف بھی چارپائی پر چڑھ آیا تھا۔ نئے بچے کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ آصف بھی چارپائی پر چڑھ آیا تھا۔ نئے بچے کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ جانے اس کی کہنی لگی۔ یا اپنا توازن ہی برقرار نہ رہا۔ وہ ڈیڑھ سالہ بچہ الٹ کر فرش پر جا گرا۔

خورشید کے سامنے آصف ہی تھا۔ اس بیدردی سے اس کی گردن دبوچ کر پرے پھینکا۔ کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو گیا۔ کتنی ہی دیر اسے سانس نہ آیا۔

ساتھ والی پڑوسن آ بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے آصف کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ خورشید کو تو کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن اک یتیم پر اتنا ظلم دیکھ کر اس کا جی ضرور بھر آیا۔

وقت کا چکر اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ گھر کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

منیرہ گھر کے دھندوں میں الجھی رہی۔

اور — آصف کے ذہن میں گھر اور اس کے مکینوں سے نفرت کے جذبات پرورش پاتے رہے۔

— ۵ —

وقت کی مار پیٹ اور ڈانٹ پھٹکار سے آصف کا دل اس گھر سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ منیرہ بھی تقدیر کے ہاتھوں کٹ پتلی بنی وقت کی تار پر ناچ رہی تھی۔ کاموں میں اس طرح الجھتی۔ کہ آصف کی خبر گیری کا اسے موقع ہی نہ ملتا۔

آصف باپ کے سائے سے محروم ہو کر ماں کے لاڈ و پیار سے بھی محروم ہو رہا تھا۔ دن بھر وہ اسے کوستی رہتی۔ ہاں رات کو سینے سے لپٹا کر سوتی تھی۔ اسی لیے سارے دن میں ماں اور دوسرے گھر والوں کی شکل بھی دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ اس نے گھر سے باہر کا رخ کر لیا۔ پہلے تو وہ صرف دروازے ہی میں کھڑے ہو کر گلی میں کھیلنے والوں بچوں کو دیکھا کرتا۔ لیکن اب اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ تو جلد ہی سیلن اور بدبو والی تنگ سی گلی میں کھیلنے والے گندے مندے بچوں کا ہمجولی بن گیا اسے گلی کی فضا بڑی خوش گوار لگی۔ یہاں نہ سردار مانی کی پھٹکار تھی۔ نہ خورشید مانی کی خشم ناک نظریں اور نہ ہی گالوں کو سنسنا دینے والے ماں کے طمانچے۔

چھوٹی بڑی عمر کے کئی بچے اس کے دوست بن گئے۔ میل سے اٹے چہروں۔ بہتی ناکوں کو گندے کرتوں کے دامن سے صاف کرنے والے بچے اس کے دوست بن گئے۔ کئی ننگ دھڑنگ۔ بچے بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ آصف شکل و صورت کے لحاظ سے ان سب سے بہتر تھا۔ اور شاید لباس بھی ان سب سے اچھا پہنتا تھا۔ اسی لیے سب بچے اس سے مرعوب سے نظر آتے تھے۔ کھیل میں ہمیشہ اس کو پہل کا موقعہ دیتے۔ اس کو عزت سے بلاتے۔ مار پیٹ تو ایک طرف اسے گالی

دیتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ آصف اس اعزاز سے خود کو بڑا معتبر سمجھنے لگا۔ اپنی اہمیت کے احساس سے خوشی کے لازوال چشمے اپنے دل میں پھوٹتے محسوس کرتا۔ اہمیت جو اس گھر میں آکر وہ کھو چکا تھا اور جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے لاشعوری طور پر کئی حربے استعمال کیے تھے یوں گلی میں اسے مل گئی۔

یہ احساس اس کے لیے کتنا سکون بخش تھا۔ یہ اس کا ننھا سا دل ہی جانتا تھا۔

دس بارہ بچوں کی یہ ٹولی جن میں آصف کے آدھی درجن ماموں زاد بھائی بہنیں بھی شامل ہوتے سارا دن محلے میں اودھم مچاتے پھرتے۔ کبھی کانچ کی گولیوں سے نشانہ ہو رہی ہے تو کبھی اونچ نیچ کھیلی جا رہی ہے۔ کبھی کسی کے گھر پر دھاوا بول رکھا ہے تو کبھی نالیاں پھلانگی جا رہی ہیں۔ کبھی دوڑیں لگ رہی ہیں تو کبھی نالیوں میں پاؤں مار مار کر کیچڑ اچھالا جا رہا ہے۔

آصف کو گلیوں میں کھیلنے سے ذہنی سکون تو ملا۔ لیکن وہ غلیظ اور بے راہ رو بچوں کی عادتیں بڑی سرعت سے اپنانے لگا۔ گھر والوں سے وہ اور سرکش اور باغی ہو گیا۔ کوئی بھی اسے کچھ کہتا تو پٹاخ سے جواب دے دیتا۔ کوئی بچہ اسے چھیڑتا تو وہ ان کی ماں کی پروا کیے بغیر اس کی خوب مرمت کرتا۔ مکا بازی اور گرا کر سینے پر چڑھ جانے کے فن تو اس نے بہت اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ منیرہ نے پہلے پہل اسے باہر جانے سے روکنا چاہا۔ لیکن روک نہ سکی۔ یوں بھی اس کے گھر میں نہ ہونے سے کچھ پُرسکون سی فضا ہو جاتی اس لیے وہ بھی لاپروا ہو گئی۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔ آصف گلیوں میں کھیلتے ہوئے ہر بُری عادت اپنا رہا تھا۔ کچھ دنوں سے ان کے ٹولے میں دس بارہ سالہ رفیق بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس کا گھر پچھلی گلی میں تھا لیکن وہ اب اکثر ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ سوتیلی ماں کے تشدد سے یہ بچہ خاصا مجرم بن گیا تھا۔ چوری کی عادت بھی تھی جھوٹ بولنے کی بھی۔ مار پیٹ

میں بھی دلیر تھا۔ اس کی شخصیت بھی نامساعد حالات نے پیش کر رکھ دی تھی۔

وہ آئے دن کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتا اور بچوں پر اپنی برتری کا رعب جماتا۔ یہ چیزیں وہ کہاں سے لاتا تھا۔ بچوں کے ذہنوں کی اس تک رسائی تو نہ تھی۔ ہاں وہ اس کی چیزوں کو لالچ بھری نظروں سے دیکھتے ضرور رہتے۔

اس دن وہ منہ سے بجانے والا قیمتی سا باجہ لے آیا۔ بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور وہ کوئی ٹوٹی پھوٹی فلمی دھن باجے پر بجا بجا کر بچوں کے شوق و تجسس کی حس کو جگانے لگا۔

"مجھے دو۔۔۔" آصف نے بڑی عاجزی سے باجہ مانگا۔ اسے کچھ کچھ یاد تھا۔ کہ ایسا ہی باجہ ایک دفعہ اس کے ابو بھی اس کے لیے لائے تھے۔

"سونہہ۔ پرے ہٹو۔" رفیق نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پرے دھکیلا اور بچوں کے گھیرے میں سینہ تانے پھر باجہ بجانے لگا۔

"تھوڑی دیر کو دے دو!" آصف پھر منمنایا۔

"پیسے نکالو۔ تو لے لو۔"

"پیسے؟"

"ہاں۔ ایسا روپیہ لاؤ۔" اس نے چاندی کا گول سا چمکتا ہوا روپیہ ملیشیئے کے میلے سے پاجامے کی جیب سے نکال کر آصف کو دکھایا۔

آصف کا دل للچا رہا تھا۔ لیکن یہ گول سا روپیہ اس کے پاس کہاں تھا۔

"تم نے کہاں سے لیا باجہ؟"

"کیوں جی۔۔۔ ہمارا اپنا ہے۔"

"مجھے بھی لے دو۔"

"روپیہ لاؤ۔ اور لے لو۔"

"اچھا تم ٹھہرو۔ میں امّی سے روپیہ لے کر آتا ہوں۔"

"نہ۔ نہ۔" رفیق نے اسے واپس بلا لیا۔

"کیوں؟"

"اس وقت نہیں۔ کل روپیہ لے کر آنا۔ اس بجلی کے کھمبے کے نیچے سمجھے!"

"اچھا۔"

"وہ باجہ بجاتا چل دیا۔ بچے چند لمحے اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئے۔

آصف کے ذہن میں باجے کی دُھن گونج رہی تھی۔ کھیل میں اس کا دل نہ لگا۔ وہ گھر آ گیا۔ نیچے امّی کو ڈھونڈا۔ وہ نہ ملی۔ تو اوپر گیا۔ وہ سل پر مصالحہ پیس رہی تھی۔

"امّی!" وہ اس کے کندھے پر پیار سے جھول گیا۔

"ہوں۔" ایک روپیہ دو امّی۔"

"ہیں!" ــــ "دو نا!"

"کیا؟"

"ایک روپیہ۔"

"کیا کرو گے؟"

"باجہ لوں گا۔"

"کیسا باجہ؟"

ماں کو جواب دینے کی بجائے وہ سردار مہانی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو اپنے بیٹے سے سودا منگوانے کے بعد باقی پیسے وصول کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے تین چمکتے روپے دیکھ کر اس نے ماں کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے گھما کر سردار مہانی کی طرف کر کے کہا۔

"ایسا روپیہ امّی!"

منیرہ اس کی معصوم سی حرکت پر ہنس دی۔ اسے کیا خبر تھی۔ کہ روپے کی مانگ کے پس پردہ آصف کی کتنی شدید خواہش مچل رہی ہے۔

"کیا کرو گے روپے کو؟"

"باجہ لوں گا۔" ــــ "باجہ"!

"ہاں امّی! رفیق کے پاس ہے نا باجہ ــــ ابّو بھی لائے تھے نا۔" اچانک اسے یاد آ گیا۔

منیرہ کی آنکھوں میں پچھلے سال کا وہ واقعہ گھوم گیا۔ جب آصف کے لیے منیرہ باجہ لایا تھا۔ باجہ بجانے کے لیے آصف کو کس کس طرح اس نے تربیت دی تھی۔ ہنسی مذاق اور خوشی کے بھرپور جذبے اُمنڈ اُمنڈ کر اس کے زخموں کو کھرچنے لگے۔

"ہٹو بیٹے!" اس نے مصالحہ مٹی کی پیالی میں ڈال کر سل دھوئی۔

"دو نا روپیہ۔ باجہ لوں گا۔"

"اچھے بچے ایسی چیزیں نہیں لیتے۔"

"کیوں نہیں لیتے؟"

"ضد نہ کرو آصف۔ پیٹوں گی تمہیں۔"

آصف پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا لیکن روپے کی ضد نہ چھوڑی۔ لاچار ہو کر منیرہ نے اس کی کمر میں گھونسا دیا۔ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ روتا ہوا وہ گیلری کی طرف چلا گیا اور منیرہ ہانڈی پکانے کے دھندے میں لگ گئی۔

"باجہ لوں گا۔ باجہ لوں گا۔" رات سوتے میں بھی وہ سسک رہا تھا۔

منیرہ اس کے گالوں سے گال رگڑتے ہوئے پیار کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سوتے تو اب شاید خشک ہو چکے تھے۔ اس رات وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی ــــ اسے منیر یاد آ رہا تھا۔

منیر ــــ جس کے سامنے آصف کو مارنا تو ایک طرف اونچی آواز سے ڈانٹنا

بھی مشکل تھا۔ آصف باجے کے لیے ضد کرے اور منیر اسے بہانہ کر دے۔ لیکن
حالات وہ کس طرح مجبور رکھی۔

آصف صبح اٹھا۔ تو اس کے ذہن میں باجہ حاصل کرنے کی دھن تھی۔ منیرہ اٹھ
جا چکی تھی۔ وہ کافی دیر تک باجے کے تصور میں آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔

اور — عین اسی وقت گلی سے رفیقہ باجہ بجاتے ہوئے گزرا۔ آتش شوق
ور بھڑک اٹھی۔ وہ بستر سے نکل کر ماں کے پاس جا بیٹھا۔ جو باورچی خانے میں
لے بچوں کو گھی لگی روٹیاں پکا پکا کر دے رہی تھی۔

"میں وہی کھاؤں گا" چھوٹا بچہ ضد کرنے لگا۔

"سعید جاؤ۔ پاؤ بھر دہی لے آؤ۔" سردار نے کہا۔

"پیسے دو امی۔"

"وہ سامنے کارنس پر پڑے ہیں پیالی میں۔ تین روپے ہیں۔ ایک لے جاؤ۔
رہاں اچھا میٹھا سا دہی لانا۔ اور باقی پیسے بھی احتیاط سے۔"

سعید نے سامنے چولھے کے اوپر والی کارنس پر پڑی پیالی سے روپیہ نکالا۔
"چمکتا ہوا چاندی کا روپیہ!" جیسا رفیق نے آصف کو دکھایا تھا۔

"ایک لیا ہے امی۔ دو وہیں پڑے ہیں!"

"اچھا۔"

سعید برتن لے کر دہی لینے چل دیا۔ اور آصف اس پیالی کو غور سے دیکھتا رہا
ں میں اب بھی دو چاندی کے روپے پڑے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر سعید سکول چلا گیا۔ چھوٹے دونوں بچے کھیلنے لگے
ار کمرے میں کل کے دھوئے کپڑے تہہ کرنے لگی اور منیرہ صحن میں کونے والے
کے نیچے برتن مانجھنے لگی۔

آج آصف حسب معمول ناشتہ کر کے باہر نہیں گیا۔

وہ کبھی باورچی خانے میں جاتا۔ کبھی صحن میں نکل آتا۔

منیرہ نے اس کی اضطرابی حرکت پر کوئی غور نہیں کیا۔ وہ برتن مانجھتے ہوئے اپنے ہی
خیالات پریشان سے الجھ رہی تھی۔

آصف نظر بچا کر باورچی خانے میں گھسا۔ کونے میں رکھے آٹے کے کنستر پر چڑھا۔
اچک کر کارنس پر رکھی چینی کی پیالی اٹھائی۔ جس میں دو روپے چمک رہے تھے۔ ایک
روپیہ نکال کر پیالی وہیں واپس رکھ دی۔ دبے پاؤں کنستر سے اترا اور نظر بچا کر سیڑھیاں
اتر گیا۔ وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس کھمبے کے نیچے پہنچا۔ جہاں رفیقے نے باجہ
دینے کے لیے کہا تھا۔

روپیہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اس نے باجہ اسے تھما دیا۔ اور خود دوسرے ہی
لمحے وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ انجام و عواقب سے بے خبر آصف گال پھلائے پورا زور لگا کر باجہ
بجانے لگا۔ سامنے والے گھر کے دونوں بچے دوڑے آئے اور اس کے باجے کو
للچائی نظروں سے دیکھنے لگے۔

آصف سینہ تانے باجہ بجاتا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ بچے حشرات الارض کی طرح
اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ سبھی باجے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے
ان کی حسرت آصف کی مسرت بن رہی تھی۔

دوپہر تک وہ گلی ہی میں بچوں کے ساتھ رہا۔ زیادہ وقت وہ باجہ ہی بجاتا رہا۔
کھانا کھانے کے لیے وہ گھر آیا تو باجہ اس کے ہونٹوں سے لگا تھا۔ صحن میں جتنے
بچے تھے۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ فخریہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے باجہ
بجاتا رہا۔ لجاجت سے بچوں نے اس سے ذرا کی ذرا باجہ مانگا بھی لیکن اس نے دینے
سے انکار کر دیا۔

پوں پوں کرتا وہ اوپر چلا گیا۔ اوپر — جہاں سردار ایک روپیہ گم ہو جانے پر صبح سے شور مچا رہی تھی۔ بچوں کو ڈانٹ چکی تھی۔ باورچی خانے کے سارے برتن الٹ پلٹ کر دیکھ چکی تھی۔ پیڑھیاں اور چوکیاں ہٹا کر باورچی خانے میں روپیہ ڈھونڈا تھا۔ آدھی چھٹی سعید گھر آیا تو اس کے سر بھی ہو چکی تھی۔

لیکن روپیہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ منیرہ کا ماتھا ٹھنکا تو تھا لیکن آصف کی اتنی بڑی جرأت کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

جب آصف اوپر آیا وہ باورچی خانے میں روٹیاں پکا رہی تھی اور سردار صحن میں بیٹھی ساتھ والی ہمسائی سے روپیہ گم ہونے کا قصہ دہرا رہی تھی۔

آصف کچا چور تھا اور پھر چوری بھی اس نے چوری کی نیت سے تھوڑا ہی کی تھی۔ اک خواہش دل میں مچلی تھی اس نے پوری کر لی تھی۔ باجرہ منہ سے لگائے جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوا تو منیرہ کو جیسے بچھو نے ڈس لیا۔

آصف کی کل والی روپے کی صدا — باجرہ — اور سردار کا گم شدہ روپیہ سب ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ دکھ، صدمہ اور ندامت کے احساسات سے وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔

ہاتھ میں چمٹا لیے اٹھی۔ آصف سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کہاں سے لیا باجرہ؟" وہ گرجی۔

"رفیقے سے۔"

"روپیہ کہاں سے لیا تھا؟"

"پیالی سے۔"

آصف کانپتے ہوئے بولا۔ منیرہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور طمانچوں سے اس کا منہ لال کر دیا۔

"اچھا تو یہ صاحب زادے لے اڑے تھے روپیہ۔" سردار بل کھا کر بولی۔ "کیسا فتنہ ہے یہ بچہ — آنکھوں میں دھول ڈال کر لے اڑا روپیہ۔ میں بھی کہوں جا کہاں سکتا تھا۔ اپنے بچوں نے تو کبھی پیسہ ادھر سے اُدھر نہیں کیا۔ ایمان کی کہوں تو نیچے والوں کی بھی یہ عادت نہیں۔ لاکھ شرارتی ہیں چور نہیں۔ توبہ۔ یا اللہ توبہ!"

منیرہ غصے اور صدمے سے نڈھال پہلے ہی ہو رہی تھی۔ سردار کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

اس نے آصف کی چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ چمٹوں سے اس کے ہاتھوں پر نیل ڈال دیئے۔ بے دم سا ہو کر وہ فرش پر گر پڑا۔ منیرہ نے لاتوں اور گھونسوں سے اسے رگید ڈالا۔ لاکھوں بد دعائیں دے ڈالیں لیکن اس کا غصہ فرو نہ ہوا۔

"دیوانی ہو گئی ہو۔" بی ہمسائی نے اسے زبردستی ایک طرف دھکیل دیا۔ "مار ہی ڈالو گی بچے کو۔!"

منیرہ واقعی اس کے فعل سے دیوانی ہو گئی تھی۔ اسے اپنا دل دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو نہ دیتی۔ تو شاید اس کا سینہ پھٹ جاتا۔

"سکول داخل کیوں نہیں کرواتیں؟" صدر بھائی نے آصف کی کارگزاریوں کی داستان سننے کے بعد تشویش بھرے انداز میں منیرہ سے کہا۔

"کروا دیں۔" وہ آہستگی سے یوں بولی جیسے یہ بار بھائی کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔

خورشید پیڑھی پر بیٹھی توے پر روٹیاں ڈال رہی تھی۔ بچے گھیرا ڈالے اس کے گرد بیٹھے کالی کالی چائے مٹی کے پیالوں میں بھرے سوکھی روٹیوں کے ساتھ پی رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر صدرالدین حقے کی نے تھامے متفکر سا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چنگیر میں گھی والی روٹی اور رات کا باسی سالن رکھا تھا۔ چائے کا پیالہ ٹھنڈا ہونے کو اس نے چارپائی کے نیچے فرش پر رکھ دیا تھا۔

"کتنی عمر ہے اس کی؟" اس نے منیرہ سے پوچھا۔ جو آصف کو ساتھ لیے دالان کے دروازے کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔

"چھ سال کا ہو رہا ہے۔" وہ بچے کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ کل تم اسے تیار رکھنا۔ میں سکول داخل کروا دوں گا۔ اپنے بخشور اجو بھی تو جاتے ہیں۔ انہی کے ساتھ چلا جایا کرے گا۔"

"اچھا جی۔"

آصف ماں کے برابر بیٹھا تھا۔ ماموں کی باتوں سے زیادہ اس کا دھیان اس پراٹھے کی طرف تھا جو ماموں کے سامنے پڑا تھا۔

اور جب خورشید نے تھالی میں سوکھی روٹی اور چائے کا مٹی کا روغنی پیالہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ بگڑ گیا۔

"پراٹھا لوں گا۔"

"آصف — امنیرہ عاجز آ گئی تھی اس کی ضدوں سے۔

"پراٹھا لوں گا۔" وہ منمنایا۔

منیرہ نے اشارہ کنایہ سے منع کرنا چاہا لیکن توبہ! آصف اور اشارہ سمجھ جائے اس نے لات ماری اور چائے کا پیالہ الٹا دیا۔ چائے صحن کے گندے فرش پر بہنے لگی۔

منیرہ نے اس کا کان مروڑ کر بددعا دی — اور خورشید نے آنکھوں کے اشارے سے شوہر کو جتلا دیا۔ کہ دیکھ لو۔ اس کے یہ ہیں کرتوت۔ کان کو سہلاتے ہوئے وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اب تو مار پھٹکار اس پر کچھ اثر ہی نہ کرتی تھی۔

"لگا دو تھوڑا سا گھی اسے بھی۔" منیرہ جلدی سے بولی۔ "یہ کم بخت ضدی ہو گیا ہے۔"

"شہر پا کر شیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو اس کی عادتیں بگڑ رہی ہیں۔" خورشید نے تقدیر۔

لیکن آصف بھی ضد کا پکا تھا۔ رُوں رُوں کیے گیا اور جب تک پراٹھا نہ پکوا لیا۔ اپنی ضد نہ چھوڑی۔

آصف دن بدن بگڑتا جا رہا تھا۔ مار کھا لیتا۔ پھٹکار سہہ لیتا۔ لیکن کرتا وہی جو اس کے من میں آتی۔

اسی محلے کے پرائمری سکول میں دوسرے دن آصف کو داخل کروا دیا گیا۔

پرائمری سکول۔ جہاں تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ مفت کی بیگار والا معاملہ تھا۔ نہ استادوں کو بچوں میں دلچسپی تھی۔ نہ بچوں کو پڑھائی میں۔ کچھ طالب علم ایسے ضرور تھے جو علم کی پیاس بجھانے یہاں آتے تھے۔ محنت اور لگن سے پڑھتے تھے۔ لیکن اکثریت ان بچوں کی تھی جن کے ماں باپ محض ان کی شرارتوں سے چھٹکارا پانے کو یہاں بھیج دیتے تھے۔

تین کمروں اور بند بند صحن والی عمارت میں گندی گندی چٹائیوں پر میلے کچیلے بچے پھٹے پرانے قاعدے اور کالی سیاہی سے لت پت تختیاں لیے بیٹھے رہتے۔ آصف کا دل اس جگہ بالکل ہی نہ لگا۔ استاد کی نظر بچا کر وہ کئی دفعہ سکول سے بھاگ نکلا لیکن رفتہ رفتہ کچھ ماسٹر جی کے ڈنڈے کا خوف، کچھ گھر والوں کا۔ وہ باقاعدگی سے سکول جانے لگا لیکن پڑھائی سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چند مریل اور غبی قسم کے بچوں کو دوست بنا لیا۔ جو اس کے صحت مند جسم اور نسبتاً صاف ستھرے کپڑوں سے مرعوب تھے۔

آصف قدرتی طور پر ذہین بچہ تھا لیکن اس کی ذہانت کو افادی پہلوؤں پر موڑنے کا کسی نے تردد نہ کیا۔ نتیجۃً اس کا یہ قیمتی سرمایہ شرارتیں کرنے، چھابڑی والوں کی چیزیں اڑانے اور خواہ مخواہ کی لڑائیاں مول لینے میں ضائع ہونے لگا۔

آدھی چھٹی کے وقفے میں سکول کے سامنے بچے باہر نکل جاتے گرم گرم مصالحے چنے والا اپنی چھابڑی نالی کے کنارے لیے بیٹھا ہوتا۔ گڑ کا حلوہ لیے دوسرا چھابڑی والا اس کے دائیں ہاتھ ہوتا۔ سامنے کبابوں والا سیخی تکے بنا رہا ہوتا۔ کھٹا مٹھا چورن بیچنے والا بھی سڑک کے پار دیوار کے سایے میں بیٹھا رہتا۔ دو ایک ٹھیلے والے پھل وغیرہ بھی لے آتے۔ بچے گھروں سے پیسے لے کر آتے۔ اور اپنی من پسند چیزیں لے لے کر کھاتے۔ چھابڑی والوں پر پل پڑتے۔ ہر کوئی پہل کرنا چاہتا۔ شور ہنگامہ بپا ہوتا۔ آصف بھی ان بچوں میں شامل ہوتا۔ پیسہ دو پیسہ جو گھر سے ملتے تھے کرارے مرچوں والے چنے یا چٹ پٹے کباب کھا لیتا۔ لیکن اس سے اس کی سیری نہ ہوتی۔ اس کا جی پھل کھانے کو بھی چاہتا۔ سامنے والے شیرفروش سے برفی اور کھویا لینے کو بھی دل کرتا۔ میٹھا چورن کھانے کی بھی خواہش ہوتی۔

اس دن ٹھیلے والے کے پاس بڑا تازہ پھل تھا۔ چمکتے سیب رس بھرے لال لال مالٹے، پیلے پیلے کیلے۔ آصف کو کیلا بے حد پسند تھا۔ لیکن ایک پیسے میں

کیلا ملا نہیں کیلے کی خواہش دب کر رہ گئی۔ وہ حسرت بھری نظروں سے سڑک کے پار کھڑے ٹھیلے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک دس بارہ سالہ لڑکا گیند اچھالتا ادھر پہنچا۔ ٹھیلے کے نیچے گیند چلی گئی۔ وہ جھکا اور گیند اٹھانے کے ساتھ ہی نیچے سے ہاتھ ڈال کر ایک کیلا توڑ لیا۔ ریڑھی والا دوسرے گاہک بچوں سے نپٹ رہا تھا۔ لڑکا کیلا لے کر رفوچکر ہو گیا۔

آصف کیلا پانے کی خواہش کو روک نہ سکا اور اس لڑکے ہی کی طرح یہ نیا تجربہ کرنے کا سوچ کر سڑک پر پڑے گول سے پتھر کو ٹھوکریں لگاتا ٹھیلے تک جا پہنچا۔ اس پر گھبراہٹ بھی طاری تھی لیکن دل میں شدید خواہش بھی مچل رہی تھی۔ پتھر اٹھانے کے لیے جھکنے کا بہانہ کر کے اس نے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر زور سے کیلا کھینچا۔

لیکن — اُف — ایک کیلا نہیں پورا ڈال کا ڈال ہی الٹ کر اس پر آ رہا۔

ہڑبڑا کر ٹھیلے والا ادھر لپکا۔ آصف تھر تھر کانپ رہا تھا۔ توڑا ہوا کیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ "اچھا تو ہی روز اڑاتا ہے میرے کیلے" چھابڑی والے نے اسے کان سے پکڑ لیا۔

"نہیں۔ نہیں۔" آصف نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

لیکن چھابڑی فروش شمسو کبابوں والے کو ریڑھی کا دھیان رکھنے کا کہہ کر اسے گھسیٹتا ہوا ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گیا۔ بچے اس کے گرد جلوس کی صورت میں جمع ہو کر چلا رہے تھے۔ "آصف چور۔ کیلا چور۔ چور۔ چور!"

اچھا خاصہ ہنگامہ بپا ہوا۔ ٹھیلے والے نے وہ وہ سنائیں کہ خدا کی پناہ۔ آصف مرمت ہوئی۔ ماسٹر صاحب نے گھر پر شکایت بھیجی۔ شامت ہی شامت آ گئی۔ گھر سے متنفر تو وہ پہلے ہی تھا۔ اب سکول سے بھی جی اچاٹ ہو گیا۔ جو جو بچے اس کی پٹائی پر ہنسے تھے۔ وہ ان کا دشمن بن گیا۔

منیرہ بچاری جو حال کی تباہ کن تلخیوں سے بچانہ کرنے کی کوشش اس امید پر کیے جا رہی تھی۔ کہ کبھی تو آصف بڑا ہو کر اس کے دکھ بانٹ لے گا۔ اس واقعے سے نا امید اور دل گرفتہ ہو گئی۔ آصف کے سدھرنے کا اسے کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

اس عمر میں بیاہ رچاتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے آفتاب۔"

عمر کا تو خیر سوال نہیں۔ تم سے بوڑھے بوڑھے شادی کرتے دیکھے ہیں، تم تو بھی پچاس کے بھی نہیں ہوئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہیں لیکن دو لڑکیاں شادی شدہ ہیں۔ وہ کیا سوچیں گی۔"

"تم شادی ضرور تا کروگے۔ عیاشی کے لیے نہیں۔ آخر ثمینہ بیچاری کب تک اپنا گھر چھوڑے تمہارے ہاں پڑی رہے گی۔ اپنا نہیں تو عامر ہی کا خیال کرو۔"

"کاش سلمیٰ چند سال اور زندہ رہتی۔ کم از کم عامر تو۔"

"اللہ کی رضا پر بندہ راضی۔ اپنی طرف سے تم لوگوں نے کونسی کسر چھوڑی۔ بھابی بیچاری کی زندگی اتنی ہی تھی۔"

موت بڑی ظالم شے ہے۔"

"واقعی ــــ

مجید کی عمر پینتالیس پچاس کے بین بین تھی۔ شہر میں دوائیوں کی دکان تھی۔ آمدنی معقول تھی۔ دو بڑی لڑکیاں سلمیٰ کی زندگی ہی میں بیاہ دی گئی۔ عامر اس وقت تقریباً پانچ سال کا تھا۔ تین لڑکوں کے یکے بعد دیگرے فوت ہو جانے کے بعد یہی بچا تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر بہنوں، ماں اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھا لیکن بیچارہ بچہ بمشکل زندگی کی چار بہاریں ہی دیکھ پایا تھا۔ کہ ماں بیمار پڑ گئی۔ مجید نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ خدمت گزاری کی۔ دعائیں مانگیں لیکن اجل کا پنجہ سلمیٰ کو اچک کر لے ہی گیا۔

اب چھ ماہ سے چھوٹی لڑکی ثمینہ باپ کا گھر سنبھالے تھی۔ عامر اس کے ساتھ بہت گھل مل گیا تھا۔ اس کا شوہر اور سسرال والے کئی بار اسے لینے کو آ چکے تھے۔ مجید پریشان تھا۔ کر کیا کرے۔

صورتِ حال کے پیشِ نظر دوسری شادی اشد ضروری تھی۔ آفتاب اس کا دوست اسے ہمیشہ یہی مشورہ دیتا تھا۔ کہ وہ گھر آباد کرے۔ لیکن کچھ تو بیاہی بیٹیوں سے جھجک کچھ عامر کے سوتیلی ماں سے واسطے کا خیال، وہ کترا رہا تھا۔

آفتاب منیرہ کا دور پار کا رشتہ دار تھا۔ منیرہ کی جوانی اور اس کے گھریلو حالات سے بڑا متاثر تھا۔ مجید کو بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے کوشاں تھا۔ کہ یہ رشتہ طے ہو جائے اس سلسلے میں وہ صدرالدین سے پوری بات کر کے اسے رضامند کر چکا تھا۔

"عامر کو ماں کی ضرورت ہے مجید۔"

"یہ اس کی بدنصیبی ہے کہ اس کی ماں اس سے چھن گئی۔"

"دوسری ماں لے آؤ۔"

"دوسری ماں اپنی ماں کا بدل کہاں ہو گی آفتاب، کبھی سنا نہیں دیکھا نہیں اور جو کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اس کا تجربہ کرنے سے دل ہول کھاتا ہے۔"

"تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو گے تو لگ کی کوئی بات نہیں۔ اور پھر جس عورت سے میں تمہارا رشتہ طے کروانا چاہتا ہوں وہ ایسی نہیں دوسرے اس کا اپنا بھی بچہ ہے۔ قدرتی طور پر وہ تم سے دبی رہے گی اور یقیناً تمہارے بچے کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں کرے گی۔ اسے اپنے بچے کا بھی تو ڈر ہو گا۔"

"بات تو ٹھیک کہتے ہو ــــ"

"اچھی طرح سوچ لو ــــ باقی رہا بیاہی لڑکیوں کا سوال۔ تو وہ خود یہی چاہتی ہیں آخر وہ بھی تو بچی نہیں ہیں۔ بھرا پرا گھر اور معصوم بچہ نوکروں پر تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

خود وہ کب تک تمہارے گھر کی ذمہ داری اٹھائے رہیں گی۔"

مجید سوچ میں پڑ گیا — اور — پھر — کئی دنوں کی مسلسل سوچ کے بعد اس نے آخری فیصلہ کر ہی لیا اسے ہر لحاظ سے موزوں نظر آئی۔ واقعی وہ اپنے بچے کی خاطر عامر سے بھی اچھا سلوک کرے گی۔ اور پھر جب وہ اپنی آنکھیں خود کھلی رکھ کا تو ڈر کاہے کا۔ عورت ہی ہے ناڈائن تو نہیں جو اس کے بچے کو نگل جائے گی۔

منیرہ کو جب نئی صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ پتھرا سی گئی۔ ایسا تو اس نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔

وہ کئی دن آصف کو لپٹا لپٹا کر روتی رہی۔ منیر اس کا محبوب منیر جس کی یاد اس کے ذہن کا مستقل حصہ بن چکی تھی۔ اس سے یوں چھٹ جائے گا۔ اسے کبھی وہم بھی نہ آیا تھا لیکن — جب — بھائیوں نے ملائمت سے سمجھایا۔ بھابیوں نے اونچ نیچ دکھائی۔ آصف کے مستقبل کا واسطہ دیا۔ تو وہ دل پر پتھر رکھ کر یہ کڑوا گھونٹ پینے پر آمادہ ہو گئی۔ یوں بھی بیوگی کے بعد بھائیوں کے در پر پڑے رہنے کا تجربہ کون سا خوش گوار تھا۔ ہیجانی کیفیت جب مغلوب ہوتی تو ٹھنڈے دل سے سوچ کر وہ بھی نکاح ثانی پر رضامند ہو گئی۔

دن مقرر کر دیا گیا — اور — پھر — خاندان کے چند بزرگوں کی موجودگی میں بڑی خاموشی سے منیرہ کا نکاح مجید کے ساتھ کر دیا گیا۔

آصف ان حالات سے قطعاً بے خبر تھا۔ ہاں اس دن گھر میں بہت سے لوگوں کی وجہ سے خاصی چہل پہل تھی۔ امی نے نئے کپڑے اور سونے کے زیور بھی پہنے۔ وہ اس دن اسے معمول سے بہت اچھی لگی۔ وہ بھی تو اسے بار بار لپٹا کر پیار کر رہی تھی۔

گھر والوں کا رویہ بھی اس سے ایک دم ہی بدل گیا۔ خالہ، ماموں اور خاندان کے دوسرے افراد اس کو بار بار پیار کر کے چمکار رہے تھے۔ گو سب کا پیار اندوگی

کا پہلو لیے ہوئے تھا۔ تاہم پیار سے ترسے ہوئے آصف کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس کا چھوٹا سا ذہن جذبے کی شدت ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے محرکات کا اسے کیا علم ہوتا۔

دالان میں ایک کونے والی چارپائی پر منیرہ دوچار، سائیوں اور بھابیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ آصف اس دن بے حد خوش تھا۔ وہ دالان ہی میں کھیل رہا تھا۔

"اب تیاری کرو۔" صدرالدین نے صحن سے سردار کو آواز دے کر کہا۔

"اچھا جی۔" وہ جلدی جلدی لیڈی ہملٹن کا کالا برقعہ لے کر منیرہ کو اوڑھانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو امی؟" آصف شوق اور تجسس سے ماں کو دیکھنے لگا۔

"تمہارے ابو کے پاس۔" خورشید نے ہنس کر کہا۔

"ابو۔ ابو کے پاس!" آصف جیسے کچھ نہیں سمجھا۔ منیرہ نے جھک کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور شدت سے پیار کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔

ماں کا برقعہ پکڑے ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی صحن میں آ گیا۔

صدرالدین کے ساتھ مجید بھی سیاہ شیروانی پہنے صحن میں کھڑا تھا۔ وہ سفید ریش بزرگ بھی سر سنجیدگی سے جھکائے اس کے پاس ہی آ کھڑے ہوئے۔

صدرالدین نے جھکی جھکی منیرہ کو بازوؤں سے تھام کر مجید کے پہلو میں کھڑا کر دیا۔ اور گلوگیر آواز میں بولا۔

"خدا کے بعد منیرہ آپ کے حوالے ہے۔"

"بیٹیاں داماد وں کے نہیں تقدیر کے حوالے کی جاتی ہیں صدرالدین!" سفید ریش بزرگ نے صدرالدین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رقت سے کہا۔

منیرہ رو پڑی اور گرد کھڑے رشتہ داروں کی آنکھیں بھی نم آلود ہو گئیں۔

آصف ایک تماشائی کی طرح بڑوں کی ٹانگوں سے لپٹا اپنی جگہ بنا کر مجید اور

منیرہ کے سامنے کھڑا تھا۔ مجید اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ اس کی امّی کے ساتھ جُڑ کر جو کھڑا تھا۔

پھر دعائے خیر کے کلمات کے درمیان منیرہ رخصت ہوئی۔ مجید کے ساتھ ساتھ گلی وہ تنگ گلی طے کر کے سڑک پر کھڑے تانگے تک آئی۔ بڑوں اور بچوں کا جلوس ساتھ تھا۔

مجید نے سہارا دے کر اسے تانگے پر بٹھایا اور خود مردوں سے ہاتھ ملانے کے بعد اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ تانگہ چل پڑا۔

"امّی ــــ!" چیختا ہوا آصف تانگے کے پیچھے بھاگا۔ بدرالدین نے لپک کر اسے پکڑ نہ لیا ہوتا تو پیچھے سے آنے والی موٹر کے نیچے وہ کچلا گیا ہوتا۔

"امّی کے پاس جاؤں گا۔" وہ مچل اٹھا۔

بدرالدین اسے سامنے پھل والی دکان پر لے گیا۔ بہت سی چیزیں لے کر دیں۔ پھر لکڑی کی گیند بھی لے دی۔ آصف جلد ہی بہل گیا۔

ہاں رات جب اسے جھلنگا سی چارپائی پر اکیلا سونا پڑا تو وہ بری طرح چیخ اٹھا وہ تو ماں کی چھاتی سے لپٹ کر سونے کا عادی تھا۔ اکیلے اسے نیند آتی بھی کیسے؟

سردار نے ڈرا دھمکا کر اسے سلا تو دیا۔ لیکن نفرت کا ٹھنڈا ٹھنڈا احساس اس کے ذہن میں جم کر رہ گیا۔ نفرت ــــ! مجید سے نفرت ــــ جو اس کی امّی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا تیسرے دن منیرہ واپس آئی تو آصف اس سے کھنچا کھنچا تھا۔ اس نے اسے پیار کرنا چاہا تو وہ روٹھ کر ایک طرف ہو گیا

"اپنے نئے ابّو کو سلام کرو ــــ!" خورشید نے روٹھے روٹھے آصف کا کندھا پکڑ کر اس کا منہ مجید کی طرف کر دیا۔

"یہ ابّو نہیں ہے۔" وہ پٹاخ سے بولا ــــ سب اس کی بے ساختگی پر ہنس دیے۔ ہاں منیرہ کا دل ڈول گیا۔ کہیں شروع ہی سے آصف اپنی ہٹ دھرمی اور خود سری کی وجہ سے مجید کی نظروں سے نہ اتر جائے۔ اسے یہ بھی تو خدشہ تھا نا؟

کو سلام کرو عامر" ثمینہ نے پانچ سالہ عامر کو منیرہ کے قریب لاتے "امّی ہوئے کہا۔ دبلا پتلا سفید رنگ اور سیاہ بالوں والا بچہ منیرہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بہن سے چمٹ گیا۔

"شرماتے نہیں۔ بُری بات۔" ثمینہ نے پھر اسے منیرہ کی طرف پیار سے دھکیلا۔ صاف ستھرا شگفتہ سا بچہ جھجک کر پھر پیچھے ہٹ گیا۔

منیرہ نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ عامر جھجکا۔

بڑی بہن آمینہ نے پیار سے چمکارا۔ مجید نے سر پر ہاتھ پھیر کر ہمت دلائی۔

"شاباش عامی ــــ سلام کر دیجئے۔"

"بہت اچھے ہیں عامر ــــ"

"گلے نہیں ملیں گے امّی کے؟"

"میں نے کہا تھا نا امّی ہسپتال سے آجائیں گی۔ دیکھ لو آگئیں۔ کتنی اچھی ہیں۔ بہت پیار کریں گی آپ کو ــــ"

ثمینہ نے جانے سے پہلے بھی کتنی باتیں بنا بنا کر عامر کو نئی امّی قبول کرنے پر ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اب جو ذرا سی جھجک تھی وہ بھی ان حوصلہ افزا باتوں سے مٹ رہی تھی۔

"آؤ بیٹے ــــ" جب منیرہ نے شفقت بھرے لہجے میں ہاتھ پھیلا کر کہا ــــ تو بجلی کا ٹھٹکتا عامر لجا کر اس کے بازوؤں میں آگیا۔

منیرہ نے اسے گود میں بٹھا کر خوب خوب پیار کیا۔ جانے پیار کا اظہار مجید کو مرعوب

کرنے کے لیے تھا یا عامر کی شخصیت ہی اس قابل تھی۔ جو کچھ بھی تھا۔ اس کے اس وا
پُرخلوص پیار سے باپ بیٹیاں بے حد متاثر ہوئے۔

یوں بھی مجید نے شادی کے پہلے دن ہی اپنی شادی کا مقصد واضح الفاظ میں مز
کو بتا دیا تھا۔ عامر نازونعم کا پروردہ تھا۔ بہنوں کے دل کا سرور اور باپ کی آنکھوں کا
تھا۔ مجید نے منیرہ کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس آگہی تنبیہہ کا پہلو بھی تھا
بچی نہ تھی۔ سب کچھ سمجھ گئی تھی اور پھر اپنے بچے کی خاطر بھی تو عامر سے مناسب سلوک کر

مجید کے نکاح کے پندرھویں دن ثمینہ عامر کو یہاں لائی تھی۔ دانستہ ایک ہفتہ آ
نے بھائی کو اپنے پاس رکھا تھا۔ اس عرصے میں وہ بھائی کو نئی امّی قبول کرنے کے لیے
ذہنی طور پر تیار کرتی رہی تھی۔

"آپ اتنے دنوں سے کہاں تھے عامی۔ میں آپ کو گھر میں ڈھونڈتی پھری؟" منیرہ
نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

"باجی کے ساتھ گیا تھا۔" عامر شرما شرما کر بولا۔

"اب تو نہیں جائیں گے نا؟" پیار سے پوچھا گیا۔

"نہیں۔" عامر نے بے ساختگی سے سر نفی میں ہلا دیا۔

"اچھا۔ اتنی جلدی نگاہیں پھیر لیں۔" ثمینہ نے پیار سے ڈانٹا۔ "بے ایمان!"
عامر منیرہ سے لپٹ گیا۔ منیرہ نے یوں دیکھا۔ جیسے کلیجے میں چھپا لینے کا عزم کر چکی ہو
سب ہنسنے لگے۔

"بھئی! اب ان کی امّی آ گئی ہیں۔ اپنے گھر میں رہیں گے۔" مجید بولا۔

"امّی کے ساتھ ایک بھائی بھی آئے ہیں۔" آمینہ نے کہا۔

"آصف کہاں ہیں؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"کون آصف باجی ——؟" عامر نے شوق و تجسس سے کہا۔

"آپ کے نئے بھائی۔"

"سچ۔"

"ہاں۔"

"کہاں ہیں؟"

"اوپر کھیل رہے ہیں۔" منیرہ نے کہا۔

"میں جاؤں اوپر۔" وہ گود سے اترنے لگا۔

"ابھی نہیں۔ وہ خود ہی آ جائیں گے۔ آپ میرے پاس ہی بیٹھے رہیں۔" منیرہ نے
اسے پھر گود میں بھر کر پیار کر لیا۔

اس وقت یہ چھوٹا سا خاندان سہ منزلہ مکان کی دوسری منزل کے گلی والے کمرے
میں تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے چوبی پلنگ پر منیرہ اور آمینہ بیٹھی تھیں۔ کھڑکی کے قریب
بچھی کرسی پر مجید تھا اور کرسی پر تکیے کے ساتھ ثمینہ لگی کھڑی تھی۔

نکاح کے تیسرے دن منیرہ آصف کو بھی ساتھ لے آئی تھی۔ اس وقت وہ اوپر چھت پر
کھیل رہا تھا۔ جب سے وہ اس نئے گھر میں آیا تھا۔ گلی میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا
یہ مکان شہر کے اندرون واقع تھا۔ گلیوں کے اندر یہ سہ منزلہ مکان پرانا تو تھا۔ لیکن اسے کھا
اچھی حالت میں گیا تھا۔

نچلی منزل میں صرف بیٹھک ہی استعمال میں آتی تھی۔ باقی تینوں کمرے اور صحن گودام
کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ تین کمرے تھے۔ سامنے ہی باورچی خانہ تھا۔ چھوٹا سا غسلخانہ
بھی اسی حصے میں تھا۔

آصف کو نیا گھر بے حد پسند آیا تھا۔ یہاں اداسی کا تاثر دینے والے ملگجے اندھیرے نہیں
تھے۔ روشن روشن کمرے۔ صاف ستھرے بستر۔ نئی نئی کرسیاں۔ چینی کے برتن۔ پیلی
پیلی نئی نئی چکیں۔ سبز نئی فرشی دری۔ سبھی کچھ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہاں خورشید اور سرا رمانی

نہیں تھیں۔ جن کی خشمناک نگاہوں کے خیال ہی سے اسے جھرجھری سی آجاتی۔ اور پھر نفرت کا ریلا سا ذہن میں امنڈنے لگتا۔

ایک کمی ضرور محسوس ہوئی تھی۔ اپنے گلی کے ہم جولیوں کی۔ لیکن مجید کی شفقت نے اس کمی کا احساس مٹا دیا۔ جب وہ دکان پر جانے سے پہلے اس کے گورے گورے گالوں پر پیار سے چٹکی کاٹ کر کہتا۔ "موٹو میاں آج کیا چیز لائیں آپ کے لیے؟"

تو — آصف — اُف!

آصف کی حالت دید کے قابل ہوتی۔ اس کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا۔

کتنا مسرور۔ کتنا خوش ہوتا وہ اس لمحے — اور شام — جب مجید پھلوں کا لفافہ یا ٹافیوں کا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر کہتا۔

"عیش کرو موٹو میاں!"

تو — آصف کا دل خوشی و مسرت کے بھرپور جذبوں سے گدگدانے لگتا۔

"بھائی پاس جاؤں گا باجی۔" عامر نے ثمینہ سے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"کتنا بے تاب ہے بھائی سے ملنے کو۔" آمینہ نے ہنس کر کہا۔

"بیٹا ابھی ہم سے تو پوری طرح ملے نہیں آپ۔ کچھ باتیں سنائیں ہمیں۔" منیرہ نے پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

اور — پھر ننھے منے سوال کر کے اس کی باتوں سے محظوظ ہونے لگی۔

مجید، ثمینہ اور آمینہ کے چہروں سے ان کی دلی مسرت عیاں تھی۔ انہیں دھڑکا تھا شاید۔ کہ منیرہ عامر سے اچھا سلوک کرے گی بھی یا نہیں۔ منیرہ کے رویے سے یہ دھڑکا عامر نے جانے کیا کہا۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

اور عین اسی وقت چھت پر اکیلے کھیلتے کھیلتے تنگ آکر آصف بھی نیچے آگیا۔

آصف سیدھا اسی کمرے میں آیا۔

باری باری سب کی طرف دیکھا۔ لیکن کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ عامر کی ذات جو دل چسپی اور توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

ماں کی گود میں کسی اجنبی بچے کو یوں اپنائیت سے بیٹھے دیکھ کر آصف کو جانے کیا ہونے لگا۔ وہ تیزی سے ماں کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ آگئے آصف میاں۔" آمینہ نے کہا۔

سب نے آصف کی طرف دیکھا۔

کوئے پر مٹی میں کھیلنے سے اس کے کپڑے خاصے میلے ہو رہے تھے۔ قمیض کے دامن سے ناک بھی پونچھی تھی۔ چہرے پر بھی ہاتھوں کی میل لگ گئی تھی۔ دونوں ہاتھ مٹی سے بھرے تھے۔ منیرہ نے صبح ہی صبح اسے صاف ستھرے کپڑے پہنائے تھے۔ حسب عادت اس نے دو گھنٹوں ہی میں سارا معاملہ برابر کر دیا تھا۔ اس وقت صاف ستھرے عامر کے سامنے وہ ضرورت سے زیادہ ہی گندا نظر آرہا تھا۔ منیرہ خفت و ندامت سے کچھ کٹ سی گئی۔

کہاں کھیل رہے تھے — ؟ سارے کپڑے برباد کر لیے! اس نے آصف کو پیار کرنے کی بجائے ڈانٹا۔

"کوئی بات نہیں بچہ ہی ہے۔ چھت پر مٹی بھی تو بہت ہے ثمینہ نے کہا۔

"اپنے بھائی عامر سے ملیں۔ یہ ہیں آصف بھائی۔" آمینہ نے بھائی کو چمکارا۔

عامر کا شوق جیسے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ منیرہ کی گود میں بیٹھا صرف آصف کو دیکھ کر رہ گیا۔

"گلے گلے ملو۔ شاباش۔ عامی۔" ثمینہ نے چمکارا۔

عامر نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ منیرہ نے اسے قدرے جھکا دیا۔ آصف نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

اور — خود اپنی پوری قوت سے عامر کو دھکیل کر ماں کی گود سے اتارنے لگا۔

بچے کی کشمکش سے سبھی محظوظ ہوئے۔ منیرہ نے آہستگی سے عامر کو پلنگ پر بٹھا دیا۔

آصف اُچک کر ماں کی گود میں چڑھ بیٹھا۔

اس کے چہرے پر اب فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس کی آنکھوں میں مسرور سی چمک۔
"آؤ گلے ملیں؟" اس نے ماں کی گود میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ پھیلا دیئے۔
"بڑے چالاک ہیں۔" سب اس کی معصوم حرکت پر ہنس دیئے۔
آصف نے عامر کو بازوؤں میں سمیٹ کر پیار کر لیا۔
تھوڑی دیر بعد سب باتوں میں مشغول تھے۔
اور۔
صحن میں عامر اور آصف
دو نئے دوست
دو نئے بھائی
گھل مل کر کھیل رہے تھے۔

—— ❊ ——

جگہ اور نئے ماحول میں بگڑا ہوا آصف ایک دم سنبھلا۔ کچے ذہن میں ابھی نئی سنورنے کی گنجائش تھی۔ اس کی فطرت تو ابھی مٹی کے بے ہنگم تودے کی سی تھی جس طرف ڈھالا جاتا ڈھل جاتی۔

توجہ اور پیار سے محرومی نے اسے بگاڑا تھا۔ ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ، مار پٹکار اور ننھی منی خواہشوں کے کچلے جانے سے وہ خودسر، ڈھیٹ، ضدی اور جھوٹا بن گیا تھا۔ چوری بھی کرنے لگا تھا۔ مار سے بچنے کے لیے جھوٹ کا آسرا لینا بھی سیکھ گیا تھا۔

لیکن —— اس نئے گھر میں فضا ایک دم بدل گئی تھی۔

یہاں مار تھی نہ پھٹکار —— نہ ہی اس پر کوئی جھوٹا الزام لگاتا تھا۔ نہ ہی بلاوجہ سزا ملتی تھی۔ چوری کرنے یا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

ماں کی توجہ اور پیار بھی مل گیا تھا نئے ابو بھی اچھی طرح پیش آتے۔ تھے یہاں ضد کیے بغیر ہی گھی میں تر پراٹھا مل جاتا تھا۔ دودھ کا لبالب پیالہ بھی انڈے اور پھل بھی۔

شام کو نئے ابو کوئی نہ کوئی چیز بھی لا کر دیتے۔ پیار سے گال پر چٹکی بھی کاٹ لیتے۔

لمبی دن سیر کے لیے تانگہ پر بٹھا کر باہر بھی لے جاتے۔ نئے نئے کپڑے بھی خرید دیتے دسو نے جاگنے والی گڑیاں بھی لا کر دی تھیں۔

آصف تو جیسے جہنم سے نکل کر ایک دم جنت میں آ گیا۔

لیکن —— یہ بہاریں وہ چند دن ہی دیکھ پایا۔

عامر کے آ جانے سے اس کی جنت کی رعنائیاں دھندلانے لگیں۔

اس نے محسوس کیا کہ عامر کے آجانے سے اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔

مجید کا رویہ ویسا ہی رہتا تو شاید وہ سنبھلا رہتا۔

لیکن — مجید پیار کا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ منیزہ بھی مصلحتاً عامر پر ملتفت رہی۔

آصف بچہ ہی تھا۔ ان مصلحتوں کو کیوں کر سمجھ لیتا۔

مجید دکان سے واپسی پر عامر کو لپٹا کر پیار کرتا۔ پھل اور ٹافیوں کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیتا۔ بازوؤں میں بھر کر چھاتی سے لگا کر پوچھتا۔

"اُداس تو نہیں ہوتے تھے؟" — "بھوک تو نہیں لگی —؟"

"دودھ پی لیا تھا؟" — "کتنے پیسے لوگے —؟"

"کل شام نوکر کے ساتھ دکان پر آجانا۔ تمہارے لیے نئے کپڑے بنوا دوں گا۔"

باپ کی گود میں چڑھا عامر لفافے سینے سے چمٹائے آصف کو شانِ تفاخر سے دیکھتا۔ آصف مجید کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ اس والہانہ پیار کے لیے اس کا بھی جی ہمکتا۔ وہ بھی یہی چاہتا۔ کہ مجید اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لے اور پھر ایسے ہی بیٹھے بیٹھے سوال پوچھے۔ پھل اور ٹافیوں کے لفافے یونہی اس کے ہاتھ میں تھما کر کہتے "جاؤ موٹو میاں عامر کو بھی دینا۔" لیکن —

اس کی یہ خواہش تشنہ ہی رہ جاتیں۔ عامر سے مل کر مجید اس کی ہستی کو یکسر فراموش کر دیتا۔ ٹانگوں سے لپٹے ہوئے بچے کو ایک سرد سا ہاتھ جدا کر دیتا۔ اس ہاتھ کی ٹھنڈک اور سردی مجید کو محسوس ہوتی۔ نہ ہی کسی اور کو — ہاں ننھے سے دل کے نازک نازک جذبے اس ٹھنڈک سے ضرور سرد پڑ جاتے۔

مجید کی سرد مہری اور منیزہ کی لاپروائی رنگ لانے لگی۔ آصف اپنی کھوئی ہوئی اہمیت کو پانے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔

وہ مجید کا ہر کام دوڑ دوڑ کر کرنے لگا۔ دکان پر جانے سے پہلے وہ اس کے جوتے

صاف کر کے رکھتا۔ کھانا کھاتے وقت اچھی اچھی چیزیں اس کے سامنے رکھتا۔ کوٹ اتارتے ہی ننھے منے ہاتھوں سے تھام کر کھونٹی پر لٹکانے کی کوشش کرتا۔

لیکن — یہ ساری کاوشیں اسے عامر کے برابر اہمیت نہ دے سکیں۔ پیار کا وہ سُرور جس کے لیے وہ لاشعوری جدوجہد کر رہا تھا۔ اسے میسر نہ آسکا۔

مجید نے کبھی اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگایا اور نہ ہی پھل کا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے کر شفقت سے کہا "جاؤ عامر کو بھی دو۔"

بلکہ اس کے ان ننھے منے کاموں کو جیسے اس کا فرض سمجھ لیا گیا۔ جس دن مجید کے جوتے صاف نہ ہوتے وہ اسے ڈانٹ کر پوچھتا۔ آج جوتے صاف کیوں نہیں کیے؟

مجید کا رویہ اس سے بدلتا ہی گیا۔

آصف نے اب اس کی توجہ اور شفقت پانے کا دوسرا لاشعوری ذریعہ اختیار کیا۔ جب سب بیٹھے باتوں میں مشغول ہوتے تو وہ ایک دم زور سے چیخ مار کر سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ سب اس کی طرف لپکتے لیکن جب وہ ہنس دیتا تو سب اسے لعن طعن کرنے لگتے۔ "بیہودہ، بدتمیز" جیسے الفاظ سے نوازا جاتا۔

اس کی وہ خواہش تشنہ ہی رہ جاتی جس کے لیے اس نے یہ راستہ اپنایا تھا۔

وہ اکثر زور زور سے گانا گانے لگتا۔ اتنی زور سے کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔

وہ بیٹھے بیٹھے بستر پر قلابازیاں لگانے لگتا۔ صفائی سے بچھے ہوئے بستر دل کا ستیاناس ہو جاتا۔ ان سب لاشعوری حرکات سے اسے نہ تو وہ اہمیت مل سکی، نہ پیار۔ ہاں بدتمیز اور بے ہودہ ضرور گردانا گیا۔

مجید اس کی حرکات سے برافروختہ ہو جاتا — پیار کی بجائے خوب ڈانٹتا۔

منیزہ بھی مجید سے خائف تھی۔ وہ بھی آصف کو ہی ڈانٹتی۔ اسے اتنا شعور ہی کہاں تھا۔ کہ آصف کی ذہنی کشمکشوں کے داخلی اور خارجی محرکات پر غور کرتی۔

گھر میں جب بھی کوئی مہمان آتا۔ آصف کو خاص طور پر تمیز سے رہنے کی جاتی۔ اس کے برعکس عامر سے کچھ بھی نہ کہا جاتا۔ مہمان آتے۔ عامر پیش پیش ہوتا۔ وہ اس سے نام پوچھتے گود میں بٹھاتے۔ پیار کرتے۔ آصف کو یا تو اندر آنے کی اجازت ہی نہ ہوتی۔ اگر ہوتی بھی تو کرسی پر بندھ کر بیٹھ رہنے کی۔ وہ اٹھنے کی کوشش بھی کرتا تو مجید کی غصیلی نگاہوں سے سہم جاتا۔

پیار سے محرومی نے آصف کے معصوم ذہن میں مجید کے خلاف زہر کا بیج بو دیا۔ عامر بھی اسے اپنا حریف نظر آنے لگا۔

اس رات مجید کے ہاں کچھ کاروباری دوستوں کی دعوت تھی۔ حسبِ معمول مجید نے ڈانٹ کر آصف سے کہا: "خبردار! جو تم نیچے بیٹھک میں آئے!"

ساتھ ہی ساتھ اس نے منیرہ سے بھی کہا۔ "اسے اوپر ہی رکھنا۔ انسپکٹر راشد مہمانِ خصوصی ہے۔ یہ ہمیشہ بدتمیزی کرتا ہے۔ اس کی عادت سے تو تم واقف ہی ہو۔ مجھے اس کی وجہ سے شرمندہ نہ ہونا پڑے!"

منیرہ کو دل ہی دل میں برا لگا لیکن اپنے بچے کی عادت سے بخوبی واقف تھی۔ عامر نے اس دن خوب اچھے اچھے کپڑے پہنے اور بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ سینہ پھلائے باپ کی انگلی پکڑے نیچے چلا گیا۔

آصف کے ذہن کو دھچکا سا لگا۔ عامر اس دن اسے بے حد برا لگا اور مجید۔ مجید! اس نے آنکھیں بند کر کے خشوع و خضوع سے دعا کی۔ "اللہ میاں یہ تو سیڑھیوں سے گر جائے۔ اس کا سر پھٹ جائے۔ عامر بھی گر گرے۔ دونوں کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔"

اس نے یہ دعا کئی دفعہ مانگی — لیکن اس کی دعا پوری نہ ہوئی۔

مہمان آ گئے۔ قہقہوں سے گھر گونج اٹھا۔

آصف کا دل مچلنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد قہقہے اور مہمانوں کی آوازیں

اس کی توجہ کا مرکز بنتی تھیں۔

ماں کی نظر بچا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ بیٹھک کے کھلے دروازے سے نکال کر اس نے کئی بار اندر جھانکا۔ آٹھ دس آدمی کرسیوں پر براجمان تھے۔ عامر کبھی ایک کے پاس کبھی دوسرے کے پاس جاتا۔ کوئی اس کا منہ چوم لیتا۔ کوئی سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا۔ کوئی گود میں اٹھا کر نام پوچھتا۔

اس کے اندر کی دبی ہوئی پیار و محبت پانے کی خواہش بری طرح مچلی۔ وہ سرک کر دروازے کی چوکھٹ تک آ گیا۔ سامنے ہی انسپکٹر راشد بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بچے کو یوں بار بار جھانکتے دیکھا تو پیار سے اندر بلا لیا۔

آصف مقناطیسی کشش سے کھنچا اندر چلا آیا — یہ پیار بھرا بلاوہ اتنا مؤثر تھا۔ کہ اسے مجید کی خشمناک نظروں کی پروا ہی نہ رہی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"آصف"

"بہت اچھا نام ہے۔"

مجید نے پلٹ کر دیکھا۔ انسپکٹر راشد آصف سے باتیں کر رہا تھا۔

"تم کیوں آئے؟" اس نے وہیں سے ڈانٹا۔ آصف سہم کر راشد کے ساتھ لگ گیا۔

"کون ہے یہ؟" کسی نے پوچھا۔

"ان کا صاحب زادہ۔" ایک بے تکلف دوست نے مجید کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا کہاں۔ ہماری نئی بیگم جہیز میں لائی ہیں۔" مجید نے جلدی سے کہا۔

سب بے اختیار ہنس پڑے۔ آصف اس ہنسی کو سمجھ تو نہ سکا لیکن کھسیانا سا ہو گیا۔

"کوئی بات نہیں۔" کسی نے کہا۔

"بڑا پیارا ہے۔"

"پیارا" مجید بولا "صورت پر نہ جاؤ۔ اک طوفان ہے۔ بدتمیز جہان بھر کا ہے فتنہ ہے۔"

"معصوم سا لگتا ہے۔"

"کہا نا صورت پر نہ جاؤ۔ ابھی دیکھ لینا۔ کیا اہلیت ہے اس کی ہے تو اسی لیے تو نے اسے نیچے سے منع کر دیا تھا۔ نچلا بیٹھنا تو آتا ہی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں بچہ ہی تو ہے۔"

دو چار دوستوں نے اس کی طرف داری کی۔ مجید مجبوراً چپ ہو گیا۔ ورنہ وہ تو اسے ایک منٹ میں کمرے سے باہر نکال دینا چاہتا تھا۔

دوست اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ آصف عامر کے برابر ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ کھانا لایا گیا۔ گول چوکور کئی میزیں جوڑ کر کھانا چن دیا گیا۔ خاصی پرتکلف دعوت تھی۔ سب مزے سے کھانے لگے۔

اتفاق ہی کی بات تھی جو آصف کی کہنی لگنے سے پانی کا جگ الٹ گیا۔ چادروں کی ڈش پانی سے بھر گئی۔ آصف کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

مجید شیر کی طرح غرّایا۔ عامر بھی غضب ناک نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"انسان تھوڑا ہی ہے ـــ وحشی ہے وحشی!"

چلو کیا ہوا۔ بچہ ہی ہے۔ وحشی ہے وحشی!" لیکن مجید نے گردن سے پکڑ کر آصف کو اٹھایا اور دروازے کے باہر جا کر سیڑھیوں کی طرف دھکا دیا۔ "اب ادھر آئے تو جان نکال دوں گا۔"

"آپ نہیں جانتے اسے۔ واپس کمرے میں آ کر مجید نے کہا۔ جانور ہے بالکل۔"

آصف اپنی سبکی پر تلملا کر رہ گیا۔ مجید سے نفرت کا بیج بویا تو عرصہ پہلے گیا تھا۔ اب پودا پڑا۔ اس نے دل ہی دل میں مجید اور عامر کو کئی گالیاں دیں۔ بددعائیں مانگیں۔

اور ـــ رات خواب میں مجید اور عامر کو سیڑھیوں سے لڑھک کر زخمی ہوتے بھی دیکھا۔

ـــ ۴ ـــ

آصف اپنی محرومی اور حق تلفی کا بدلہ اب عامر سے لینے لگا۔ مجید پھل کا لفافہ لیے سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں آیا۔

"عامر بیٹے!"

"جی ابّو۔"

"کہاں ہو بیٹے؟"

"آیا ابّو۔"

عامر کے ساتھ آصف بھی کمرے سے نکل آیا۔

"دیکھو تو ہم آپ کے لیے کیا لائے ہیں!" مجید نے جھک کر بیٹے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے ابّو؟"

"سیب۔"

"آہا!"

لال لال سیب دیکھ کر عامر اچھلا۔ مجید نے لفافہ اسے تھما دیا۔

"ایک اسے بھی دے دو۔" مجید کہہ کر کمرے میں چلا گیا۔

آصف کو سیب کی بھوک تو نہ تھی اسے تو وہ پیار چاہیئے تھا۔ جو عامر کو ملا تھا۔ وہ اہمیت چاہیئے تھی۔ جو عامر کو دی گئی تھی۔

عامر سیبوں کا لفافہ کھول کر دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ آصف نے جھپٹ کر لفافہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ عامر چیخا۔ "بدتمیز ہو تم!"

آصف دو سیب نکال کر دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔

مجید لپک کر باہر آیا۔ سیبوں والا لفافہ فرش پر پڑا تھا۔ عامر منہ بسور رہا تھا اور آصف دونوں سیب بیک وقت کھائے جا رہا تھا۔

"وحشی! نفرت سے مجید نے کہا۔

اور پھر باقی سیب اٹھا کر پیار سے عامر کو بہلانے پھسلانے لگا۔

پھر — اکثر — یونہی ہونے لگا۔

آصف جھپٹ کر عامر سے چیز چھین لیتا۔ عامر روتا۔ مجید تلملاتا۔

اور — آصف کو — اس کے رونے — اور مجید کے تلملانے سے — ایک خاص قسم کا سرور — ایک انوکھی قسم کی روحانی لذت ملتی۔

منیرہ آصف کی حرکتوں سے سخت پریشان تھی۔ مجید سے خائف ہو کر آصف ہی کو ڈانٹتی۔ اکثر بے بس ہو کر روتی۔ مجید سے بھی اس نے کہہ دیا۔ کہ آصف پر اپنا رعب رکھے۔

رعب اب زبانی ڈانٹ نہیں تھی بلکہ گھونسے اور تھپڑ بھی تھے۔

اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نہ نکلا۔

آصف اس کا بدلہ عامر سے لینے لگا — کبھی چپکے سے اسے چٹکی دیتا — کبھی کھڑے ہوئے کو دھکا دے کر اوندھے منہ گرا دیتا۔ کبھی سوئی چبھو دیتا۔

یہ انتقام کی راہیں تھیں جو دن بدن پھیلتی ہی جا رہی تھیں۔

مجید تنگ آ گیا۔ منیرہ عاجز آ گئی۔ لیکن آصف کی روش نہ بدلی۔ اکثر وہ اپنی انتقامی حس کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا کرتا۔ عامر کو زک دے کر مجید کو مشتعل کر کے اسے بے حد سرور و تسکین ملا کرتی تھی۔

بچے کی نازیبا حرکات سے تنگ آ کر اسے سکول داخل کروانے کا سوچا گیا۔ ماں کے [illegible] کے بعد آصف سکول چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ چھ ماہ یونہی گزر گئے تھے۔

عامر بھی پانچ ساڑھے سال کی عمر کو پہنچ رہا تھا۔ دونوں کو سکول داخل کروانے کا ارادہ کیا گیا۔

مجید دونوں کو ایک ہی سکول میں داخل کروانے کا قطعاً حامی نہ تھا لیکن جب منیرہ نے رو دھو کر بچے کا مستقبل سنوارنے کی التجا کی تو مجید مان گیا۔

ایک اچھے سکول کے ایک ہی درجہ میں دونوں کو داخل کروا دیا گیا۔ آصف نے پہلے تو سکول میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

لیکن — یہ اک اچھا معیاری سکول تھا۔ چھوٹی کلاس مس شفقت کے سپرد تھا جو نام ہی کی شفقت نہ تھی۔ ہم صفت موصوف تھی۔

انگریزی طرز کے اس سکول میں صاف ستھرے اور اچھے خاندانوں کے بچے زیر تعلیم تھے۔ سکول کا سٹاف بھی محنتی تھا۔ کھیلوں کے لیے بھی وقت دیا جاتا تھا۔ بچوں کی دلچسپی کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ آصف کا [illegible] ل میں لگنے لگا۔

مس شفقت، شفقت مجسم تھی، گول مول پیاری سی شکل و صورت کا صاف ستھرا آصف اسے پیارا لگا۔ یوں بھی ذہین تھا۔ سکول سے دلچسپی بھی لینے لگا تھا۔ مس شفقت کی نظروں میں جلد ہی آ گیا۔

وہ — اسے بڑے پیار سے اپنے قریب پہلی کرسی پر بٹھاتی۔ سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی۔ مجسم پیار بن کر سوال کرتی۔

اور — آصف — جس کی روح جہنم کی پیاسی تھی جس کی ہستی حالات نے پٹخ پٹخ کر بدنما کر دی تھی۔ جس کا کردار بھک بھک کر اپنی اصلی صورت کھو رہا تھا۔

اس توجہ خصوصی سے مسحور اور سرشار ہو گیا — وہ شرارتیں بھی کرتا۔

بلاوجہ دوسروں کو مار پیٹ بھی لیتا — بلا اجازت دوسروں کی چیزیں بھی اٹھا لیتا۔

گالی بکنے سے بھی گریز نہ کرتا۔

لیکن ـــ مس شفقت نے ان سب باتوں کے باوجود اس پر کبھی سختی نہیں کی۔ ہمیشہ پیار اور ملائمت سے سمجھایا۔ مشفقانہ رویہ رکھا۔ بڑی اپنائیت اور محبت سے بُری عادتوں کو چھڑوانے کی سعی کی۔ اچھی اچھی باتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

آصف جو اکھڑ، ضدی اور خود سر بچہ تھا۔

خلوص اور پیار سے سدھائے ہوئے جانور کی طرح مس شفقت کے بس میں آ گیا۔

وہ اپنی مس کا اس قدر گرویدہ ہو گیا۔ کہ جب وہ پیریڈ ختم ہونے پر کلاس سے اُٹھ کر جاتی تو وہ بھی اپنا بیگ سنبھال کر اس کے پیچھے کلاس سے نکل جاتا۔

"میں آپ سے پڑھوں گا۔ وہ دوسری جماعت میں اپنا بستہ اٹھائے مس شفقت کے ساتھ جا پہنچتا۔

مس شفقت اس کے لگاؤ سے بڑی متاثر ہوتی اور پھر بہلا پھسلا کر اسے کلاس میں چھوڑ جاتی۔

سکول میں آصف کی مجروح انا کو تسکین ملی۔ ذہنی تلاطم کو بھی قرار آ گیا۔ اس نے ساری بُری عادتیں ترک کر دیں۔ کلاس کا سب سے ذہین اور شائستہ بچہ کہلانے لگا۔ مس اس کی مثالیں دیتی۔ دوسری استانیوں میں بھی اس کا تذکرہ کرتی۔

لیکن ـــ گھر میں وہی کھنچا کھنچا سا ـــ بیزار سا

ماحول تھا۔ جس میں عامر ہی کی ذات دلچسپی اور توجہ کا مرکز تھی۔

ہر شام دکان سے واپسی پر مجید کا وہی معمول و دستور رہا۔ رات کھانا کھانے کے بعد وہ بڑی محبت سے اپنے بیٹے کو بلاتا۔

"بستہ لے کر آؤ ہمیں سبق سناؤ آج کیا پڑھا"

عامر بستہ لے کر آتا۔ اٹک اٹک کر اپنا سبق سناتا۔ مجید اس کی تسلی و تشفی کے لیے جی بھر کر پیار کرتا۔ پیسے دیتا۔

اس کے برعکس آصف کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھتا۔ آصف بھی کوشاں ہوتا۔ کہ وہ اپنا سبق فرزند مجید کو سنائے۔ اشاروں سے یاد کی ہوئی نظم گوش گزار کرے۔

لیکن

کبھی کسی نے فرمائش نہیں کی۔

وہ خود ہی اونچی آواز میں مجید کے اردگرد منڈلاتے ہوتے از بر یاد کی ہوئی نظم سناتا پھرتا۔

اور ـــ جب

"تم چپ رہو۔ عامر کو سنانے دو" تحکمانہ لہجے میں مجید کہتا۔

تو آصف کا بے اختیار جی چاہتا۔ کہ عامر کا حمایہ دونوں ہاتھوں سے گھونٹ دے۔

اور

باورچی خانے سے مصالحہ پیسنے کی سِل لا کر مجید کے سر پر دے مارے۔

—— ٭ ——

سکول

اور گھر کی فضا کے تضاد نے آصف کی شخصیت کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ سکول میں وہ بڑا شائستہ، ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آنے والا اور دوسروں کی تکلیف پر تڑپ جانے والا بچہ تھا۔

لیکن — گھر میں — وہی نٹ کھٹ، ضدی، خودسر، ڈھیٹ اور بدتمیز سا بچہ جسے عامر کو رُلا کر تسکین ملتی تھی۔ جسے مجید کو اشتعال دلا کر سرور آتا۔ یہ سب کچھ اس کی اہمیت، انفرادیت اور اپنے وجود کو بڑا منوانے کی کوششیں تھیں ماں سے بھی کبھی بھرپور پیار نہ ملا تھا۔ اس لیے دانستہ یا نادانستہ وہ اُلٹی سیدھی حرکات کا مرتکب ہوتا ہی رہتا۔

اس شام دونوں بھائی صحن میں کھیل رہے تھے۔ آصف نے لکڑی کی گیند سامنے دیوار پر ماری۔ جو دیوار کی بجائے کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے سیدھی کمرے کی دیوار پر لگی مجید کی تصویر پر لگی — تصویر گری۔

میز پر رکھا ٹائم پیس بھی تصویر کے ساتھ ہی فرش پر آ رہا۔

مجید کمرے ہی میں تھا۔ اس ناگہانی افتاد سے بوکھلا گیا۔ لیکن جب گیند لڑھکتی ہوئی قدموں میں آئی۔ تو دھڑ صحن کی طرف لپکا۔

"کس نے ماری تھی یہ گیند؟" اس نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"آصف نے۔" عامر سہم کر بولا۔

منیرہ بھی باورچی خانے سے سہمی سہمی سی نکل آئی۔

"کیا ہوا —؟"

اندر جا کر دیکھو، کیا ہوا ہے!" مجید لال پیلا ہوتے دیکھا۔

منیرہ تیزی سے اندر گئی۔ اور مجید نے لپک کر آصف کو پکڑ لیا۔ اس کے رخساروں پر بے دریغ طمانچے لگانے کے بعد اس کا سر دیوار سے اس طرح پٹخا۔ کہ آصف کی آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ وہ درد و اذیت سے بلک اٹھا۔

ممتا چیخی اور منیرہ ٹوٹی ہوئی گھڑی اور تصویر کو وہیں چھوڑ کر باہر دوڑی۔ آصف کے گالوں پر طمانچوں کے نشان دیکھ کر اس کا جی تڑپ اٹھا۔ بچے کو بازوؤں میں بھر کر وہ باورچی خانے میں لے گئی۔ اور سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے آصف کے پھول سے رخساروں کو اپنے گال سے رگڑ رگڑ کر پیار کیا اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر بلک بلک کر روئی۔

آصف درد کا احساس بھول گیا۔ اسے رونا بھی یاد نہ رہا۔

آج کتنی مدت کے بعد اسے پیار کی ٹھنڈک ملی تھی۔

ہر وقت جلن ہی جلن محسوس ہوتی۔

یہ جلن آج ماں کے پیار کے خنک چھینٹوں سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ ماں سے لپٹ لپٹ گیا۔ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھولا۔

اس رات ماں نے اسے لپٹا کر سلایا۔ نیند میں بھی آصف کو ماں کے ہونٹوں کی نرمی اور آنسوؤں کی نمی کا احساس رہا۔ وہ غنودگی میں ماں سے یوں لپٹ گیا۔ جیسے اس کے سینے کی بیکراں وسعتوں میں اپنا مٹتا سا وجود کھو دینا چاہتا ہو۔ تنہائی کا احساس بھی مٹ گیا۔

صبح وہ اٹھا تو بے حد بشاش تھا۔ ماں نے بڑے پیار سے اس کا منہ دھلایا اس کے رخساروں پر شاید انگلیوں کے نشان اب بھی تھے۔ ماں نے کتنی ہی بار اسے

ان نشانوں پہ پیار کیا۔

کتنا سکون مل رہا تھا اسے — اپنی ذات کائنات کی وسعتوں پہ چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ محرومیت کا غلبہ نہیں تھا۔ اپنی اہمیت محسوس ہو رہی تھی۔

دو چار دن وہ ماں کے پیار اور توجہ کا مرکز بنا رہا۔ ان دنوں اس نے ضد کی نہ ٹھنائی سے کام کیا۔ دوڑ دوڑ کر ماں کا کام کرتا رہا۔

لیکن — منیرہ گھر کے کام کاج میں الجھ کر بچے کو وہ پیار نہ دے سکی۔ جس کی چاہت کی شدید خواہش نے اس کے ذہن میں تلاطم بپا کر رکھا تھا۔ وہ پیار و التفات کا مظاہرہ اسی طرح نہ کر سکی۔ بچے کی نفسیات سے آگاہ ہوتی تو آصف کی زندگی کے خطوط سیدھے متعین کر سکتی تھی۔ لیکن وہ تو حالات کی زنجیروں میں بندھی زندھی عورت تھی۔ جسے وقتی جذبوں سے مغلوب ہو جانے کے سوا اور آتا بھی کیا تھا۔

ماں کی توجہ اپنی ذات پر مرکوز کرنے کی خواہش دب کر پھر ابھری۔ آصف کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا۔ صرف یہی آیا۔ کہ اسے پہلی بات کا اعادہ کرنا چاہیئے۔ شعور اور لاشعور کے بین بین کسی حس نے اسے مجبور کیا۔ اور اس نے مجید کے سرہانے رکھی میز کا کپڑا زور سے کھینچا۔

اک چھناکے سے اوپر پڑی شیشیاں فرش پہ گریں۔ اور کرچیاں بکھر کر سیال دوائیں بہنے لگیں۔

مجید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ — وہ پٹائی کی کہ الاماں۔

منیرہ نے اسے رومال کھینچتے دیکھا تھا۔ اس لیے اسے قصوروار سمجھ کر پیار کی بجائے غصہ ہی کیا۔

آصف کی ترکیب کارگر نہ ہوئی۔ ماں کا پیار نہ مل سکا۔ مجید سوڈیڑھ سو کے نقصان پہ تلملا رہا تھا۔ غصہ گھونسوں اور طمانچوں کی راہ نکال رہا تھا۔

منیرہ کا دل دکھا ضرور۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ آصف کو دھکیل کر مجید کے ہاتھوں کی زد سے پرے کر دیا۔

دیکھ لیا اس فتنے کو۔ اس دن تو بڑا گلے لگا لگا کر رو دی تھیں۔ میں کہتا ہوں۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں سنورتے۔ فتنہ ہے فتنہ — اس کی یہی حالت رہی تو میں اسے گھر میں رکھنے سے رہا۔ ننھیال بھجوا دینا مجھے، پتہ ہوتا — تو!"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اس ادھورے فقرے سے منیرہ مطلب اخذ کر چکی تھی۔

آصف کو پیار کرنے کی بجائے آج اس نے بھی دو چار لگا کر دل کی بھڑاس نکالی۔ واقعی بچہ نہیں فتنہ تھا۔ جس نے گھر بھر کا چین حرام کر دیا تھا۔

تلخ و ترش واقعات آصف کے ذہنی توڑے کو مسخ کرتے رہے۔ بے سہارا تنکے کی طرح وہ حوادث کے طوفانوں میں تھپیڑے کھاتا رہا۔

سکول کا ماحول سازگار نہ ہوتا۔ تو شاید وہ ان ممدمات اور ذہنی کچوکوں سے پاگل ہو جاتا۔

—— ۹ ——

دکان کا کچھ مال خرید نے مجید کراچی جا رہا تھا — روانگی سے پہلے اس نے عامر کو محبت سے گود میں بٹھا کر پوچھا "کیا لائیں آپ کے لیے کراچی سے — ؟"

"ریل گاڑی" عامر خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ ریل گاڑی کی خواہش اسے ایک عرصے سے تھی۔

"اچھا اور — ؟"

"ابّو — یوں یوں گھومنے والی ریل گاڑی — چھک چھک کرنے والا انجن" عامر نے ہاتھوں کو گھما کر دائرہ بنایا اور پھر منہ سے چھک چھک کی آوازیں نکالتے ہوئے گال پھلانے لگا۔

ہنستے ہنستے مجید نے اس کے گالوں پر پیار کر لیا۔

بستر بند اور سوٹ کیس کے قریب آصف بھی کھڑا تھا۔ منیرہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ مجید نے پیار کرنے کے بعد پھر پوچھا "اور کیا لاؤں ؟"

"میرے لیے گڑیا" عامر کی بجائے آصف بول اٹھا۔

"لڑکا ہو کر گڑیوں سے کھیلنے کا شوق بھی عجیب ہی ہے" مجید نے آصف کی بجائے منیرہ سے کہا۔

"خدا جانے کیا بات ہے۔ کوئی کھلونا اسے پسند نہیں۔ بس سونے جاگنے والی گڑیا — شروع ہی سے اس کی فرمائش یہ رہی" منیرہ کی آنکھوں میں بیتے دنوں کی جھلک

ابھرنے لگی۔ منیرہ سے بھی ہمیشہ آصف گڑیا ہی کی فرمائش لیا کرتا تھا۔

"آپ آصف کے لیے گڑیا ضرور لائیں" منیرہ نے تاکید کی۔ اس کا شوق پورا ہو جائے گا۔"

"سونے جاگنے والی — امّی — یوں یوں آنکھیں بند کرنے اور کھولنے والی" آصف نے لمبی لمبی سیاہ پلکوں والی خوبصورت آنکھیں اس اداکاری سے کھولیں اور بند کیں۔ کہ منیرہ کو بے طرح پیار آ گیا۔ مجید بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

شہہ پا کر آصف بھی عامر کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ مجید کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر وہ کچھ جھک سا گیا۔

"اتنی بڑی گڑیا۔ ابو میاں۔ اتنی" اس نے زمین سے کوئی فٹ بھر ہاتھ اونچا کر کے سائز بتایا۔

"اچھا بھئی لاویں گے۔"

"ضرور لائیے گا" منیرہ نے پھر کہا۔

"آہا جی! ہماری گڑیا آئے گی" آصف خوشی سے ناچنے لگا۔

"ہماری ریل گاڑی آئے گی۔ واہ جی واہ۔"

دونوں بچے خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔

شام کی گاڑی سے مجید چلا گیا۔ گلی میں جاتے جاتے بھی آصف، اپنی گڑیا اور عامر اپنی ریل گاڑی کی فرمائش کیے جا رہا تھا۔

پندرہ دنوں کا انتظار دونوں بچوں کے لیے صبر آزما تھا۔ بہرحال پل پل گنتے وقت گزر گیا۔ دس بجے کی ٹرین سے مجید واپس آ گیا۔ دونوں بچے سکول تھے۔

منیرہ نے آتے ہی دونوں کے کھلونوں کا پوچھا "بھول تو نہیں گئے آپ؟ لائے ہیں نا دونوں کی چیزیں ؟"

مجید کو دکان کا مال امید سے بڑھ کر سستے داموں ملا تھا۔ اسی خوشی میں وہ منیرہ اور بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لایا تھا۔ عامر کے لیے تو کافی چیزیں تھیں۔ آصف کے لیے بھی چند چیزیں زائد ہی لیتا آیا تھا۔ شاید منیرہ کا خیال تھا۔ ورنہ آصف تو اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

مجید نے بکس کھولا۔ چیزیں نکالنا شروع کیں۔ منیرہ خوشی سے پھولی نہ سماتی اس کے لیے ڈھیروں کپڑے، خوبصورت جوتے، پیارے پیارے رنگ کے دو سویٹر۔

"اتنے پیسے آپ نے خواہ مخواہ خرچ کر دیئے۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"پرواہ نہ کرو بیگم! تین ہزار کا منافع ہے اس مال میں۔ تین ہزار کا۔ ہم نے کہا بیگم کیا یاد کرے گی عید کروا دیں گے۔" مجید کا موڈ بڑا خوش گوار تھا۔

"پیسہ بچا کر رکھنا چاہیئے۔ زمین خریدیئے۔"

"وقت پر سب کچھ ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ انسپکٹر راشد سے دوستی یونہی تو نہیں گانٹھی میں نے ــــ دیکھتی جاؤ۔ بڑا فائدہ پہنچائے گا زمین کیا۔ شاندار بنگلہ بنے گا۔"

دونوں کافی دیر باتوں میں مشغول رہے۔ نہا دھو کر مجید کچھ دیر کے لیے آرام کرنے کو بستر میں جا لیٹا۔ تھکا ہوا تھا نیند آ گئی۔

بچوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

آصف و عامر بستے گلے ہی میں لٹکائے مجید کے بکس پر پل پڑے تھے۔ منیرہ دونوں کو کپڑے پہننے کا کہہ رہی تھی۔ لیکن اپنی مطلوبہ چیزوں کی لگن سے دونوں دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز تھے ــــ مجید اٹھ بیٹھا۔

"دیکھو تو کس طرح تلاشی لے رہے ہیں۔ عامر بیٹے نہ سلام نہ پیار۔"

عامر باپ کی طرف دوڑا۔ گلے سے لپٹ کر پیار کیا۔ ماں کے کہنے پر آصف نے بھی سلام کیا۔

مجید نے جواب دیا یا نہیں۔ آصف کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ تو اپنی گڑیا کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ کتنی دیرینہ خواہش آج پوری ہوئی تھی۔

مجید نے دونوں کو بستے اتار کر آنے کو کہا۔ دونوں بھاگے اور دوسرے کمرے میں چارپائی پر بستے پھینک پھر آ پہنچے۔

مجید نے بکس کھولا۔ کپڑے ایک طرف کو ہٹائے۔ اور دو بڑے بڑے ڈبے باہر نکالے ــــ بچے جھپٹے۔

"آرام سے بیٹھو۔ نہیں تو ایک چیز بھی نہ ملے گی!"

دونوں گھٹنے ٹیک کر فرش پر ہی بیٹھ گئے۔

"اس وقت تو جو دل چاہے ان سے منوا لیں۔" منیرہ بچوں کی فرماں برداری پر ہنسی۔

"کس طرح سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح کہنا مان رہے ہیں۔"

"ایک شرط پر گڑیا ملے گی آصف میاں!" مجید نے ڈبے سے رسی کھولتے ہوئے کہا۔

آصف اس کا منہ دیکھنے لگا۔

"کوئی شرارت نہیں کرو گے ــــ" مجید نے اسے کرخت نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"جب بھی تم نے تنگ کیا۔ گڑیا واپس لے لوں گا۔ سمجھے! کبھی ضد کی۔ عامر کو مارا۔ یا ہمیں تنگ کیا۔ تو بس گڑیا واپس۔"

آصف کا رنگ یوں اڑ گیا۔ جیسے مجید نے اس کا کلیجہ نکال لینے کی دھمکی دی ہو۔ بڑی بے چارگی سے اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ گڑیا سے اتنا شدید لگاؤ۔ ماں کے علاوہ مجید بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مجید نے ڈبے کھولنا شروع کیے۔ بچے مجسم اشتیاق بنے بیٹھے تھے۔

"آہا ہماری ریل گاڑی۔" عامر اٹھ کر ناچنے لگا۔

مجید نے گول دائرے میں چھوٹی سی ریل گاڑی کی پٹڑی جوڑ کر بچھائی۔

ریل کے ڈبے اور چھوٹا سا انجن لائنوں پر رکھ کر چابی گھمائی۔

ننھی منی ریل گاڑی چھک چھک لائنوں پر دوڑنے لگی۔ عامر تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ آصف ابھی شوق سے ریل گاڑی دیکھنے لگا۔

گاڑی چکر لگانے کے بعد رک گئی۔ تو مجید نے اس کی چابی عامر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

ذرا احتیاط سے چلایا کرنا۔ پیچ ٹوٹ گیا تو پھر یوں نہیں دوڑے گی۔"

عامر اپنی ریل گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

یہ لو موٹو میاں۔ تمہاری گڑیا۔" مجید نے بڑا سا ڈبہ کھولا۔

اُف ——! آصف کی حالت دید کے قابل تھی۔ فٹ بھر لمبی گڑیا۔ پیاری پیاری آنکھیں چمکتے ہوئے بال، سرخ سرخ مسکراتے ہونٹ۔

آصف نے گڑیا کو یوں سینے سے لگا لیا۔ جیسے صدیوں سے بچھڑا آج یوں اچانک ملا ہو۔ اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو گیا۔

"اسے لٹاؤ تو سو جائے گی۔" مجید نے کہا۔

آصف نے گود میں گڑیا لٹائی۔ گڑیا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"اب اٹھاؤ۔ جاگ جائے گی۔"

آصف نے گڑیا سیدھی کی۔ گڑیا ٹک ٹک دیکھنے لگی۔

آصف نے گڑیا سینے سے لگا لی۔

عامر نے گڑیا دیکھی۔ جانے کیوں ریل گاڑی کے مقابلے میں اسے یوں سونے جاگنے والی گڑیا اچھی لگی۔

"میں گڑیا لوں گا۔ اس نے ریل گاڑی کی چابی باپ کی طرف پھینک دی۔

منیرہ اور مجید دونوں نے عامر کی طرف دیکھا۔ وہ گاڑی کی پٹڑی کو دھکیل رہا تھا۔ وہ روٹھ گیا تھا۔

"نہیں بیٹے —— آپ نے ریل گاڑی منگوائی تھی۔" منیرہ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہاں عامی۔ ویسے تھوڑی دیر کے لیے تم بھی دیکھ لو۔ دکھاؤ آصف ——"

لیکن آصف نے گڑیا کو سینے سے بھینچ لیا۔

"دکھاؤ نا ذرا ——!" مجید کا لہجہ تلخ تھا۔

"دکھا دو بیٹے، بھائی کو تھوڑی دیر کے لیے۔" منیرہ نے پیار سے کہا۔

"میں ریل گاڑی نہیں لیتا۔ گڑیا لوں گا۔" عامر زمین پر لیٹ گیا۔

پھر اچھی خاصی کش مکش شروع ہو گئی۔

"نہ آصف گڑیا دیتا۔ نہ عامر ریل گاڑی لیتا۔ مجید نے عامر کو پیار سے سمجھایا۔ بازار سے ویسی ہی گڑیا لا دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن عامر تو یوں مچلا جیسے یہی گڑیا نہ ملی تو دم ہی نکل جائے گا۔

کچھ دیر تو دونوں پیار سے بچوں کو بہلاتے اکساتے رہے لیکن عامر نے جب بہت واویلا کیا تو مجید نے آصف سے گڑیا چھین کر عامر کو دے دی۔

"چلو تمہارے لیے اور لے آئیں گے —— یا ابھی عامر بہل جائے گا تو لے لینا۔

"واہ جی میں نہیں دوں گا۔" عامر تیزی سے بولا۔

"نہیں دو گے بچہ۔" آصف پر دیوانگی کا جیسے دورہ پڑا۔ منیرہ ہانپتے کانپتے آصف کو تھام نہ لیتی۔ تو وہ شاید عامر کا گلا ہی دبا دیتا۔ عامر باپ کی گود میں جا چھپا۔

آصف کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔ منیرہ اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ پیار سے اسے سمجھانے لگی لیکن آصف کی روح تو گڑیا میں اٹکی تھی۔

گڑیا جس پر —— عامر ملکیت جمائے بیٹھا تھا۔

ماں کھانا نکالنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ آصف اسی کمرے میں واپس پہنچا۔ عامر گڑیا کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

"دے دو میری گڑیا!"

"نہیں دیتا — ریل گاڑی لے لو۔"

"دیتے ہو یا نہیں؟"

آصف نے گڑیا چھیننے کی کوشش کی۔ عامر چیخا۔ مجید اور منیرہ دونوں دوڑے آئے۔ آصف غصے سے نیلا پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت مخدوش تھی۔

منیرہ اور مجید نے بیچ بچاؤ کرایا۔ دونوں ہی پریشان تھے۔ مجید نے بہلا پھسلا کر عامر سے گڑیا لے لی۔

"چلو اسے یہاں رکھ دیتے ہیں پہلے کھانا کھا لو پھر فیصلہ کریں گے۔" اس نے گڑیا مینٹل پیس پر رکھ دی۔

"گڑیا میری ہے" آصف بولا۔

"گڑیا میں لوں گا" عامر رونے لگا۔

"اچھا بھئی تم ہی لینا۔ آصف کو دوسری لا دیں گے۔"

"میں یہی لوں گا —"

"میں نہیں دوں گا۔ بس نہیں دوں گا۔" عامر روتے روتے بے حال ہوا جا رہا تھا۔

"آصف اب بک بک نہ کرو۔ تمہیں اور لا دیں گے۔ یہ عامر کی گڑیا ہے۔ اب شور مچایا تو دو چار تھپڑ ہی پڑیں گے۔ گڑیا نہ ہوئی مصیبت ہو گئی۔ بس عامر اب تم بھی چپ ہو جاؤ۔ گڑیا تمہاری ہو گئی۔ چلو کھانا کھا لو۔ پھر کھیلنا گڑیا سے۔"

منیرہ مجید کے اس فیصلے سے جز بز ہو گئی۔ آصف کا چہرہ اس سے دیکھا نہ گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت وہ سمجھ تو نہ سکی۔ لیکن محرومیت کے واضح سائے دیکھ کر اس کا دل کڑھنے لگا۔ وہ مجید کے ساتھ باورچی خانے کی طرف گئی۔ مجید رومال سے عامر کا چہرہ صاف کرنے اسے دلاسا دینے لگا۔ گڑیا بالکل تمہاری ہے۔ آصف کو ہاتھ بھی نہ لگانے دینا۔

بے شک۔ "لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے کھانا کھا لو۔" بیٹھ جاؤ میرے پاس۔"

آصف کمرے ہی میں کھڑا رہا۔ اس کی حالت دید کے قابل تھی۔ آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔

وہ گھور گھور کر گڑیا کو دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ محرومی اور ناکامی نے اس کے ذہن میں آگ سی لگا دی۔ اس کی گڑیا عامر کو دے دی گئی تھی۔ اس کی گڑیا — عامر کو اس کی گڑیا — عامر کو — وہ غم و غصہ سے دیوانہ سا ہو گیا — اور پاگلوں کی طرح گڑیا پر ٹوٹ پڑا۔ اسے اٹھایا۔ اور پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ مسالے کی گڑیا اس ضرب سے ٹوٹ گئی۔ وہ چند لمحے ششدر سا گڑیا کے بکھرے ٹکڑے دیکھتا رہا۔ لیکن اسی پر اس کا غصہ بس نہ ہوا۔ بکس کے نیچے رکھی اینٹ گھسیٹ کر نکالی اور پورے زور سے گڑیا کا سر کچل دیا۔ اس کی ٹانگیں اور بازو جدا کر دیے۔ اس کا لباس تار تار کر کے نوچ ڈالا۔ گڑیا کو تباہ و برباد کر کے وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

اس کام سے ابھی وہ فارغ ہو کر کمرے سے باہر بھی نہ نکلا تھا۔ کہ مجید اور عامر کمرے میں آ گئے۔

گڑیا کا یہ حشر دیکھ کر دونوں کے رنگ فق ہو گئے۔ چند لمحے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ دونوں، کبھی گڑیا۔ ٹوٹی ہوئی گڑیا۔ اور کبھی آصف کو دیکھتے رہے۔

"یہ کیا کیا تم نے — وحشی — جانور —!" ایک دم مجید پھٹ پڑا۔

عامر اونچی آواز سے رونے لگا۔ پھر وہ زمین پر لوٹنے لگا۔ مجید چیختا چنگھاڑتا غصے سے تلملاتا۔ پیچ و تاب کھاتا ٹوٹی پھوٹی گڑیا پر جھک گیا۔

آصف کو آج اسے طیش میں دیکھ کر مطلقاً ڈر نہ لگا۔ بلکہ غصے سے تلملاتا۔ پیچ و تاب کھاتا — اذیت سے بلبلاتا۔ مجید اور زمین پر صدمے سے نڈھال ہو کر روتا عامر دونوں اس کی ذہنی تسکین اور روحانی سکون اور اطمینان کا جیسے باعث بن گئے۔

ایک انوکھے اور کیف زا سرور سے ، اس کی روح جھوم اٹھی۔
مدتوں کی بے چینی کو جیسے چین مل گیا۔
اس کا جی چاہا۔ وقت یہیں تھم جائے ۔ اور وہ دونوں کی ترلیپ سے یونہی حظ اٹھاتا رہے۔

منیرہ بھی آگئی۔ مجید گرجا برسا۔ آصف کی خوب پٹائی ہوئی۔ لیکن سرور و لذت کا وہ انوکھا احساس اس کے ذہن میں جاگزین ہو گیا۔ مار کھانے کی اذیت اس لذت کے سامنے کچھ بھی تو نہ تھی۔

محرومی، حق تلفی اور قدم قدم پر ناکامی نے دل میں جن انتقامی جذبات کو پالا پوسا تھا۔ آج شاید ان کی تسکین ہو گئی تھی۔

پٹ جانے کے باوجود ــــ اس کے دل میں خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس کروٹیں لیے جا رہا تھا۔

ــــ ❊ ــــ

جب تک ناسمجھ بچہ تھا اپنی ذات، اپنا وجود، اپنی انفرادیت اور اپنی اہمیت منوانے کو الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہا۔ آصف

ماں کو مجید کا سر محبت سے دباتے جب وہ دیکھتا تو خود بھی سر درد کا بہانہ کرنے لگتا۔

"امی بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔"

"جا کر لیٹ جاؤ۔"

"نہیں امی۔ بڑا درد ہو رہا ہے۔"

ماں جھلا کر اسے چارپائی پر لٹا دیتی۔ اور زبردستی اسپرو کی ٹکیا اس کے منہ میں ٹھونس کر پانی پلا دیتی۔

"آرام سے لیٹے رہو۔ خود ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

آصف کا بہانہ کبھی کارگر نہ ہوتا۔ اس کی بھوک کبھی نہ مٹتی۔ ــــ محبت کی بھوک ــــ پیار کی بھوک۔

آئے دن کے اس قسم کے واقعات نے اس کے دل سے گھر والوں کا اعتماد چھین لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اعتماد چھنتا ہی گیا۔ تنہائی کا جان لیوا احساس اس کے حواس پر مسلط ہوتا گیا۔

اکثر اسے یہی محسوس ہوتا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ وہ تنہا ہے بالکل تنہا۔

اس کی سب حرکات کے محرک اس کے شدید ترین لاشعوری جذبے تھے لیکن کسی نے کبھی بھی ان جذبوں کے اندرونی اور بیرونی حرکات پر دھیان نہیں دیا۔

وقت گزرتا گیا — احساسِ محرومیت اس پر غالب آتا گیا۔

اور۔ جب شعور نے اسے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی پوری قوت بخشی۔

اور — وہ — عامر مجید اور اپنے رشتے کو سمجھ پایا تو باپ سے بیٹے کی نفرت سنگین ہو گئی — یہ نفرت دل کے ہر گوشے میں میل بن کر جم گئی۔ گھر اور اس کے مکینوں سے وہ قطعی طور پر بیزار ہو گیا۔

کسی کا خوشی، کسی کے غم کا اسے احساس ہی نہ رہا۔

عامر اس کے سامنے کیلے کے چھلکے سے پھسلا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ لیکن اسے دکھ درد کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ بلکہ روح کی گہرائیوں میں اک انوکھا سا سرور اترتا محسوس ہوا۔

اور — جب مجید زخمی بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپا۔ تو خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس اس کے دل میں کروٹیں لینے لگا۔

وہی احساس — جو گڑیا کو توڑنے پر مجید اور عامر کی تڑپ دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ مجید بیمار پڑ گیا۔ سردرد کا شدید ترین دورہ پڑا۔

اسے درد سے تڑپتا دیکھ کر اس کا دل کبھی نہ پسیجا۔ اس نے ایک بار بھی مجید کی احوال پرسی نہ کی — ماں کی منت سماجت کے باوجود ہمدردی کا ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جس اذیت سے اسے خوشی ملتی تھی۔ اس کے لیے وہ ہمدردی کے الفاظ کہاں سے لاتا۔ ماں سے اسے وہ لگاؤ اور محبت نہ رہی تھی جو اک بیٹے کو ہونی چاہیئے۔ ہاں وہ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ضرور سہم جاتا۔

شاید — ان آنسوؤں کا — اس کی بیوگی کے اس دور سے بھی واسطہ تھا۔ جب وہ آصف کو بھرپور پیار دیا کرتی تھی۔ روتے ہوئے گلے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کرتی تھی۔

تلخیٔ حالات نے اس سے ہمدردی کی حس ہی چھین لی تھی۔ گھر والوں سے اسے

ہمدردی رہی تھی نہ لگاؤ۔ ہاں انہیں تکلیف میں دیکھ کر اس کی روح میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ خوشی کا احساس جاگ اٹھتا۔

اور — وقت کے ساتھ ساتھ یہ گدگدی اور یہ احساس شدید ہوتا گیا۔

وہ خود ایسے مواقع پیدا کرنے لگا۔ جن سے اس کے اس احساس کی تسکین ہوتی —

سکول میں آصف کا کردار بالکل مختلف تھا۔ عامر کے سوا اسے سکول کے ہر فرد سے انس تھا۔ عامر اور وہ دو غیر اور بیگانہ بچوں کی طرح ایک درجے سے دوسرے درجے میں منتقل ہوتے رہے۔ آصف قدرتی ذہین تھا۔ اس لیے ہر بار عامر کو وہ کئی نمبروں پر پیچھے چھوڑتا۔ کلاس میں جتنی ہی اسے اہمیت ملتی۔ گھر میں اتنی ہی اذیت۔ زیادہ نمبر پانے کے باوجود گھر میں کبھی کوئی حوصلہ افزائی نہ کرتا۔ ماں بھی جانے کن مصلحتوں کے پیشِ نظر عامر ہی کی دلجوئی کرتی۔

شاید آصف کی نازیبا حرکات نے ممتا پر بھی پتھر کی سل رکھ دی تھی۔

گیارہ بارہ سال کی عمر کو پہنچ کر آصف بالکل چپ چاپ ہو گیا۔ گھر میں بے تعلق اور بے گانہ سا رہنے لگا۔ اب وہ ضدیں کرتا — نہ اکھڑ لیتا۔ گفت و گو بھی بہت کم کرتا وقت کے ساتھ ساتھ یہ انقلاب آیا۔

ماں نے جیسے سکھ کا سانس لیا — ماں بھی مطمئن ہو گئی۔

لیکن — بچے کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ اس سے دونوں بے خبر تھے۔

آصف اپنے گرد و پیش سے بے خبر تصورات کی دنیا میں کھویا رہتا۔ اسے جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادت ہو گئی۔

اکثر یوں ہوتا۔ کہ وہ سکول کا کام کرنے بیٹھا ہے۔ کتاب گھٹنوں پر کھلی رکھی ہے لیکن وہ سر کرسی کی پشت سے لگائے گھٹنوں چھت کی طرف دیکھ رہا ہے۔

اسے چھت نظر نہیں آتی۔ بلکہ عدالت دکھائی دیتی ہے۔ جہاں وہ جج کی کرسی پر بدستور تمکنت بیٹھا ہے۔ مجرموں کے کٹہرے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ وہاں مجید اور عامر پابہ زنجیر کھڑے ہیں۔

دونوں ہاتھ باندھ باندھ کر اس سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔
لیکن ـــ اس کا دل نہیں پسیجتا۔ وہ سزا کا حکم سناتا ہے۔ شہر کے چوک میں سولی پر لٹکا دینے کی سزا۔

باپ بیٹا موت اور بے عزتی کے خوف سے پیلے پڑ جاتے ہیں۔ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جاتے ہیں ـــ لیکن ـــ وہ
دونوں کو پائے استقار سے ٹھکراتا کرسی سے اٹھکر چل دیتا ہے۔

یہ تصورات اور دن کے خوابوں کی دنیا بڑی سہانی تھی۔ آصف کی بے چین روح کو ان سے بڑا سکون ملتا۔ کبھی وہ خلا میں گھورتا۔
تو اسے اک عالی شان محل نظر آتا۔ جگ جگ مگ کرتا محل۔ بے شمار کمرے والا۔ آرائشی سامان سے بھرا ہوا محل۔ جس کے خوبصورت گیٹ کے سامنے لمبی سی موٹر کھڑی ہوتی۔

آصف اک شانِ تفاخر سے گیٹ سے نکلتا اور موٹر کی طرف بڑھتا۔
ناگاہ اس کی نگاہ ایک فقیر پر پڑتی۔ جو چیتھڑے لٹکائے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف گڑگڑاتے ہوئے آتا۔
"کچھ دے دو سرکار۔ کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ بیٹا بیمار پڑا ہے۔ دوائی کے لیے پیسہ نہیں۔"

آصف جیب سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا نکالتا۔ لیکن جب اس کی نظر فقیر کے چہرے پر پڑتی۔ تو وہ شعلۂ جوالا بن جاتا۔
وہ چہرہ مجید کا ہوتا۔
"دھکے دے کر نکال دو اسے۔" وہ چیخ کر اپنے درجنوں نوکروں کو حکم دیتا۔
باوردی نوکر آتے۔ اسے دھکے دیتے۔ گھونسے مارتے۔ لاتیں لگاتے۔ ٹھوکریں

لگاتے لے جاتے۔ وہ روتا چیختا، چلاتا ـــ اور آصف کے دل میں وہی خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس کروٹیں لینے لگتا۔

لیکن ـــ تصورات کے سہارے مجید کو ذلیل کرنے۔ گھر سے بے تعلق اور بیگانہ ہو جاتے اور سکول میں توجہ پیار و خلوص پانے کے باوجود اسے اپنی زندگی میں اک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔

اور سکول میں توجہ پیار و خلوص پانے کے باوجود اسے اپنی زندگی میں اک خلا سا محسوس ہوتا تھا ـــ خلا جو سکول کی خوش گوار فضا سے بھی پُر نہیں ہوا تھا۔ جو مجید کو تنگ کر کے بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔

جو ماں سے بے تعلقی ظاہر کر کے بھی نہیں بھر پاتا تھا۔ جو عامر سے لاتعلقی برت کر بھی ختم نہیں ہوتا تھا ـــ اور ـــ جو دوستوں کی خوش گوار صحبتوں سے بھی نہیں بھرتا تھا اور جو تنہائی کے خاموش لمحوں سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔

بے چینی، بے قراری اس کی روح پر مسلط تھی۔ غیر محفوظ ہونے کا احساس دن بدن شدید ہو رہا تھا۔

اس کی زندگی اس خزاں رسیدہ درخت کی مانند تھی۔ جس پر کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ جس کی کوئی شاخ ہری نہیں ہوتی۔
ٹنڈ منڈ درخت جس کی ننگی شاخیں ادھر ادھر پھیلی رہتی ہیں۔

ـــ ۷ ـــ

کا نتیجہ نکلا — آصف و عامر دونوں کامیاب ہو گئے — آصف نے میٹرک اعلیٰ فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اور عامر بمشکل یہ درجہ حاصل کر سکا۔ عامر کے چہرے کا متغیر اور پھیکا رنگ دیکھ کر آصف کو خوشی ہوئی۔ اپنے نمبروں کو دیکھ کر وہ یقیناً اس طرح خوش نہیں ہوا تھا۔

"مبارک ہو عامر — پاس ہو گئے۔" اس نے چبھتے لہجے میں مسکرا کر کہا۔

عامر جل بھن گیا۔ گھور کر اسے دیکھا۔ اور سست قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ آصف بھی اس کے ساتھ ساتھ گھر گیا۔ دونوں میں بہت کم بات چیت ہوتی تھی لیکن آج آصف اس سے خواہ مخواہ باتیں کیے جا رہا تھا۔ کنکھیوں سے اس کا پھیکا پھیکا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر ہنسی بھی آ جاتی تھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے چپ چپ کیوں ہو؟"

"پاس ہو گئے ہو خوشی مناؤ!"

"مبارک کا جواب بھی نہیں دیا۔"

وہ خوشی سے طنز کر کے خوش ہوتا رہا — لیکن گھر پہنچتے ہی اس کا موڈ بدل گیا۔ سنگین سی خاموشی نے شوخیوں کو ڈھانپ لیا۔

مجید گھر پر ہی منتظر بیٹھا تھا — منیرہ بھی سراپا انتظار تھی۔ صحن میں بچھے تخت پر بیٹھے دونوں نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ منیرہ کبھی بار بار گلی والی کھڑکی میں جھانک آتی تھی۔ ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔

آگے آگے عامر اور پیچھے پیچھے آصف سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں آئے۔

"کہو کیا خبر لائے؟" بے تابی سے اٹھ کر مجید نے عامر ہی سے پوچھا۔

"پاس ہو گیا ہوں۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

"تمہاری ڈویژن؟" ماں نے پوچھا۔

"فسٹ — عامر سے ایک سو بیس نمبر زیادہ ہیں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"میرے لال؟" منیرہ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر آصف سے لپٹ گئی۔ اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔

آصف کو شاید اس پیار کی توقع نہ تھی۔ یا اس پیار کا دکھاوا سمجھ رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ عامر کو باپ سینے سے لپٹا کر تسلی دے رہا تھا۔

"کوئی ہرج نہیں۔ تم نے اتنے نمبر لیے میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں۔ آصف کے نمبر زیادہ ہیں تو کیا ہوا۔ تم سے سال ڈیڑھ بڑا بھی تو ہے۔ ایف اے میں خوب محنت کرنا — پھر دیکھا جائے گا۔"

ماں برابر اپنے بیٹے کو پیار کیے جا رہی تھی۔ آصف کو گھر کے کسی فرد پر اعتماد تھا ہی نہیں۔ اس پیار کو سچا کیوں کر سمجھ لیتا۔ وہ بے حس سا کھڑا رہا — اور اپنی پوری توجہ مجید اور عامر کی طرف مبذول رکھی۔

لیکن — جب اس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ کون جانے یہ خوشی کے آنسو تھے — یا کوئی بھولی بسری یاد۔ کڑوے کسیلے دھوئیں کی طرح آنکھوں کے دریچے میں سمٹ آئی تھی۔

آصف ماں کے آنسوؤں سے بے تاب ہو گیا۔

جانے ان آنسوؤں کی لرزش نے لاشعور میں دبے کن واقعات کو دھچکا لگایا۔

"ماں!" آصف بے تاب ہو کر ماں سے لپٹ گیا۔

ماں بیٹے کا والہانہ پیار مجید اور عامر دونوں کو نہ بھایا۔ یوں بھی آصف کے نمبروں سے دونوں جل گئے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ کمرے میں آ گئے۔

کچھ دیر بعد منیرہ کو ان کے جاگنے کا احساس ہوا۔ تو وہ آصف کو وہیں چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔

"عامی بیٹے مبارک ہو تمہیں بھی ——" اس نے عامر کو بھی لپٹا لیا لیکن پیار کے اظہار میں وہ گرمی نہ تھی جو آصف کو پیار کرتے وقت تھی۔ جواباً عامر کا رویہ بھی خنک تھا۔ رسمی طور پر دونوں بغل گیر ہوئے۔

"فکر نہ کرو بیٹے۔" منیرہ نے کہا۔ "تمہاری یہ شان کیا کم ہے۔ کہ اتنی چھوٹی عمر میں میٹرک پاس کر لیا۔

"وہی تو میں کہتا ہوں۔ پندرہ سولہ سال کیا عمر ہے۔ پھر بھی کافی نمبر ہیں۔ ایف اے میں خوب محنت کرنا۔"

عامر کی جس طرح دلجوئی ہو رہی تھی۔ وہ آصف کو دکھ دینے کو کافی تھی لیکن ان باتوں کا وہ اب عادی ہو چکا تھا۔ مجید نے اسے مبارک تک نہ کہی تھی۔ اس کا اسے ملال ضرور تھا۔ دونوں نے ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔

عامر انجینئر بننا چاہتا تھا۔ آصف کو انجینئرنگ سے کوئی خاص دلچسپی تو نہ تھی۔ لیکن عامر کو پچھاڑنے کی حس اپنا کام کر رہی تھی۔ اس لیے اس نے بھی ایف ایس سی میں وہی مضمون لیے جو عامر کے تھے۔

دو سال وقت کی گردش میں لپٹتے اور گزر گئے۔

آصف اور عامر نے ایف ایس سی پاس کر لیا۔ نتیجہ حسب سابق ہی تھا۔ کہ خلاف توقع دونوں ہی کو انجینئرنگ میں داخلہ نہ ملا۔ عامر کا تو داخلے کا سوال ہی نہ تھا۔ ہاں آصف کو اپنی ڈویژن اور نمبروں کی وجہ سے کافی امید تھی۔ اس نے دوڑ

دھوپ بھی کافی کی۔

لیکن چند نمبروں کے چکر نے اسے چکرا کے رکھ دیا۔ سیٹیں پُر ہو گئیں۔ اسے داخلہ نہ مل سکا۔ عامر اور مجید کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ آصف مجبور ہو گیا۔

پھر دونوں بی ایس سی میں داخل ہو گئے۔

ان دنوں مجید کا کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ وہ ہیرا پھیری اور بلیک مارکٹنگ کا گُر جان گیا تھا۔ انسپکٹر ارشد کی جگہ اب انسپکٹر اکبر خاں سے خوب دوستی تھی۔ یہ دوستی بھی رنگ لائی۔ نذرانے کے علاوہ اب اسے کاروبار میں باقاعدہ حصہ دینے لگا۔ چند ہی سالوں میں وہ شہر کے بڑے کیمسٹوں کی فہرست میں آ گیا تھا۔ کاروبار دن بدن پھیلتا جا رہا تھا۔ منافع کی شرح بھی بڑھ رہی تھی۔ اکبر خاں بھی ہاتھ رنگ رہا تھا اور مجید کے بھی عیش ہو رہے تھے۔

جلد ہی اک نئے خوبصورت بنگلے کے لیے سرمایہ جمع ہو گیا۔ منیرہ بھی خوش تھی۔ وہ نئے گھر کی لگن میں مگن تھی۔ زمین خریدی گئی اور بنگلہ بننا شروع ہو گیا۔

دن ابھرتے رہے —— شامیں ڈوبتی رہیں ——

مجید، عامر اور آصف نفرت کی ٹھنڈی ٹھنڈی دیواروں کا احاطہ کیے اپنے اپنے کاموں میں مگن رہے۔ گھر کی فضا پُرسکون تھی۔ اتنی پُرسکون کہ جو بعض اوقات طوفانوں کا پیش خیمہ بھی بن جاتی ہے۔

عامر کو انجینئر بننے کا شوق تھا۔ داخلہ نہ مل سکنے سے یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی لگن مٹی نہیں۔ آصف بھی انجینئر بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ اس کا نظریہ متفرق تھا۔ وہ تو انجینئر بن کر اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کی سوچ رہا تھا۔ باوقار زندگی کا خوش گوار تصور تھا۔

لیکن —— دونوں کی مُراد بَر نہ آئی۔

تھرڈ ڈویژن پاس کر کے دونوں فورتھ ائیر

اپنی دونوں عامر کو باہر جانے کا خیال آیا۔ باپ کے پاس روپیہ بھی کافی تھا اور وہ امریکہ جا کر اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل بھی کر سکتا تھا۔

اپنا ارادہ اس نے باپ پر ظاہر کیا۔

"چار سال کا کورس ہے۔ ابا جان۔ میری مدتوں کی خواہش ہے۔"

"لیکن چار سال ——"

"کیا ہوا پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔ خرچے کے لیے بھی آپ کو زیادہ تنگ نہیں کروں گا وہاں ساتھ کام بھی کروں گا اور پڑھوں گا بھی۔"

"نہیں عامی! خرچے کی کیا بات ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس۔ تمہیں تردد کی ضرورت نہیں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ چار سال بہت لمبا عرصہ ہے تمہیں چند گھنٹے نہ دیکھوں تو قرار نہیں آتا۔ اتنی مدت!"

باپ کی محبت قابلِ احترام تھی لیکن عامر باہر جانے کے لیے مچل گیا۔

"بہنوں سے صلاح کر لو۔" مجید نے کچھ کچھ رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

اور پھر —— کئی دن صلاح مشورے ہوتے رہے۔

آصف بھی سنتا رہا۔ اس کا دل بھی باہر جا کر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مچلا۔ وہ عامر سے زیادہ قابل تھا۔ ہمیشہ اس سے زیادہ نمبر لیے تھے۔

عامر کے باہر جانے کی صلاح جب پختہ ہو گئی۔ تو دبی زبان سے آصف نے بھی ماں سے اپنی خواہش ظاہر کی۔

مجیبہ رماں اس کی خواہش کو کیوں کر پورا کرتی۔ وہ تو شروع دن ہی سے مجید سے ڈر گئی تھی۔ اب تک اس سے ڈرتی تھی۔ یہ بات زبان پر کیوں کر لاتی۔

"مجھے صرف جانے کا کرایہ چاہیئے۔ وہاں کی فکر نہیں۔ مجھے دن رات کام کرنا پڑے تو کروں گا۔ صرف ایک دفعہ یہاں سے جانے کا بندوبست ہو جائے۔"

ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے منیرہ نے آصف کی خواہش کا ذکر مجید سے کیا۔

مجید نے حیرت سے منیرہ کو یوں دیکھا۔ جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

"اسے صرف کرایہ چاہیئے۔ باقی اخراجات وہاں خود ہی پورے کر لے گا۔"

منیرہ نے منت سے کہا۔

"میں کوئی خزانہ لیے تو نہیں بیٹھا۔" وہ غصے سے بولا۔

"دو چار ہزار کی بات ہے۔ آپ کے پاس اللہ کے فضل سے!"

"میرے پاس ہے تو اس کے لیے نہیں۔ اسے ایسا ہی باہر جانے کا شوق ہے تو اس کے باپ کی کوئی رکھی رکھائی پونجی ہے تو بھجوا دو۔"

وہ بڑبڑ کرتا رہا اور منیرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ گھبرا کر وہ شوہر کا منہ دیکھنے لگی۔

"اتنا کیا کم ہے۔ کہ اسے پال پوس کر پڑھا لکھا دیا۔"

منیرہ چپ کی چپ رہ گئی۔ مجید کا جواب آصف نے بھی سن لیا تھا۔ اس کے جوان خون میں طنز سے کھولن سی ہونے لگی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے مجید نے پال پوس کر پڑھا لکھا کر کسی بھکاری کو بھیک دی ہو۔ اس کے ذہن میں لگے چرکوں سے نئے سرے سے خون رسنے لگا۔

نفرت ۔ بے انتہا نفرت۔ ایسی نفرت جس کے اظہار پر اب تک وہ حتی الوسع قابو پائے ہوئے تھا۔ اب قابو سے باہر ہونے لگی۔

عامر باہر جانے کی تیاریوں میں خوشی خوشی لگ گیا۔ باپ نے بھی کھلے دل سے مدد دی۔ بہنیں بھی پھولی نہ سمائیں۔ سب کو بچھڑنے کا غم تو تھا لیکن مستقبل کے روپ کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ سب خوش بھی تھے۔

اور —— آصف یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا۔ غم اور غصے کے جذبے طوفان بنے جا رہے تھے۔ مجید کو خوش دیکھ کر جانے اسے کیوں بے چینی سی ہونے لگتی۔

وہ اس کے ہونٹوں کا تبسم اس کی آنکھوں کی مسرور چمک چھین کر اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا دینا چاہتا تھا۔

لیکن — اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

اور — عامر بذریعہ ہوائی جہاز امریکہ روانہ ہو گیا۔

اک خوش گوار مستقبل کے لیے — اک تابناک زندگی کے لیے

عامر چلا گیا — اور — آصف اپنی سبکی، توہین اور ناکامی کی آگ میں جلتا، اس کی ذہنی حالت غیر ہوتی گئی۔ قدم قدم پر ذہنی کچوکوں اور گام گام پر آرزوؤں کے خون سے وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔

اس نے عامر کو بددعائیں دیں۔ اس کا جہاز راستے میں ہی تباہ ہو جانے کی بڑی بڑی منتیں مانیں — لیکن — کچھ بھی تو نہ ہوا۔

عامر بخیریت اپنی منزلِ مقصود پر جا پہنچا اور اس کے پہنچنے کی اطلاع بھی آ گئی۔

ایئر میل کا لفافہ جب مجید خوشی خوشی لے کر گھر آیا تو آصف کی حالت دید کے قابل تھی، یہ نیلا لفافہ اس کے ذہنی تناؤ اور عصبی کھچاؤ کا باعث بن گیا۔

بمشکل اس نے اپنے تلملاتے جذبات پر قابو پایا۔ لیکن اسے تسکین نہ مل سکی۔ گھر سے بیگانہ تو پہلے ہی تھا۔ اب قطعاً بے تعلق ہو گیا۔ سگریٹ بے تحاشہ پینے لگا۔ رات گئے تک آوارہ بھٹکتا پھرتا۔

سگریٹ کے کڑوے کسیلے دھوئیں میں بھی تلخیٔ حالات کم نہ ہوئی۔ تو وہ اس سے زیادہ نشے کا طلب گار ہوا۔

اور — شاید اس کے بہکے قدم اس گھناؤنی دلدل میں بھی جا پھنستے جہاں ایک بار پھنس کر انسان ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔

لیکن ایسے میں اسے عمران جیسے مخلص دوست کا سہارا میسر آ گیا۔ جس نے اپنی

ری اور بھرپور قوت سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس دلدل میں اترنے سے بچا لیا۔ جس میں پھنسنے کے لیے وہ رواں دواں تھا۔

عمران کی دوستی نے آصف کی کایا ہی پلٹ دی۔ اس کی پیار، محبت اور خلوص کی پیاسی روح سیراب ہو گئی۔ وہ عمران اور اس کے گھر والوں میں کھو کر رہ گیا۔

بی ایس سی کا امتحان اس نے بلا تیاری دے دیا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ حوصلہ افزا نہ نکلا۔ تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہوا۔ گھر میں سب نے فتویٰ صادر کر دیا۔ کہ یہ اس کی آوارگی کا نتیجہ ہے۔

کوئی اس کی روح کے گھاؤ نہ دیکھ سکا۔

"ہاں! عمران نے اسے سنبھالا دیا۔ پھر دوڑ دھوپ کر کے اسے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت دلا دی۔ باپ کے ٹکڑوں پر پڑا رہنے کی اسے ضرورت نہ رہی لیکن ملازم ہونے کے باوجود گھر والوں سے اس کا وطیرہ نہ بدلا۔

وہ دفتر سے سیدھا عمران کے گھر جاتا۔

چھوٹا سا گھر، جس میں عمران کی سفید بالوں والی شفیق سی ماں اپنے بیٹے ہی کی طرح اس کا پیار سے استقبال کرتی۔

جہاں عمران کی گیارہ بارہ سالہ گول مٹول سی بہن شانو اسے پورے خلوص سے بھیا کہہ کر پکارتی۔

ان سب کو آصف کے گھریلو حالات اور عمر بھر کی تلخیوں کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے زخموں پر ٹھنڈک اور سکون کے پھاہے رکھ رہے تھے۔

آصف رات گئے تک انہی کے ہاں رہتا۔ زمانے بھر کی باتیں ہوتیں مستقبل کے پروگرام بنتے۔ الجھے خوابوں کی سہانی سہانی تعبیریں ملتیں۔

آصف سکون اور خوشی کے لمحوں سے لیٹ لیٹ جاتا۔

لیکن — اپنے گھر کے اسی بیزار ماحول میں اس کا ذہنی تناؤ کچھ اور کھنچ جاتا۔ ماں بھی اس کی حرکات سے تنگ آچکی تھی — باپ پہلے ہی نالاں تھا۔ پیار و محبت کا اظہار ہوتا تو شاید آصف بھی بدل جاتا۔ لیکن اب تو اس کی نفرت سنگین سی دشمنی میں بدل گئی تھی۔ دشمنی — مجید سے دشمنی۔

مجید کو ستانے اور تڑپانے کے جیسے وہ بہانے ہی ڈھونڈتا پھرتا۔ اس بات سے اسے روحانی سکون ملتا۔

روحانی سکون۔ جادوانی سرور — اس روحانی سکون اور جادوانی سرور کے مواقع اسے اکثر ملتے ہی رہتے۔ ایئر میل کا نیلا لفافہ جب بھی اسے گھر میں نظر آتا۔ یہ موقع فراہم ہو جاتا۔

— ٭ —

شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی برفانی لہر آئی ہوئی تھی۔ سردی جس نے موسم کو ایک دم اتنا یخ کر دیا تھا۔ کہ ہر چیز ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔ شام سے تو شدت ضرورت سے زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ آصف عمران کے گھر بیٹھا تھا۔ چھوٹے سے کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازہ بھی نیم وا تھا۔ کوئلوں کی انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ لیکن پھر بھی سردی کم نہ ہو رہی تھی۔ عمران چھپینٹ کی رضائی لپیٹے بستر میں گھسا تھا۔

آصف نے موٹے اوور کوٹ کے کالر چڑھا رکھے تھے۔ کرسی پر بیٹھا وہ انگیٹھی پر ہاتھ سینک رہا تھا۔ غور سے کوئلوں پر جمنے والی راکھ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے عمران کی طرح سردی کی شدت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"کس بلا کی سردی ہے آج —؟" عمران نے میز سے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" آصف نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"چائے پیو گے؟"

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔"

"آج دفتر سے کہاں چل دیئے تھے؟ اماں شام تک تمہارے کھانے کا انتظام کیے انتظار کرتی رہیں۔"

"میں نے تم سے کہا نہیں تھا۔ کہ کھانے پر میرا انتظار نہ کیا کرو۔"

"یہ کیا بات ہوئی!"

"میں دوپہر کا کھانا کینٹین ہی میں کھا لیتا ہوں۔ کبھی گھر میں جا کر کھا لیتا ہوں۔ اس لیے میرے لیے ــــ"

"اتنے تکلف کب سے سیکھ لیے؟"۔

"تکلف نہیں عمران۔"

"کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ تم ــــ!"

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اک مبہم سی تبدیلی۔" عمران قیافہ شناسوں کی طرح اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔

آصف مسکرا دیا۔ "مجھ میں تبدیلی محسوس کر رہے ہو؟"

"ہاں ــــ"

آصف پھر ہنس دیا۔ "یہ تمہارا وہم ہے عمران۔ ورنہ میں وہی ہوں جو دو سال پہلے تھا۔"

"تو پھر دفتر سے سیدھے گھر کیوں نہیں آتے؟"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" آصف خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔

"دراصل ــــ"

لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گہری فیروزی گرم شال لپیٹے گول ڈل شانو کمرے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کاپی پنسل تھی۔

"بھیا یہ سوال سمجھا دیں۔" وہ آصف کی طرف بڑھی۔

"چائے تو لائی نہیں مشکو۔ سوال اٹھا لائی۔" آصف نے پیار سے کہا۔

"چائے امّاں بنا رہی ہیں۔"

"اور تم ــــ اماں کو کیوں تکلیف کرنے دیتی ہو۔ اتنی بڑی ہو گئی چائے بھی نہیں بنا سکتی۔" عمران اخبار دیکھنے لگا۔

اور شانو آصف سے سوال سمجھنے لگی۔

دروازہ کھلا اور سفید بالوں والی عمران کی ماں دو چائے کی پیالیاں طشتری میں رکھے اندر آ گئی۔

"ماں جی!" آصف نے ایک دم اٹھ کر چائے تھام لی۔ "آپ نے آواز دی ہوتی۔ ایسی سردی میں کیوں تکلیف کرتی ہیں آپ!"

"کوئی بات نہیں بیٹا۔ تم دونوں بھائیوں کا کام کر کے مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے تم کیا جانو۔"

"امّاں میرا کام کر کے خوشی نہیں ہوتی۔" شانو نے گلہ کیا۔

ماں عمران اور آصف ہنسنے لگے۔

"یہاں آ جاؤ ماں۔" عمران نے رضائی پھیلا کر ماں کے لیے جگہ بنائی۔ ماں دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہاں ٹھیک ہوں۔ بستر میں گھس گئی۔ تو پھر اٹھ کر جانا مشکل ہو گا۔" آصف نے چائے کی ایک پیالی عمران کو دی اور دوسری خود لے لی۔

"آپ نہیں پئیں گی؟"

"نہ بیٹا۔ چائے پی لوں تو ساری رات نیند نہیں آتی۔ ہاں آج تم کھانے کے لیے نہیں آئے؟ میں انتظار کرتی رہی۔"

عمران نے آصف کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ ماں کے اس پیار بھرے استفسار سے کھل سا گیا تھا۔

"میں نے عمران سے کہہ دیا ہے ماں جی۔ دوپہر کے کھانے پر میرا انتظار نہ کیا کریں۔"

"کیوں؟"

"امّی خفا ہوتی ہیں۔ کہ کھانا گھر پہ کھایا کرو۔"

"ماں کا کہنا مانا کرو بیٹا۔ گھر کے حالات کیسے بھی ہوں۔ وہ تو تمہاری ماں ہے۔ اللہ جانے بیچاری کتنی مجبور ہے۔ خدا کرے تمہاری گھر اور گھر والوں سے دلچسپی بڑھے۔"

ماں جی آصف کی امی سے ہمدردی جتانے لگیں۔ جس سے آصف کو ذہنی کوفت ہونے لگی اسے سارے حالات کا علم ہونے کے باوجود یہ کہاں معلوم تھا۔ کہ اس کے سامنے بیٹھا آصف اپنے گھر میں رہنے والے آصف سے کتنا تضاد رکھتا ہے۔ خوش خلق، حلیم اور فرماں بردار سا آصف گھر پہنچتے ہی کرخت، چڑچڑا اور کسی کا پاس و لحاظ نہ کرنے والا اکھڑ سا آدمی بن جاتا ہے۔

آصف کا اس میں قصور بھی کیا تھا۔ گھر اور باہر کی متضاد فضا نے اس کی شخصیت کو دو ہرا روپ دے دیا تھا۔

ماں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دعائیں دیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شانو بھی ماں کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گئی۔

عمران نے موٹی سی کتاب اٹھالی — اور — آصف اخبار دیکھنے لگا۔

کہیں دُور گھڑیال نے نو بجائے۔ آصف نے آستین ہٹا کر گھڑی دیکھی۔

اور — ساتھ ہی اس کے کانوں میں کھنکتی ہوئی آواز گونجی "میری تکلیف کا اتنا ہی خیال ہے تو جلدی گھر آجایا کیجئے۔"

اس آواز کے ساتھ ثوبیہ کا متبسم چہرہ پردے کی اوٹ سے جھانکتا دکھائی دیا۔

آصف سوچ میں کھو گیا۔ یہ نقرئی آواز اس کے کانوں میں کئی بار گونجی۔ یہ متبسم چہرہ اس کے ذہن میں کئی مرتبہ لہرایا۔

اور — جانے کیا سوچ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بھئی چلتے ہیں۔"

"کہاں — ؟"

"گھر —"

"ابھی سے ؟"

"نو بج گئے۔"

"کیا ہوا — ؟"

"نو بجے بھی تو کافی رات ہوتی ہے۔"

"یہ معمول میں تبدیلی کس خوشی میں آگئی ؟"

عمران نے جیسے آصف کے من کا چور پکڑ لیا۔ اس نے ہنستے ہوئے اخبار عمران کے منہ پر مارا۔ اور سلام کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

عمران کچھ حیران بھی ہوا۔ کچھ خوش بھی۔ کئی دنوں سے آصف بارہ ایک بجے سے پہلے گھر نہیں جا رہا تھا۔

آج نو بجے ہی اسے گھر کا خیال آگیا۔ اس کی مسکراہٹ میں خوشی کی جھلک بھی تھی عمران کو اسی خوشی سے خوشی تھی۔

خدا کرے آصف کو گھر کا ماحول راس آجائے۔ اور اس ماحول سے فرار کی راہیں ڈھونڈنے کی اسے ضرورت ہی نہ رہے۔

عمران کے دل سے دعا نکلی۔ اٹھ کر باہر کا دروازہ بند کیا اور بستر میں لیٹ کر سونے کی کوشش میں وہ زیادہ وقت آصف ہی کے متعلق سوچتا رہا۔

— ۴ —

گلی میں سناٹا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے لوگ بستروں میں گھس چکے تھے۔ کسی کسی گھر کی بتی روشن تھی اور ریڈیو سے نشر ہونے والے گیتوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔

گلی عبور کر کے وہ سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر ابھی زندگی بیدار تھی۔ چوڑی سڑک کے دورویہ بڑی بڑی دکانیں ابھی تیز برقی روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں۔ موٹریں، ٹیکسیاں، رکشے آ جا رہے تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں دن بھر کی تھکاوٹ راگ رنگ سے بھی اتر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قہوہ خانے بھی ابھی پوری طرح آباد تھے۔

آصف اوور کوٹ کے کالر چڑھائے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے گرد و پیش سے بے خبر اپنی راہ جا رہا تھا۔ بازار کی حدود ختم ہونے کے ساتھ ساتھ گہما گہمی اور رونق بھی ختم ہو گئی۔ اکا دکا راہ گیر سردی سے بچنے کے لیے تیز قدم اٹھاتے آ جا رہے تھے۔ کبھی کبھی موٹر اور ٹیکسی تیزی سے قریب سے گزر جاتی۔

آصف نئی آبادی بستی کی کچی پکی سڑک پر اتر گیا۔ چھوٹے چھوٹے خوش نما بنگلوں اور وسیع و عریض کوٹھیوں کی اس بستی پر بازار کی نسبت خاموشی کا تسلط تھا۔ بتیاں روشن تھیں اور بند دروازوں اور کھڑکیوں سے آرائی ترچھی روشنی کی لکیریں سڑک پر پڑ رہی تھیں۔ کسی کوٹھی کے بند دروازوں سے قہقہوں کی صدائیں بھی آ رہی تھیں۔ ریڈیو کے دھیمے سُروں میں گانے بھی سنائی دے رہے تھے۔ لیکن آصف کے کانوں میں تو وہی کھنکتی آواز گونج رہی تھی۔

"میری تکلیف کا اتنا ہی خیال ہے تو ذرا جلدی گھر آ جایا کیجیے نا۔" پردے کی اوٹ میں تبسم چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

صدیق کی کوٹھی سے موڑ نکلی۔ تیز روشنی سے بچنے کے لیے وہ سڑک سے نیچے اتر آیا۔ دائیں ہاتھ کی کوٹھی کے باورچی خانہ میں خانساماں دن بھر کی بچائی ہوئی رقم اور پکے ہوئے سالنوں کے چھپا کر رکھے ہوئے ڈونگے گھر لے جانے کے لیے سمیٹ رہا تھا۔

آصف سب سے بے نیاز اپنے گیٹ میں داخل ہوا۔ چمن عبور کرتے ہوئے اس نے دیکھا۔ برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ اس نے چمن عبور کیا۔

برآمدے میں پہنچا۔ بھاری بھاری بوٹوں کو برآمدے کے چکنے فرش پر زور سے مار کر بوٹوں پر پڑی گرد جھاڑی۔

دروازے کی طرف بڑھا۔ اور۔۔۔ گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔

لیکن بٹن دبانے سے پہلے ہی اسے جانے کیا ہوا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آستین ہٹا کر گھڑی دیکھی۔ ابھی نو بج کر پچیس منٹ ہی ہوئے تھے۔ وہ جھلا سا گیا۔

اسے اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ وہ آج خلافِ معمول وقت سے بہت پہلے گھر چلا آیا تھا۔ کیوں؟ کیا واقعی اسے ثوبیہ کو تکلیف سے بچانے کا خیال تھا!

اس خیال کے ساتھ ہی اس کی جھلاہٹ بڑھ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی بڑے اور سخت مقابلے میں از خود ہی شکست تسلیم کر لی ہو۔ وہ کسی نہایت کمزور اور شفیق جذبے کے سامنے جھک گیا ہو۔

اسے یوں لگا جیسے وہ حالتِ نومیت میں یہاں آ گیا ہو۔

کسی جادوگر کے عمل سے لگا بندھا یہاں آ گیا ہو۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔

اسے ثوبیہ پر غصہ آیا۔ وہ جھٹکے سے پلٹا۔

اور۔۔۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر تیزی سے صحن عبور کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

ثوبیہ — اک عام سی لڑکی اس کے حواس، اس کے اعصاب پر یوں مسلط ہو گئی ہے گی۔ اس بات کا اسے وہم بھی نہ تھا۔ لیکن آج اپنی حرکت اس کے تسلط کی غمّاز تھی۔ وہ جھنجھلا گیا تھا۔ اسے تو اس گھر کے کسی فرد پر اعتماد ہی نہ تھا کس خاموشی سے یہ اعتماد حاصل کر رہی تھی۔

"نہیں، ہرگز نہیں" زندگی بھر کے تلخ تجربے یک زبان ہو کر چیخ اٹھے اور وہ غصے نفرت اور بیزاری سے بھنبھناتا واپس چلا گیا۔

اس بات سے قطعاً بے خبر۔ کہ بند دروازے کے شیشوں سے لگی دو منتظر آنکھیں اس کے پیش از وقت آ جانے سے جگمگا اٹھی تھیں۔

اور — یوں ایک دم ٹوٹ جانے سے آنکھوں کے جلتے دیپ جیسے اک زہریلی پھونک سے بجھ کر دھواں ہی دھواں چھوڑنے لگے تھے۔

اس رات وہ ایک بجے گھر آیا — جانے کس ہوٹل میں بیٹھا کتنی بار چائے پی ڈالی۔

جب وہ واپس آیا تو حسب معمول برآمدے کی بتی بجھی تھی۔ لیکن ڈرائنگ روم کی بتی جل رہی تھی۔ گھنٹی پر ہاتھ رکھنے سے پہلے اس نے لاشعوری طور پر دروازے کے شیشے سے اندر جھانکا۔ پردہ ہٹا ہوا تھا۔

اور — کمرے کی ہر چیز صاف شفاف برقی روشنی میں نظر آ رہی تھی۔ ثوبیہ سامنے صوفے پر دو تین کشنوں کا کشنہ بنائے اور نیلا کمبل سینے پر ڈالے سکڑی سمٹی پڑی تھی۔ ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دوسرا جس میں غالباً کتاب تھی، نیچے لٹک رہا تھا۔ کتاب قالین پر آدھ کھلی پڑی تھی۔

ثوبیہ کے چہرے پر معصومیت کھیل رہی تھی۔ بال بکھر کر چہرے پر آ گئے تھے سرخ شال میں لپٹا چہرہ تمتما رہا تھا۔

ثوبیہ کے سونے کا بے ساختہ انداز اور بھرپور جوانی کی کوشش — آصف کے

اندر کا آدمی جاگ اٹھا۔ اندر کا آدمی۔

جس کے گرد حالات تقدیر اور سوچ کے اندازنے اک خول سا چڑھا رکھا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ رات بھر یونہی دروازے سے لگا کھڑا ثوبیہ کو دیکھتا رہے وہ معصومیت کے اسی انداز میں سوئی رہے۔

وہ دیکھتا رہے — اتنی دیر دیکھتا رہے۔

کہ اس کی روح کی ساری پیاس بجھ جائے۔ ساری بھوک مٹ جائے۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہی۔ خول کا جوان آدمی پھر خول میں جا چھپا۔ اب دروازے میں وہی آصف کھڑا تھا۔ جسے اس گھر کے کسی فرد پر اعتماد نہ تھا۔ کسی سے انس نہ تھا۔

ثوبیہ کو یہاں آئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ نہ ہی اس سے کسی قسم کی توقع وابستہ کی تھی۔ لیکن کچھ دنوں سے وہ اپنے آپ میں غیر معمولی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔

اس تبدیلی کو وہ اپنی کمزوری سمجھ کر خود ہی الجھ گیا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر اس نے زور سے بٹن دبا دیا۔

تند و تیز آواز سے ثوبیہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ گھبراہٹ میں گرتے گرتے بچی۔ آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا۔ آصف تیزی سے اندر داخل ہوا۔

ثوبیہ کے حواس میں آ کر دروازہ بند کرنے تک وہ اوپر جانے والی چوبی سیڑھیوں تک بھی جا پہنچا تھا۔ ثوبیہ سے بات کرنا تو درکنار، اس نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

اس کی اس بے رخی پر اور بے مروتی پر ثوبیہ کو غصہ آ گیا۔

"وحشی کہیں کا —" وہ غرائی "میں اتنی سردی میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ اور — یہ" وہ کتابیں کمبل وہیں پھینک کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اس رات اسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ غصہ فرو ہوا۔ تو وہ آصف کے متعلق سوچنے لگی۔ آصف کی اسے قطعاً سمجھ نہ آ رہی تھی۔ کل اور آج کے آصف میں کتنا فرق تھا۔ تغافل اور لاپروائی سے اس کی انا مجروح ہوئی تھی۔ اس نے انا کی تسکین کے لیے آصف کو بدھو، جاہل اور وحشی بنا ڈالا۔

لیکن اس کے باوجود دل کی خلش اور ذہن کا دھیما دھیما ہیجان رفع نہ ہوا۔

کچھ یہی حال آصف کا بھی تھا۔ خول میں مقید جوان آصف خول توڑ توڑ کر باہر نکل رہا تھا۔ ثوبیہ سے اسے کاہے کا بیر تھا۔ اس کے لہو لہان ماضی سے اس کا تعلق نہ تھا۔ اس پر اس کا اعتماد کیوں نہیں تھا۔ اسے اس رات پسینے میں اپنے بازوؤں میں لپٹی ثوبیہ بھی نظر آئی۔ دل میں اک سرد آمیز سی کسک بھی محسوس ہوئی۔

لیکن ایک نہ معلوم سا خوف، اک انجانا سا ڈر، ان سارے لطیف جذبوں کو عفریت بن کر نگلتا رہا۔

اس رات وہ چین سے سو نہ سکا۔

پچھلے پہر شاید اونگھ گیا۔ لیکن پچھلے پہر کے اونگھتے پسینے بھی ثوبیہ ہی سے متعلق رہے۔

— ۹ —

ڈھلتی ہوئی دھوپ کے آڑے ترچھے زاویے پچھلے صحن کے آخری دیوار تک اٹھ گئے تھے۔ یوں بھی ثمینہ کے بچوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ ثوبیہ کتابیں سنبھالے کمرے سے نکلی۔ صحن میں بیٹھ کر کام کرنے کا خیال تھا۔ لیکن وہاں سے دھوپ کھسکی جا رہی تھی۔ بچے بھی شور و غل مچا رہے تھے۔ بیرونی چمن میں جانے کا خیال آیا۔ لیکن ملازم لڑکے کو چائے کی ٹرے لے جاتے دیکھا۔ تو سمجھ گئی۔ کوئی آیا ہوا ہے۔

"باہر کون آیا ہے؟"

"بڑے صاحب کے تین چار دوست ہیں۔"

"ڈرائنگ روم میں ہیں یا چمن میں"؟

"چمن میں۔"

ثوبیہ کتابیں سنبھالے اوپر چلی گئی۔ اوپر صحن میں کافی دھوپ تھی۔ آصف کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دھوپ کا رخ اسی طرف تھا۔ اس لیے دیوار سے لگا چوبی تخت اس نے گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کیا۔ گرم گرم فضا بڑی بھلی لگی۔ اپنی کتابیں تخت پر رکھ کر اس نے گرد و پیش پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

سامنے عامر کا کمرہ تھا جو اس کے جانے کے بعد مقفل کر دیا گیا تھا۔ آصف کے کمرے کے ساتھ والے خالی کمرے میں دو تین چارپائیاں اور دو ایک صندوق پڑے تھے۔ صحن میں ایک پرانی کرسی اور ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ والی میز کے علاوہ یہ تخت بھی تھا۔

جس پر اس نے کتابیں رکھی تھیں۔

وہ تخت پر بیٹھ گئی۔ کمر دیوار سے ٹکا کر اس نے اپنی کتاب کھولی۔ مطلوبہ باب پڑھنے لگی۔ دو پیراگراف پڑھنے کے بعد اس نے کتاب الٹ دی۔ اور فائل گھٹنوں پر رکھ کر پین سے نوٹس لکھنے لگی۔

وہ بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کافی دنوں سے اس نے کالج کا کام دل جمعی سے نہ کیا تھا۔

کچھ دیر دھوپ میں سامنے کے رُخ بیٹھنے سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ کچھ گرمی سی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی سرخ گرم شال اتار کر دیوار پر لٹکا دی۔ کالے سویٹر کے بٹن کھول دیئے۔ اور دھوپ سے قدرے رُخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

بیٹھے بیٹھے شاید تھک گئی تھی۔ اس لیے اس نے فائل تخت پر رکھ دی۔ اور کہنیوں کے سہارے جھک کر لکھنے لگی۔ یونہی جھکے جھکے کبھی کتاب دیکھنے لگتی۔ کبھی لکھنے لگتی۔ لکھے ہوئے صفحات وہ فائل کی ڈوری سے نکال کر الگ رکھے جا رہی تھی۔ کیونکہ جھک کر لکھنے اور فائل دوہری کرنے سے ان کے خراب ہونے کا امکان تھا۔ دوسری کتاب تلے دبائے ہوئے کاغذ ہوا کی معمولی سی سرسراہٹ سے بھی پھڑپھڑانے لگتے۔

اچانک ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ پھڑپھڑاتے ہوئے صفحات اس چھیڑ سے مچل گئے اک صفحہ کتاب کی بندش کے باوجود آزاد ہوگیا۔ اور ہوا کی سرسراہٹ سے ڈولتا کانپتا فرش پر جا گرا۔

ثوبیہ جھکی ہوئی تھی۔ ایک دم اٹھی۔ صفحہ پکڑنے کو — لیکن — وہ دھک سے رہ گئی۔ صفحہ آصف کے قدموں میں تھا۔ جسے وہ جھک کر اٹھا رہا تھا۔

اس وقت اور یوں اچانک آصف کو دیکھ کر اس کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ جسم کا

سارا خون اچھل کر چہرے پر آگیا۔ کانوں کی لوئیں جلنے لگیں۔ پلکیں بار بار جھپکاتے ہوئے اس نے آصف کی طرف دیکھا۔

آصف نے خاموشی سے صفحہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

"شکریہ" بے آواز سا لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ صفحہ لے کر اس نے کتاب تلے دبا دیا۔

فائل اٹھا کر گھٹنوں پر رکھ لی اور بظاہر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ لیکن کام کیسا؟ اس کا ذہن تو اس سوچ سے نپٹ رہا تھا۔ کہ آصف آج دن کے اجالوں میں گھر کیسے آگیا۔؟

اس کے معمول کی اس تبدیلی کی محرک کیا شے تھی؟

اس کی اپنی ذات؟ کیا وہ اس کی خاطر جلدی چلا آیا تھا؟

امید و بیم کے دھندلکوں میں ڈوبتے، ابھرتے وہ اپنا قلم خواہ مخواہ فائل پر گھسیٹنے لگی۔ کئی لمحے گزر گئے۔ آصف وہیں کھڑا تھا۔ کم از کم ثوبیہ کو اس کے پلٹ جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

جھکی جھکی ٹھہری ٹھہری نظروں سے اس نے اپنے دائیں جانب دھیرے سے دیکھا آصف کے سیاہ برٹوں پر گرے وارورسڈ کی پتلون کے پائنچے نظر آئے۔

وہ اتنی دیر سے وہیں کھڑا تھا۔ اس کے اتنے قریب، اتنی خاموشی سے۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس پر ہیجانی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

گردن کو ہلکا سا خم دے کر اس نے آصف پر نظر ڈالی۔ آصف شاید اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اک لمحہ کے لیے ثوبیہ کی نظریں آصف کی حسین اور گہری گہری آنکھوں پر پڑیں۔

گھورتی ہوئی حسین اور گہری گہری آنکھیں۔

ثوبیہ نے منہ پھیر لیا اور آصف کے جوان چہرے پر مجرم کے موقعۂ وار دار

جانے والی کیفیت لہرائی۔ گھبرا کر وہ پلٹا اور سامنے کھلے آسمان پر آوارہ بادل کے ٹکڑوں کو دیکھنے لگا۔

چند جان دار سے لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ ثوبیہ کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی اس نے دھیرے دھیرے گردن موڑ کر پھر آصف کو دیکھا۔

وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

ثوبیہ نے بھرپور نظر اس پر ڈالی — چوڑی پشت اور اونچے لانبے قد والا آصف کتنا وجیہہ اور پُروقار نظر آ رہا تھا۔ چیک کوٹ سے قمیض کا سفید کالر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی تنومند گردن پر چمکتے ہوئے گھنے بال تھے۔ اس کے سیاہ چمک دار اور گھنے بال کتنے خوبصورت تھے۔

ثوبیہ پُراشتیاق نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے دل کے متلاطم جذبوں کے سامنے اعتراف کرنا ہی پڑا۔ کہ وہ اس وجیہہ لیکن وحشی سے انسان کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی ہے۔ چاہت کا درد بھرا سا احساس اس کے دل میں بے طرح مچلنے لگا۔

وہ اسی انداز میں کھڑا رہا۔ لمحوں کی خاموشی سالوں پر محیط محسوس ہونے لگی۔ ثوبیہ اس خاموشی سے الجھنے لگی۔

وقتی ہیجانی جذبے مغلوب ہو گئے تھے۔ ثوبیہ اپنے حواس میں تھی۔ آصف کے اس وقت گھر آ جانے کی خوشی سے سرشار سی ہو گئی۔ اس کا جی اس سے باتیں کرنے کو چاہا۔

"آج ایک اسی وقت بچ گیا؟" اس نے دبی لیکن صاف آواز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

آصف شاید اس پہل ہی کا منتظر تھا۔ ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ ثوبیہ کی متبسم نگاہیں دیکھ کر وہ چونکا۔

"آپ نے کچھ کہا۔؟" وہ سادگی سے بولا۔

وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کا انداز دلکش ضرور لیکن بے ساختہ نہیں تھا۔ رکا رکا

چھپا چھپا۔ محتاط سا انداز۔ ٹیڑھے میڑھے ہونٹ بناتے ہوئے — آنکھیں جھپکاتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی۔

آصف نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ابھی رات کا ایک تو نہیں بجا۔ آپ کیسے آ گئے؟" ثوبیہ نے اسی محبوبانہ انداز میں وضاحت کر دی۔ آصف کے سپاٹ چہرے کا تناؤ خود بخود ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے ہونٹ لرزے آنکھیں چمکیں۔ وہ شاید مسکرایا تھا۔

لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ ہونٹ کا دایاں کونہ دانت تلے دبا کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ مسکرایا۔ بے شک نہیں۔ لیکن اس کے چہرے پر نرم نرم شگفتہ شگفتہ سی مسکراہٹ کا عکس دیکھ کر ثوبیہ کی ہمت ضرور بندھی۔ وہ اس سے روز روز دیر سے گھر آنے اور اس پر اکھڑا سا رویہ رکھنے کے متعلق کچھ کہنے کو سوچنے لگی۔

گلہ — ! وہ گلہ ہی تو کرنا چاہتی تھی۔

"مجھے کب تک یہیں کھڑا رہنا ہوگا —؟" آصف کی آواز پر چونک کر اس نے اسے دیکھا۔ آصف نے اپنے ورداتے کی طرف اشارہ کیا۔

تب ثوبیہ کو احساس ہوا۔ کہ وہ تخت سے آصف کے کمرے کا دروازہ روکے بیٹھی ہے۔

"اوہ — ! وہ نادم سی ہو کر ایک دم تخت سے اتری۔ مجھے خیال ہی نہ رہا۔ یہاں دھوپ تھی نا اس لیے — میں —!"

آصف نے خاموشی سے بڑھ کر تخت گھسیٹا اور تھوڑا سا راستہ کمرے میں جانے کو بنا لیا۔

"اور ادھر کر دیں۔" ثوبیہ نے تخت دروازے سے بالکل ہٹانے کو کہا۔

"نہیں۔ یہ راستہ کافی ہے۔" بے تعلقی سے کہتے ہوئے وہ کمرے میں چلا گیا۔

ثوبیہ نے اک نگاہ کمرے پر ڈالی۔ کمرہ نہیں اچھا خاصہ کباڑ خانہ ہے۔

وہ تخت پر پھر بیٹھ گئی لیکن اب اس کا جی کام میں بالکل نہیں لگا۔ وہ اپنی نازک

میں لکھے ہوئے صفحات پڑھنے لگی۔

آصف اپنے کمرے سے نکلا اور بغیر اس کی طرف دیکھے نپے تلے قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ اس نے پلٹ کر اک بار نہیں دیکھا۔ اور بھاری قدموں سے سیڑھیاں بھی اتر گیا۔ سبکی کے چھپے چھپے احساس سے ثوبیہ جانے کیوں مضمحل سی ہو گئی۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی۔ کہ آصف ــــ آصف اسے دیکھنے کو کھڑا ہے۔

لیکن آصف اسے دیکھنے کو تو نہیں۔ کمرے میں جانے کو کھڑا تھا۔ سبکی کا چھپا چھپا احساس ــــ ثوبیہ دل گرفتہ سی ہو گئی۔ کتنی تو منداور جان دار امیدوں کا گلا گھٹ گیا تھا۔

آصف کیا تھا؟

پیچیدگیوں کی گتھی۔ الجھنوں کا پلندہ۔ اس نے غصے میں بھر کر اک بار پھر آصف کو بدھو۔ وحشی اور پاگل کہہ کر اپنے ہزیمت خوردہ جذبوں کی تسکین کرنا چاہی۔

لیکن یہ جذبے تو اس بدھو، وحشی اور پاگل ہی کے لیے بے کل ہوتے جا رہے تھے۔

ــــ ٭ ــــ

پچھلے پہر کی دھوپ کے آڑے ترچھے زاویے اب چھت پر بھی بے جان سے ہونے لگے تھے۔ ثوبیہ نے خنکی کے احساس کے ساتھ ہی اپنی شال کی ضرورت محسوس کی۔ سرخ شال دیوار پر ٹنگ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر شال دیوار سے اٹھائی۔ اس کے ساتھ ہی اس خیال سے کچھ نادم سی ہو گئی۔ کہ وہ آصف کے سامنے یونہی بیٹھی تھی۔

آصف کمرے سے نکل کر نیچے جا چکا تھا۔ لیکن بے خبری کے عالم میں وہ جب سے اب تک اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ لٹھے کی مسلی مسلی سی شلوار۔ گلابی پھولدار کاٹن کی قمیص، پرکالے سویٹر کے کھلے بٹن۔ بکھرے بال۔ جانے وہ کیسی لگ رہی تھی۔

وہ کچھ سوچ کر آصف کے کمرے میں چلی گئی۔ اور دائیں ہاتھ کی الماری کے بڑے سے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھنے لگی۔

مسلے مسلے کپڑوں اور الجھے الجھے بالوں کے باوجود وہ بری نہیں لگ رہی تھی۔

"اچھی تو لگ رہی ہوں نا؟" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ پھر وہ ہنس دی۔ ہنسنے میں اپنے چہرے کی ساخت دیکھی۔ پھر گردن کو دھیرے سے خم دے کر دیکھا۔ رکا رکا چھپا چھپا تبسم ہونٹوں میں چھپا کر اپنا عکس دیکھتی رہی۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی ہر اس حرکت کا اعادہ کر رہی تھی جو آصف کے اتنے قریب کھڑے ہونے پر اس سے سرزد ہوئی تھی۔

"اچھی دکھائی دے رہی تھی میں۔" جیسے اس نے آخری فیصلہ دے دیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مضمحل سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور حسرت کے سائے کانپنے لگے۔

"وہ کوئی تمہیں دیکھنے کو تھوڑا ہی کھڑا تھا۔" اس کے عکس نے اس کا منہ چڑایا۔ "وہ تو اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ دروازے میں تخت بچھا تھا۔ اس لیے کھڑا رہا۔ تو خواہ مخواہ اسے اپنی ذات سے منسوب کر بیٹھی۔

تجھے اتنا عرصہ اس گھر میں رہتے ہو گیا۔ اس نے تجھے کبھی اہمیت ہی نہیں دی۔ تو ہی اس کے پیچھے پیچھے پھر رہی ہے۔ وہ تجھے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔"

گھبرا کر ثوبیہ نے اپنا سر تھام لیا۔ ہٹ کر وہ ایک کرسی پر آ بیٹھی۔

طول و اداس چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر وہ اٹھی۔ کمرے پر اک نگاہ ڈالی۔

ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ رضائی کرسی پر پڑی تھی۔ کمبل سوٹ کیس پر پڑا تھا۔ شیو کا سامان کھڑکی میں رکھا تھا۔ تولیہ پلنگ کی پائنتی پر پڑا تھا۔ میز پر سگریٹ کے جلے اور ادھ جلے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ ماچس کی جلی تیلیوں کا شمار ہی نہ تھا۔

رات کے کپڑے الماری کے ہتھے سے لٹک رہے تھے۔ بوٹ، چپل، جرابیں بکھری پڑی تھیں۔ کتابیں اخبار پلنگ پر تھے۔ خوش نما وری کا سبز رنگ گدلا لگ رہا تھا۔ قالین کا چھوٹا سا ٹکڑا کیچڑ آلود بوٹوں کی رگڑ سے خاصہ بدرنگ ہو رہا تھا۔

ملازم فیضی نے جانے کتنے دنوں سے اس کمرے کا رُخ نہیں کیا تھا۔ اچھی خاصی چیزیں عدم توجہی سے برباد ہو رہی تھیں۔

انتشار — ہر چیز سے جیسے انتشار ٹپک رہا تھا۔

ثوبیہ طول و اداس ہونے کے باوجود ہمدردی اور چاہت کے ان جذبوں کو نہ روک سکی۔ جو اس کے دل و دماغ میں آصف کے لیے مچل رہے تھے۔ اس کے تغافل، بے روائی اور بے مروتی کے باوجود وہ اس کا کمرہ درست کرنے لگی۔ اسے آصف پر

جانے اس کی ساری بداخلاقی کے باوجود کیوں ترس آنے لگا۔

اس نے پورے کمرے کی صفائی کی۔ فرنیچر کو جھاڑا پونچھا۔ میز کے رومال ٹھیک سے بچھائے۔ بوتے ترتیب سے رکھے۔ شیو کا سامان ملحقہ غسل خانے کی چھوٹی سی الماری میں رکھ دیا۔ رات کے کپڑے بھی وہیں کھونٹی سے لٹکا دیے۔

بستر جھاڑا۔ گدے کے نیچے سے خواب آور گولیوں کی شیشی دری پر گر پڑی۔ ثوبیہ شش و پنج سی شیشی کو لیے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

"کیا آصف قدرتی نیند سے محروم ہے۔ جو اسے ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔" وہ دکھ اور ہمدردی سے اس کے متعلق سوچنے لگی۔

"آصف تم کیا ہو۔ کیوں ہو۔" وہ شیشی کو سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر کے سوچ میں ڈوب گئی۔ کتنی ہی دیر اس کا دل آصف کے لیے مچلتا رہا۔ اسے آصف کے حالات کا کچھ کچھ علم تھا ضرور۔ لیکن اتنا نہ جانتی تھی۔ کہ آصف کے لہو لہان ماضی ہی نے اسے یوں بے حس بنا دیا ہو گا۔

اس نے اٹھ کر بستر ٹھیک کیا۔ لیکن گولیوں کی شیشی وہاں سے اٹھا کر الماری کے اوپر رکھ دی۔ اداس پہلے ہی تھی۔ اس سوچ نے اور بھی مضمحل بنا دیا۔ آصف کے لیے درد اور محبت کے جذبات سینے میں شدت سے مچلنے لگے۔

وہ کتابیں اٹھا کر نیچے آئی تو شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ بچوں نے حسب عادت اودھم مچایا ہوا تھا۔ امینہ بھی آ گئی تھی۔

آج رات مجید کام کے سلسلے میں کراچی جا رہا تھا۔ اس لیے دونوں بہنیں معہ بچوں کے باپ کے ہاں آئی تھیں۔ ثوبیہ نیچے اتری۔ کتابیں اپنے کمرے میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ جہاں ثمینہ، آمینہ اور منیرہ بیٹھی تھیں۔ ثمینہ کے چھوٹے تینوں بچے بھی وہیں بیٹھے تھے اور حیرانگی کی بات، آصف بھی وہیں تھا — وہ ثمینہ کی چھوٹی بیٹی مانو کو ہوا میں اچھال

رہا تھا۔ آمینہ کو ثوبیہ نے جھک کر تعظیم سے سلام کیا۔ اس نے ثوبیہ کو بازوؤں میں بھر کر پیار کیا۔ دونوں بہنیں اسی پیاری سی لڑکی پر جیسے فریفتہ تھیں۔

"اپنی بیٹی بھی ہوتی تو شاید اتنی ہمدردی نہ ہوتی" منیرہ اکثر انہیں ثوبیہ کے متعلق بتایا کرتی تھی۔

"آپ کب آئیں؟" وہ آمینہ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کافی دیر ہو گئی۔"

"مجھے پتہ ہی نہ چلا۔"

"خالہ نے بتایا تھا۔ تم اوپر کام کر رہی ہو۔"

"جی — کالج کا کام تھا۔"

"خوب تیاری ہو رہی ہے —؟" ثمینہ نے کہا۔

"بس کچھ کر رہی ہوں۔" وہ انکسار سے بولی۔

وہ باتیں کرتی رہی اور آصف مانو کو اچھالتا رہا۔

"مجھے بھی اچھالیں ماموں۔" ٹنکو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

ثوبیہ حیرت سے آصف کو دیکھ رہی تھی۔ بڑا خوش گوار موڈ تھا اس کا۔

ثمینہ آمینہ کے بچوں سے آصف کا سلوک کبھی خراب نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ بچپن میں دونوں بہنوں کا سلوک اس سے لبتا بہتر ہی رہا تھا۔ یہ اسی سلوک کا ردعمل تھا ورنہ آصف — وہ تو جیسے ہر فرد سے بیزار تھا۔ ننھیال والوں کے تو نام سے متنفر تھا۔ کبھی وہاں نہ جاتا۔ ماں مجبور کر کے لے جاتی۔ تو گنگ سا بیزار سا بیٹھا رہتا۔ ماموں ممانیاں اکثر آتی رہتی تھیں۔ ان کے بچے بھی اب جوان ہو گئے تھے۔ دونوں کی بیٹیاں بیاہنے کے لائق تھیں شاید اسی لیے آصف پر نظر التفات تھی۔ لیکن آصف کے ذہن سے وہ خراشیں کہاں مٹی تھیں جو ننھیال میں رہ کر کھائی تھیں۔ واقعات بھول چکے تھے۔ لیکن لاشعور میں زخم باقی تھے۔ اسی

لیے وہ کسی طور ان کی جانب راغب ہو ہی نہیں پایا تھا۔ وہ اب اس سے اپنائیت کا زیادہ اظہار کرتے تو آصف اس اپنائیت اور پیار میں خود غرضی کی بو پا کر زیادہ چڑ جاتا۔ اس کی نفرت سنگین ہو جاتی۔ لیکن آمینہ ثمینہ کے بچوں سے اسے لگاؤ ضرور تھا۔

"ماموں مجھے اچھالو نا۔" ٹنکو مچل گیا۔

آصف نے مانو کو مینٹل پیس پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ اس کا بازو تھامے رہی۔

"اچھال دو بھیا آصف۔ بیچارے کو۔ کتنی منتیں کر رہا ہے۔" ثمینہ کی سفارش پر ٹنکو اور مچل گیا۔

"اس کا کیا کروں۔ جو گلے کا ہار بنی جا رہی ہے؟" آصف نے مانو کی طرف دیکھا جو واقعی اس کے گلے میں جھول جانے کو تیار مینٹل پیس پر بیٹھی تھی۔

"ثوبیہ ذرا تم پکڑ لو مانو کو۔" آمینہ نے کہا۔

ثوبیہ نے آصف کی طرف دیکھا۔ وہ مانو کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔

"آجاؤ میرے پاس۔" ثوبیہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔ ہاتھ بڑھا کر مانو کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔ لیکن مانو آصف کے گلے میں بانہیں ڈالے تھی۔ اس سے چمٹ گئی۔

ثوبیہ کا بڑھا ہوا ہاتھ مانو اور آصف کے درمیان دب گیا۔

آصف کی چھاتی پر ثوبیہ کا ہاتھ۔ جیسے مانو پوری قوت سے دبائے تھی۔

ثوبیہ جیسے برقی رو سے چھو گئی۔ اس کا سارا جسم سنسنا اٹھا۔

آصف نے اسے اور اس نے آصف کو دیکھا۔ نگاہیں لڑ کھڑا گئیں۔

گھبراہٹ دونوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ ثوبیہ نے کھینچ کر ہاتھ نکالا۔ اور تیزی سے پلٹی۔

آصف نے مانو کو کرسی پر پھینکنے کے انداز میں بٹھا دیا۔ اور ٹانگوں سے چمٹتے ٹنکو کو اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ اس غیر متوقع واقعے سے وہ سراسیمگی کی حد تک گھبرا گیا تھا۔

ثوبیہ نے بھی گھبرا کر کمرے سے نکل جانا چاہا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ بیٹھو نا —" ثمینہ نے ثوبیہ کو واپس بلا لیا۔

وہ صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ گھبراہٹ کم ہوئی تو اس نے سب کی طرف دیکھا اس حادثے کا علم کسی کو نہیں ہوا تھا۔ جو ابھی ابھی رُونما پذیر ہو گیا تھا۔ اور جس نے اس کے جسم میں برقی رَو دوڑا دی تھی۔ منیرہ اور آمینہ اپنی ہی باتیں کیے جا رہی تھیں۔ اپنے اپنے گھروں کی باتیں اپنے اپنے بچوں کی باتیں۔

کسی کے چہرے سے ظاہر نہیں تھا۔ کہ وہ اس ہونے والے حادثے سے باخبر ہو چکے ہیں — ثوبیہ جو اس حادثے کی رنگینی اور سنگینی کے اثر سے مغلوب ہوئی جا رہی تھی۔ قدرے سنبھلی۔ باتیں ہوتی رہیں۔ وہ چپ چپ بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی۔

"ذرا باورچی خانے میں ایک نظر چاولوں کو دیکھ لینا بیٹی۔"

"اچھا" کہہ کر وہ چل دی۔ اور منیرہ دونوں بہنوں سے اس کی تعریفیں بیان کرنے لگی۔ "ایسی سپاری بچی ہے کیا بتاؤں۔ سوئی سلائی میں ماہر۔ باورچی خانے کے کام میں طاق۔ زبان ایسی میٹھی۔"

"واقعی ہمہ صفت موصوف ہے۔ ایسی لڑکیاں شاذ ہی ملتی ہیں۔" ثمینہ بولی "اپنی بیٹی تو میٹرک میں ہے۔ دماغ عرش پر پہنچ گیا ہے۔ گھر کے کام کو تو ہاتھ لگانا عیب ہے — جیسے۔ آمینہ اپنی بیٹی کے عیب گننے لگی۔ اچھا کھانے اچھا پہننے کو مل جاتا ہے۔ کوئی فکر فاقہ ہی نہیں۔"

"ہائے آپا۔ آپ تو نادرہ ہی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں ابھی ہے ہی کتنی۔" ثمینہ بولی۔

"پیچھے کیا پڑی رہتی ہو۔ ثوبیہ کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ کاش اپنی بچی بھی ایسی ہوتی۔" آمینہ نے کہا۔

"ہاں ثوبیہ تو واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔" ثمینہ نے اعتراف کیا۔

تینوں ثوبیہ کے گُن گانے لگیں۔

—

کمرے میں داخل ہوا۔ بتی جلائی۔

ایک لمحہ کو تو اسے یوں لگا۔ جیسے وہ اپنے نہیں کسی اور کے کمرے میں جھولے سے چلا آیا ہو۔

صاف ستھرا کمرہ جس کی ہر چیز ٹھکانے پر سلیقے سے پڑی تھی۔ صفائی کے ساتھ ہی اسے ثوبیہ کا خیال آ گیا۔ یقیناً اسی نے صفائی کی تھی۔ شام سے کچھ ہی دیر پہلے تو وہ کمرے میں آیا تھا۔ ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ کمرہ خاصا کباڑ خانہ بنا تھا۔

وہ آگے بڑھا۔ اور پلنگ کے قریب رک گیا۔

ثوبیہ — ثوبیہ ایک ہی نام کی گونج اس کے کانوں میں تھی۔ اسی کا خیال اس کے ذہن میں تھا۔ اس گونج کے ساتھ اس خیال سے وابستہ اک کپکپی کا احساس بھی تھا۔ جو ثوبیہ کا ہاتھ اپنے سینے پر مانو کی وجہ سے دب جانے پر اس کے حواس پر چھائی تھی۔ پچھلے پہر سے اب تک کئی واقعے رُونما پذیر ہو چکے تھے۔ جنہوں نے اس کے جذبات کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

میز کے قریب رکھی کرسی پر وہ بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ وہ اپنے سینے پر اس نرم نرم ہاتھ کا دباؤ اب تک محسوس کر رہا تھا۔

ادھ کھلے تسمے چھوڑ کر اس نے پاؤں پھیلا دیے۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

شام سے اب تک لپک جھپک کئی واقعات اس کی نظروں میں گھوم گئے۔

"ابھی رات کا ایک تو نہیں بجا۔ آپ کیسے آ گئے؟" وہ مترنم سا جملہ کانوں میں رس گھولنے لگا۔

وہ رکا رکا چھپا چھپا تبسم بھی سینے میں ہلچل مچانے لگا۔ ڈرائنگ روم میں مانو کی مہربانی سے سینے پر اس نرم نرم ہاتھ کا دباؤ ــــ تمتماتے ہوئے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی سے ہاتھ کھینچ کر ثوبیہ کا تیزی سے پلٹنا۔

رات کے کھانے پر شوخی سے کہا گیا جملہ "آپ ہنستے بھی ہیں؟" لطف و انبساط کی لہریں بکھیرتا چلا گیا۔

آج رات مدتوں بعد اس نے سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ثوبیہ کے دوران قیام میں تو یہ پہلی دفعہ تھی۔ جانے یہ مجید کے کراچی چلے جانے کی خوشی تھی۔ یا آمینہ ثمینہ کے بچوں سے کھیل کر لطف اندوز ہوا تھا۔ اس کا موڈ بڑا ہی خوش گوار تھا۔ کھانے کے دوران تنکو نے اک ایسی مضحکہ خیز حرکت کی۔ کہ آصف کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

اور ــــ آپ ہنستے بھی ہیں ــــ؟ شوخ طنز سے ثوبیہ نے آہستگی سے کہا۔ وہ کچھ حیران بھی ہوئی تھی۔ اس شوخی کو سمجھ کر جب اس نے ثوبیہ کی طرف دیکھا تو اس نے نظر ملانے کی بجائے اپنی توجہ آمینہ کی بڑی لڑکی نادرہ کی طرف مبذول کر لی تھی۔ اس کے چہرے کا تاثر وہ کوشش کے باوجود نہ دیکھ پایا تھا۔

تصور کی آنکھ سے اس تاثر کو وہ اب بھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھنٹہ بھر وہ اسی انداز میں سوچوں میں کھویا تصور کی دنیا میں بھٹکتا رہا۔

پھر آنکھیں کھول دیں۔ وہ ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ اس ہوش کی دنیا میں آتے ہی وہ ملول و دلگیر سا نظر آنے لگا۔

"ہوں ــــ" ایک لمبی ہُوں کے ساتھ اس نے بوٹوں کے کھلے تسمے ڈھیلے کر کے بوٹ اتارے۔ جرابیں بھی اتار پھینکیں۔ چپل پہنے ــــ اور کرسی سے اٹھ کھڑا

ہوا۔ اس کا رُواں رُواں ثوبیہ پکار رہا تھا۔

ثوبیہ اس کے حواس پہ پوری عنایتوں اور کرم فرمائیوں سے قابض ہو چکی تھی۔ اور شاید ثوبیہ بھی ــــ اس پہ ملتفت تھی۔ وہ بھی اسے پیار ــــ پیار ــــ! اس خیال سے سکون کی بجائے اسے وحشت سی ہوئی۔

اس کی چوڑی پیشانی پہ سلوٹیں پڑ گئیں۔ محرومیت کے سائے اس کے خوبصورت چہرے پر بکھرنے لگے۔ دکھ کی گھمبیر یہ چھایاں اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگیں۔

پیار کے تصور سے ہی وہ بھنّا گیا۔ "تمہیں کون پیار کرے گا آصف میاں۔ کوئی نہیں کوئی بھی نہیں۔"

اک دکھ بھری گہری آہ بھر کر وہ اپنے ناخن دانتوں سے کاٹنے لگا۔ اپنی مظلوم سی ذات پر اسے بے طرح رحم آنے لگا۔

وہ سوچ میں ڈوبتا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا موڈ بھی بدلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں پلک جھپک کرتے جلوے پتھرا سے گئے۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور جذبات کی کشمکش سے بے نیاز سا نظر آنے لگا۔

دکھ کے گہرے گہرے احساس کے ساتھ اس نے ٹائی کی گرہ کھولی۔ کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر پھینکا۔

رات کے کپڑے کمرے میں نظر دوڑا کر تلاش کرنے لگا۔ اس نے الماری کھولی کپڑے وہاں نہیں تھے۔ جھلا کر وہ کپڑے ادھر ادھر تلاش کرتا ہوا غسل خانے میں گیا۔ کپڑے کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ بستر میں آ گھسا۔ طبیعت بیحد پریشان تھی۔ بوجھل بوجھل بیزار بیزار ــــ اور پریشان سی طبیعت لیے وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے گیا۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی کا سب سے بڑا سانحہ اس پہ لاعلمی ہی میں گزر

گیا ہو۔ اسے اپنے آپ پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اپنے دل کی بے تابیوں سے چڑ رہا تھا وہ سوچ میں غلطاں رہا۔

پھر اک خوف ـــ انجانا سا خوف اس پر مسلط ہونے لگا۔

بستر میں کروٹیں بدل بدل کر بھی اسے نیند نہ آئی۔

اس پر ایسی کیفیت ہزاروں بار طاری ہو چکی تھی۔ جب وہ کسی سوچ میں اس طرح ڈوبتا۔ اس کی طبیعت بوجھل ہو جاتی۔ افسردگی محرومیت کے ردِّ عمل کے طور پر اس پر طاری ہو جاتی۔ اک انجانا سا خوف نامعلوم وسوسہ جو اس کو ڈسنے لگتا۔

ایسی حالت میں اسے نیند نہ آتی۔ اور اکثر وہ خواب آور گولیاں کھا کر اپنے آپ کو ساری پریشانیوں اور ذہنی انتشار سے نجات دلایا کرتا تھا۔

وقت تو کچھ زیادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا۔ کہ اسے آج نیند نہیں آئے گی۔ دماغ پھٹنے لگے گا۔ جسم دُکھ دُکھ کر شل ہو جائے گا۔ آنکھیں سرخ ہو جائیں گی۔ اور طبیعت اس طرح بگڑے گی۔ کہ دنوں معمول پر نہیں آئے گی۔

اس نے بہتر یہی جانا۔ کہ گولیاں کھا کر مصنوعی سہارا لے۔ کم از کم ان سوہانِ رُوح پریشانیوں سے تو نجات مل جائے گی۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس نے بستر کا کونہ الٹا کر شیشی نکالنا چاہی۔ لیکن وہاں کچھ نہ ملا۔ اس نے دوسری طرف کا کونہ الٹا۔ شیشی وہاں ہوتی تو ملتی۔

اس نے اٹھ کر تقریباً آدھا بستر الٹ دیا۔ گدا دیکھا چادر ہٹائی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ کچھ لمحے بڑبڑاتا رہا۔

اسے یقین تھا۔ کہ گولیاں یہیں رکھی تھیں۔ سارا بستر جھاڑ ڈالا۔ لیکن شیشی نہ ملی۔

اس نے سوٹ کیس ٹٹولا۔ الماری دیکھی۔ جہاں جہاں امکان تھا ڈھونڈا لیکن مطلوبہ شے نہ ملی۔

ہار کر وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اسے خیال آیا۔ آج ثوبیہ نے کمرے کی صفائی کے دوران میں ضرور شیشی کہیں اِدھر اُدھر کر دی ہے۔

ثوبیہ کے خیال کے ساتھ ہی وحشت و خوف کا ملا جُلا احساس اس کے رگ و پے پر چھا گیا۔ وہ اس سے جتنا اجتناب برتنا چاہتا تھا۔ حالات موڑ مروڑ کر اسے اسی کی طرف لے جا رہے تھے۔ پہلے تو اس نے چاہا۔ کہ یونہی بستر پر پڑا رہے۔ نیند نہ آئے تو نہ سہی۔ لیکن ـــ پھر ـــ دل کے شاید کسی شدید تقاضے کے سامنے وہ جھک گیا۔

کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ ثوبیہ کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ بلا سوچے سمجھے اس نے کھڑکی بند کی۔ دروازے کی طرف بڑھا۔ اور پھر صحن عبور کر کے تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ چند لمحوں بعد وہ ثوبیہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"کون ـــ؟" ثوبیہ کتابوں پر جھکے جھکے بولی۔

"آصف ـــ" آواز آئی۔

آصف ـــ! حیرت سے اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ اس نے ہمت کر کے دروازہ کھول دیا۔ آصف کو چند لمحے حیرت سے دیکھتی رہی۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں والے نرم نرم ہاتھوں کو مسلتے ہوئے اس نے آصف کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ نے آج میرے ـــ کمرے کی صفائی کی تھی؟" آصف بھیے کو روکھا پھیکا بناتے ہوئے بولا۔

"جی" وہ اک ادائے دلربائی سے مسکرائی۔ قدرے منہ پھیر کر وہ اپنے تراشیدہ بالوں کی لٹ کانوں کے گرد لپیٹنے لگی۔ آصف اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ صبح کر لیا ہوتا۔ بھلا ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ یہ بھی کوئی وقت تھا۔ برق کی سی تیزی سے یہ جملے ثوبیہ کے دماغ میں آتے چلے گئے۔

میرے گدّے کے نیچے ایک شیشی تھی۔" تنے ہوئے لہجے پر ثوبیہ نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے خوش کن خیالات ریت کی اس دیوار کی طرح بہہ گئے۔ جو پانی کے بہاؤ کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔

"کہاں ہے وہ شیشی؟ وہ رکھائی سے قدرے تیز آواز میں بولا۔" آپ نے دیکھی تھی وہ۔"

"ہاں ــــ"

"کہاں ہے؟"

"اُوپر۔"

"اوپر کس جگہ ــــ میں نے ہر جگہ ڈھونڈھی، نہیں ملی۔" اس کا کھردرا لہجہ اور درشت ہو گیا۔

"خفا کیوں ہوتے ہیں۔ میں ڈھونڈھ دیتی ہوں۔" ثوبیہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکلی۔ اور پچھلے زینے کی طرف چل دی۔

آصف کچھ اور جھلا گیا۔ "آپ مجھے جگہ بتا دیں میں لے لوں گا۔"

لیکن وہ رکی نہیں۔ تیزی سے زینہ پر چڑھ گئی۔ آصف جب کمرے میں پہنچا۔ تو وہ الماری سے شیشی لے چکی تھی۔

"یہی ہے نا۔" اس نے شیشی آصف کو دکھائی۔

"ہوں۔" وہ ثوبیہ کے ہاتھ سے شیشی لینے لگا۔

"آپ یہ گولیاں کیوں کھاتے ہیں؟" بڑی اپنائیت اور ہمدردی سے ثوبیہ نے پوچھا۔

"نیند نہیں آتی۔" وہ بدستور اکھڑ لہجے میں کہتے ہوئے شیشی لینے لگا۔

ثوبیہ نے دکھے ہوئے لہجے میں اسے دیکھا۔ چند لمحے کھڑی رہی۔

"اب پوچھیے نیند کیوں نہیں آتی؟" آصف نے شیشی لیتے ہوئے انتہائی تلخ اکھڑ اور درشت لہجے میں کہا۔

ثوبیہ کو یوں لگا۔ جیسے آصف نے اسے دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا ہو۔

اپنی سبکی اور توہین کے احساس سے وہ غصے بھر میں بھر گئی۔ ہمیشہ ہی آصف اس سے یوں پیش آتا تھا۔ مدت کا دبا ہوا غصہ اُبل پڑا۔ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

"میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ ہر وقت بگڑتے ہی رہتے ہیں۔ میری موجودگی آپ کے لیے بار ہے۔ تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ ہوسٹل میں جگہ نہ ملی۔ تو کالج چھوڑ دوں گی۔ آپ کے ذہن کا بار نہیں بنوں گی۔"

اس کی آواز رک گئی۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔

وہ آندھی کے ریلے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

آصف مختلف حواس لیے دیکھتا ہی رہ گیا۔

نے کروٹ بدلی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

آصف کمرے میں سنہری اجالا پھیلا ہوا تھا۔ دروازے کے ادھ کھلے پٹ سے زرد دھوپ کی نرم نرم کرنیں تانک جھانک میں مصروف تھیں۔ دن خاصا نکل آیا تھا لیکن آصف کی سرخ سرخ آنکھوں میں ادھ کچی نیند کا خمار تھا۔

کروٹ بدل کر اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ رضائی کھینچ کر گردن تک لپیٹ لی سو جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن نیند کہاں تھی۔ پچھلے پہر بھی جانے وہ کیسے اونگھ گیا تھا۔

رات بھر کی بے چینی اس کے تھکے ہوئے چہرے اور سرخ سرخ آنکھوں سے عیاں تھی۔ اس کا بند بند دکھ رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور سر بے طرح بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

وہ کروٹ کے بل کافی دیر پڑا رہا۔ تھکے ہوئے دل و دماغ میں پھر وہی الجھن اور دھینچا تانی شروع ہو گئی جس سے پچھلے پہر جانے کیسے نیند کی دیوی نے مہربان ہو کر کچھ دیر کے لیے چھٹکارا دلا دیا تھا۔

وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ رضائی سر کا کر سینے تک کر لی۔ اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں الجھا کر بازو اٹھا لیے۔

اور اک زور دار انگڑائی سے بدن کا اکڑاؤ ختم کرنا چاہا۔

لیکن جسم پکے پھوڑے کی طرح دکھتا رہا۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے سرہانے رکھی ہوئی چھوٹی سی میز سے سگریٹ اور ماچس اٹھائی۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر دیا سلائی سلگائی۔

اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ دیا سلائی بجھا کر دور پھینک دی۔ اس کی نظر بے شمار جلے سگریٹوں اور ماچس کی ادھ جلی تیلیوں پر پڑی۔

رات بھر وہ سگریٹ ہی پھونکتا رہا تھا۔ اتنے سگریٹ۔ اسے خود بھی کچھ حیرت سی ہوئی۔ لیکن حیرت دیرپا نہ تھی۔ اس کا ذہن رات کے واقعے کی لپیٹ میں پھر آ چکا تھا۔

ثوبیہ — ثوبیہ اس سے روٹھ گئی تھی؟

اسے یہاں سے چلے جانے کی دھمکی جو دے گئی تھی۔

"میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ ہوسٹل میں جگہ نہ ملی تو کالج چھوڑ دوں گی۔ آپ کے ذہن کا بار نہیں بنوں گی۔"

آنسوؤں میں ڈوبتی آنکھیں اور رندھی ہوئی آواز میں کہے ہوئے یہ الفاظ آصف کے ذہن میں طوفان مچائے ہوئے تھے۔

کچھ تو لگاؤ، کچھ تو واسطہ تھا جو اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ آصف کا جی مچل رہا تھا کہ اسی لگاؤ اور اس واسطے کو زندہ حقیقت سمجھ لے۔

لیکن — بچپن سے پیار پانے کی ہر خواہش اور ہر کوشش جس جس طرح ناکام ہوئی تھی۔ اس نے اس کے لاشعور میں ٹھکرائے جانے کا خوف جاگزین کر دیا تھا۔ انجانا سا خوف اور نامعلوم سا وسوسہ ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتا۔

ثوبیہ سے دور دور بھاگنے میں یہی خوف اور وسوسہ سرگرم عمل تھا۔

لیکن — اس کی بھرپور جوانی کے تقاضے اس خوف کو روندنے کے لیے مچل رہے تھے۔ وہ ثوبیہ کی سمت بڑھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام لینا چاہتا تھا۔ وہ پیار کے اس ابلتے چشمے سے اپنی روح کی ساری تشنگی مٹا دینا چاہتا تھا۔

جو اسے ماضی میں نہ مل سکا وہ حال سے چھین لینا چاہتا تھا۔

لیکن اس چاہنے کے باوجود اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس خوف سے نپٹنے کی ہمت

نہیں تھی۔ جو بچپن سے لاشعور میں گھر کر چکا تھا۔ اس وسوسے سے نپٹنے کی ہمت نہیں تھی۔ جو ذہن میں کالے ناگ کی طرح ہر دم ڈسنے کو تیار بیٹھا رہتا تھا۔

کافی دیر بستر میں چت پڑا وہ سگریٹ پھونکتا رہا۔ سردی آج بھی شدت اختیار کیے ہوئے تھی۔ دھوپ نکل آنے کے باوجود فضا کی کپکپاہٹ دور نہ ہوئی تھی۔

آصف بستر سے نکلا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں الجھا کر انہیں درست کرنے کی کوشش کی۔

الجھا سلجھا ذہن لیے وہ اٹھا۔ پلنگ کے تکیے پر پڑی پوری آستین کی جرسی پہنی۔ چائے کی طلب محسوس کر کے وہ نیچے باورچی خانے کی طرف چل دیا۔

باورچی خانے میں چولھے کے سامنے پیڑھی پر منیرہ بیٹھی تھی۔ ثوبیہ سامنے کھڑی تھی۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے وہ منیرہ سے کہہ رہی تھی۔ "میں آج جاؤں گی خالہ جان۔"

"ایسی بھی کیا جلدی بیٹی ۔۔۔" منیرہ بھی اسے تک رہی تھی۔ "کالج تو اگلے ہفتے بند ہوگا۔ ہفتہ بھر پہلے ہی چلی جاؤں گی؟"

"ایک ہفتے کی چھٹی لے لوں گی۔"

"کیوں کیا بات ہے۔ کچھ خفا ہو گئی ہو؟"

"نہیں خالہ جان۔ میں۔ بس گھر جانا چاہتی ہوں۔ میرا دل۔ اداس ہو گیا ہے۔"

"وہ مان لیا۔ لیکن اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

"ابا جان کو آج تار دے دیں گے۔ مجھے سٹیشن سے لے جائیں گے۔"

منیرہ چپ ہو گئی۔ اکیلی لڑکی کو سفر پر بھیج دینا۔ اس کے نزدیک مناسب نہیں تھا۔

لیکن ثوبیہ نے ایک ہی ضد پکڑ لی تھی۔ آج ہی جاؤں گی۔ آج ہی جاؤں گی!"

ثوبیہ نے چائے کی پیالی خالی کر کے نل کے نیچے رکھ دی۔ اس نے رات والے کپڑے ہی پہن رکھے تھے۔ شاید کالج جانے کا بھی ارادہ نہ تھا۔

باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی آصف نے اس پر اک بھرپور نگاہ ڈالی۔ دونوں کی باتیں سن کر اسے ثوبیہ کے ارادے کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے رات محض دھمکی ہی نہ دی تھی۔ وہ واقعی چلے جانے پر مصر تھی۔ یہ حقیقت آصف کو اک ذہنی دھچکا دے گئی۔

پریشان پہلے ہی تھا ۔۔۔ ملول و اداس بھی نظر آنے لگا۔ خاموشی سے ماں کے قریب آ کر رک گیا۔ ثوبیہ اسے دیکھتے ہی باورچی خانے سے نکل گئی تھی۔

"چائے پیو گے ۔۔۔؟" ماں نے پوچھا۔

"ہوں ۔۔۔"

منیرہ نے چینی کی نازک سی پیالی میں چائے بنا کر آصف کو تھما دی۔

"آج جانا نہیں؟" آصف سے ماں نے پوچھا۔

"کہاں۔؟" وہ بے دھیانی سے پیالی سے چائے پیتے ہوئے چونکا۔

"دفتر۔"

"نہیں۔"

"چھٹی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے جلدی سے چائے کی پیالی حلق میں انڈیلی۔ خالی پیالی ماں کی جانب بڑھا دی۔ ماں نے غور سے آصف کو دیکھا۔ واقعی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

آصف شاید ماں کے سوالوں سے بچنے کے لیے باورچی خانے سے نکل کر اندر کوریڈور میں چل دیا۔

وہ ثوبیہ کے کمرے کے سامنے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ثوبیہ کمرے ہی میں تھی۔ میز پر رکھے سوٹ کیس میں شاید کپڑے رکھ رہی تھی۔

تو — وہ — واقعی جا رہی تھی۔

آصف کا جی چاہا۔ اس کے کمرے میں بے دھڑک پہنچ کر بڑے اصرار سے اسے جانے سے روک لے۔ لیکن اس نے ایسا کیا نہیں۔ وہ ایسا کر ہی نہ سکا۔

ثوبیہ کالج گئی نہ آصف دفتر — دونوں دن بھر گھر پر ہی رہے۔ ثوبیہ جانے کی تیاری میں مصروف رہی۔ اور آصف اس کے کمرے کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے اس کی تیاریوں کو دیکھتا رہا۔

دوپہر کا کھانا ثوبیہ نے اپنے سائے کاموں سے نپٹ کر ہی کھایا۔ پچھلے برآمدے میں بچھے تخت پر منیرہ بیٹھی تھی۔ ثوبیہ باورچی خانے سے نکلی۔ اس نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آسمانی رنگ کا پوری آستین کا خوبصورت سوٹر کپڑوں کی مناسبت سے بڑا بھلا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں نے پوری تیاری کر لی ہے خالہ جان۔" وہ تخت پر بیٹھ گئی۔

"لیکن بیٹی — میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔"

"اکیلے جانے میں کوئی بھی ہرج تو نہیں۔"

"یہ تم کہتی ہو نا۔ تمہیں آج کل کے زمانے کے حالات کا علم نہیں۔"

"لیکن میں جانا چاہتی ہوں۔ خالہ جان۔ میرا دل بہت اداس ہو گیا ہے۔"

"میرا تو جی تمہیں چھٹیوں میں بھی بھیجنے کو نہیں چاہتا تھا۔ تم چھٹیوں سے بھی پہلے جانا چاہتی ہو۔ اکیلے تو بھجواؤں گی نہیں۔ تمہارے خالو بھی یہاں نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا کروں۔ چند ایک دن رک جاؤ۔ تمہارے خالو آ جائیں تو۔"

ثوبیہ نے گھبرائی ہوئی نظروں سے منیرہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ کہ وہ ایک دن بھی اور یہاں رکنا نہیں چاہتی۔ اس نے پھر وہی دل اداس ہونے کی آڑ لی۔

"ایسا بھی کیا دل، ایک دم ہی اداس ہو گیا بیٹی۔ ابھی پچھلے مہینے تمہارے امی ابو مل کر گئے ہیں۔ پچھلے ہفتے بھائی آئے تھے۔ سبھی آتے جاتے رہتے ہیں۔" منیرہ نے پیار سے ثوبیہ کی ٹھوڑی چھوئی۔ "کوئی اور بات تو نہیں۔ کہیں تجھے کسی نے خفا تو نہیں ہو گئی ہو۔"

"نہیں تو —" ثوبیہ گھبرا کر بولی۔ منیرہ نے نادانستگی میں جیسے اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

بڑے بہلاوے پھسلاوے دے کر منیرہ نے ثوبیہ کو روک لیا۔ دوسرے دن دکان کے پرانے ملازم کے ہمراہ اسے ملتان بھیجنے کا وعدہ کیا۔

رات کھانے کی میز پر ثوبیہ کو موجود پا کر آصف نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ ملتان نہیں گئی تھی۔ یہیں تھی۔ بے شک وہ آصف سے روٹھی روٹھی بیٹھی رہی۔ ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ ایک بات بھی اس سے نہیں کی۔ لیکن آصف کی بے تابیوں کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ کہ وہ چلی نہیں گئی تھی۔

رات بھر وہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ کون کون سے منصوبے بناتا رہا۔ وہ ثوبیہ کے رک جانے سے کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

لیکن دوسرے دن جب وہ دفتر سے لوٹا۔ تو اس کا دل جیسے ڈوب ہی گیا۔ ثوبیہ دکان کے پرانے ملازم کے ہمراہ نو بجے کی گاڑی سے ملتان چلی گئی تھی۔

—

ایئر کنڈیشنڈ

ہوٹل کے وسیع اور خوبصورت ہال میں مشرقی کونے میں شیشے کی لانبی دیوار کے قریب ایک میز پر کہنیاں ٹکائے آصف بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے وہ شیشے سے پار سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جس پر زندگی ہر رنگ میں رواں دواں تھی۔ تیز رفتار موٹر گاڑیاں ارتے پھرتے رکشے جما جما کر قدم اٹھانے والے تانگے ۔ سست رفتار ریڑھے سبھی کچھ تھا۔ کوئی آرہا تھا کوئی جا رہا تھا۔

سڑک کے پار بڑی بڑی دکانوں پر خرید و فروخت کے سلسلے میں خاصی گہما گہمی تھی۔ بڑی بڑی موٹریں کھڑی تھیں ٹیکسیاں بھی تھیں۔ رکشے بھی۔ گاہک اندر جا رہے تھے۔ اور چیزوں کے بنڈل اٹھا اٹھا کر واپس بھی آرہے تھے۔ بوسیدہ کپڑوں والے مزدور بچے یہ بنڈل اٹھانے کو لپک رہے تھے۔ دکانوں کے باہر اسے لاٹھی ٹیکتے فقیر بھی نظر آرہے تھے۔ کسی کی ایک ٹانگ تھی۔ کسی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ کوئی جان بوجھ کر گونگا بنا تھا۔ راہ گیروں سے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ نہ کچھ مانگ رہے تھے۔ کوئی پیسہ یا اکنی اچھال دیتا تو چیلوں کی طرح سب جھپٹ پڑتے۔

آصف کافی دیر سے زندگی کے یہ روپ دیکھ رہا تھا۔

"کیا لاؤں صاحب؟" آصف نے پلٹ کر دیکھا۔ سفید وردی پر پیتل کے چمکتے بٹنوں والا سیاہ رو بیرہ مؤدبانہ کھڑا تھا۔ وہ شاید دوسری مرتبہ آیا تھا۔

"کافی۔" آصف نے کہا۔

"بہتر۔" بیرہ گردن کو روایتی انداز میں خم دے کر مڑ گیا۔

آصف نے کرسی پر اپنے سارے وجود کو پھیکنے کے انداز میں گرا دیا۔ ہال پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی۔ تقریباً ہر میز پُر ہو چکی تھی۔ پچھلے پہر تو اس ہال میں واقعی تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

ہلکی ہلکی موسیقی میں لوگوں کی مدھم سرگوشیاں اور بے بے قہقہے تحلیل ہو رہے تھے۔ رنگ برنگے لباس اور میک اپ سے لپے تپے چہرے محفل کو جان دار بنا رہے تھے۔

ہال میں سبھی قسم کے لوگ تھے۔ کہیں شادی شدہ جوڑے تھے اور کہیں گھر میں کالج کے کسی فنکشن کا بہانہ کر کے اپنے آشنا لڑکوں کے ساتھ ڈری ڈری بیٹھی لڑکیاں کہیں بے فکرے دولت مند اور کہیں تلخی حالات سے فرار حاصل کرنے والے فکر مند لوگ۔

کافی اور چائے کے دور چل رہے تھے۔ موسم تو کافی سرد تھا لیکن ہال میں اس سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ خوش گوار سی فضا تھی۔

آصف اکثر شامیں یہاں گزارنے لگا تھا۔ لیکن بے چینی یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑتی۔ وہ زندگی کی گہما گہمی میں اپنے آپ کو کھو دینے کے لیے یہاں آتا تھا۔ اپنے افکارِ پریشاں سے چھٹکارا پانے کی یہ کوشش ہی تو تھی۔

لیکن اسے کہیں قرار نہ ملتا تھا۔ عمران کے گھر بھی جانا کم کر دیا تھا۔ سکون وہاں بھی نہیں تھا۔ روح میں بے چینی اور انتشار تھا۔ سمجھ نہ پاتا تھا۔ کہ کیا کرے۔

ثریہ کو گئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ آصف نے اس کے خیال سے چھٹکارا پانے کے بہتیرے جتن کیے۔ اس سے لاتعلقی کے حیلے کیے۔

لیکن ــــ محبت ساختہ اصولوں کی پابند ہوتی تو اس کا وجود ہی مٹ چکا ہوتا۔ یہ تو وہ جبلی جذبہ ہے جو ازل سے ابد تک دائم و قائم رہے گا۔ زمانے کی اقدار کے ساتھ اس کے روپ اور انداز بے شک بدلتے رہے ہیں لیکن اس جذبے کے حیاتیاتی پہلو کا جہاں تک تعلق ہے۔

وہ وہی ہے جو دنیا کے پہلے انسان کا تھا۔ یا آخری انسان کا ہوگا۔

آصف کی پریشانی ثوبیہ کے چلے جانے کی وجہ سے نہ تھی۔ فکرمند اور پریشان تو وہ اس بات سے تھا کہ جلد کر وہ آتی ہی نہیں۔ یا اگر ہوسٹل چلی گئی تو ۔۔۔ تو کیا ہوگا؟"

وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکتا۔ اس کا غیر متوازن ذہن اس کی پریشانی کا باعث بن جاتا۔ بیرے نے کافی لاکر سامنے رکھ دی۔

آصف نے پیالی میز کافی بنائی۔ ایک گھونٹ لے کر پیالی رکھ دی۔ شیشے پر نظریں جمائے وہ پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔ ڈوبتا چلا گیا۔

پیلی چھت والی کالی ٹیکسی کا دروازہ کھلا۔ اور ۔۔۔ ثوبیہ باہر نکل آئی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ سارا ساز و سامان بھائی کے سپرد کر کے وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔

چائے کا وقت ہو رہا تھا۔ منیرہ نے جلدی سے چائے تیار کی۔ کھانے کی موتری میز پر چائے کے ساتھ کئی پلیٹوں میں سجا کر منیرہ نے ثوبیہ اور اس کے بھائی کو چائے کے لیے بلایا۔ آصف نے بھی ان کے ساتھ ہی چائے پی۔

"کس گاڑی سے آئیں؟"

"کس وقت چلی تھیں؟"

"امی کیسی ہیں؟"

"لاہور کب آئیں گی؟"

"تم تو اچھی رہیں؟"

"پندرہ دن کاٹنے مشکل ہو گئے تھے تمہارے بغیر!"

چائے کے دوران منیرہ کے ان سوالوں کا جواب ثوبیہ مسکرا مسکرا کر دیتی رہی۔ وہ ضرورت سے زیادہ بشاش نظر آ رہی تھی۔

چائے کے بعد منیرہ اور اس کا بھائی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ آصف وانستہ

وہیں کھڑا رہا۔

ثوبیہ چائے کے برتن سمیٹنے لگیں۔

"آ ہی گئیں آپ؟" آصف نے بلا جھجک کہہ دیا۔

ثوبیہ نے متبسم نظروں سے اسے گھورا۔

"میں تو سمجھا" آپ ہمیشہ کے لیے فرار ہو گئیں"

"فرار ہو بھی جاتی تو کیا فرق پڑتا۔

"فرق!" آصف نے اس انداز سے کہا۔ کہ فرق جو پڑ سکتا تھا۔ اس کی وضاحت ہو گئی

ثوبیہ لجا گئی۔

"ہوسٹل کب جائیں گی؟" اس کی ادا سے شہہ پا کر آصف نے چھیڑا۔

"جب آپ سے لڑائی ہو جائے گی۔" وہ اک انداز دلربا سے کہہ کر بل کھاتی لہراتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

آصف کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بن پیئے مدہوش ہو گیا ہو۔ اور جیسے زندگی جان سوزی نہیں۔ حیات افروزی کا نام ہے۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس آواز پر آصف کے رنگین تصور کا تسلسل ٹوٹ گیا خیالات کے حسین ہیولے کانپ کر بکھر گئے۔ وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ وہی ہال سو ہی میزیں وہی زندگی کی گہما گہمی اور شیشے کے پار وہی رواں دواں سڑک وہی شور و ہی افراتفری۔ کافی کی پیالی سامنے اسی طرح پڑی تھی۔ کوئی صاحب اخلاقاً پوچھ کر اس کے سامنے آ بیٹھے تھے۔ آصف مضطرب سا نظر آنے لگا۔ وہاں بیٹھنا اب دوبھر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہوٹل سے نکل کر سڑک کی رواں دواں بھیڑ میں گم ہو گیا۔

—— ❖ ——

آصف کے اعصاب پر جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ کالج کھلے آج دوسرا دن تھا لیکن ثوبیہ نہیں آئی تھی۔ آج وہ گھر جلدی لوٹ آیا۔ وہ لاشعوری طور پر ثوبیہ کی آمد کا منتظر تھا۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ چونکا۔ شاید وہ آگئی ہے۔ اس خوش کن تصور سے مسحور ہو کر وہ ڈرائینگ روم میں آگیا۔

لیکن وہاں ثوبیہ نہیں تھی۔

مجید اور اس کے دونوں کاروباری شریک بیٹھے تھے۔ قہوے کا دور چل رہا تھا۔ وہ سب نئے پرمٹ کے ملنے سے بے طرح خوش تھے۔

بے دلی سے اس نے مہمانوں سے مصافحہ کیا۔

"بیٹھو بیٹے!" اکبر خاں نے بڑی ملائمت سے آصف کی طرف کرسی بڑھا دی۔

"قہوہ پیو۔" ناصر نے کہا۔

"شکریہ۔" آصف بجھے دل سے وہاں بیٹھ گیا۔

وہ تینوں پھر اپنی باتوں میں الجھ گئے۔ دو ہزار کی رقم نے لاکھوں کا فائدہ پہنچایا تھا۔ تینوں بار بار اسی کا ذکر کر رہے تھے۔

آصف خاموشی سے بیٹھا رشوت اور اس سے پیدا شدہ دھاندلیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ معاشرے کی یہ لعنت جس منظم طریق سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ اس کا قلع قمع کرنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں کسی نہ کسی شکل میں یہ بھیانک وبا پھیل رہی تھی۔ کوئی رشوت پا کر لاکھوں میں کھیل رہا تھا۔ اور کوئی رشوت دے کر لاکھوں سمیٹ

رہا تھا۔ مجید کی چھوٹی سی دوائیوں کی دکان اب سپرٹ کے کارخانے میں اسی کی طفیل تبدیل ہو رہی تھی۔

سامنے والے ایس ڈی او کی تنخواہ اڑھائی تین سو تھی۔ لیکن ڈیڑھ دو لاکھ کی کوٹھی بنوالی تھی۔ یہ سب اس رشوت ہی کا اعجاز تھا۔

مجید نے ناصر کی کسی بات پر زوردار قہقہہ لگایا۔ آصف نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کتنا خوش نظر آرہا تھا۔ مطمئن، مسرور اور شادماں۔

آصف اسے گھورنے لگا۔ اس کی ذہنی کیفیت بدلنے لگی۔ اس کے شادماں چہرے سے خوشیاں نوچ لینے کی خواہش مچلی۔

مجید نے پھر قہقہہ لگایا۔ آصف نے مضطربانہ کرسی پر پہلو بدلا۔ اس کا ذہن غیر متوازن ہوا جا رہا تھا — اور — اگر وہ اپنے اوپر بمشکل قابو پاتے ہوئے اٹھ کھڑا نہ ہوتا۔ تو آج اعصابی جھنجھلاہٹ اور مجید سے ذہنی کشیدگی جانے کیا گل کھلا دیتی۔

وہ جھنجھلا کر اٹھا۔ ٹھوکر لگنے سے چھوٹی سی میز ہل اور ناصر کی قہوے کی رکھی ہوئی پیالی چھلک گئی۔

"اوہو!" قالین پر قہوہ گرنے سے ناصر متاسف، سا نظر آیا۔

"وحشی ہے بالکل —" مجید نے غصیلی آواز میں کہا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے اس آواز پر آصف نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی خوفناک کرختگی تھی۔ انتقاماً اس نے دروازے کا پٹ اس زور سے بند کیا۔ کہ پھول دار شیشے میں کئی بال آگئے۔

مجید غصے سے بھنا گیا۔ ناصر اور اکبر آصف کی زیادتی پر تبصرہ کرنے لگے۔

دوستوں کے جانے کے بعد جھلایا ہوا مجید اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے خیال سے وہ پلنگ پر لیٹا۔ تھکا ہوا تھا آنکھ لگ گئی۔

"ٹھک ٹھک" چھت پر کوئی ہتھوڑے سے جیسے ضربیں لگا رہا تھا۔ مجید کی آنکھ ایک دم کھل گئی۔

"فیضی —!" وہ غصے سے چلایا۔

"جی —" ملازم فیضی دروازے ہی سے ڈرتے ڈرتے بولا۔

"اوپر کون ہے —؟" مجید نے یوں کہا۔ جیسے وہ جانتا نہ ہو۔ کہ اوپر کون ہو سکتا ہے۔

"دیکھتا ہوں صاحب۔" وہ جلدی سے اوپر دوڑا۔

منیرہ بھی مجید کے غصے سے گھبرا کر اوپر پہنچی۔ آصف بڑے اطمینان سے ٹوٹی ہوئی کرسی کو ہتھوڑے لگا رہا تھا۔ ہتھوڑا کرسی پر کم اور فرش پر زیادہ برس رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو آصف،" ماں نے تیزی سے کہا۔

"اس کی ٹانگ درست کر رہا ہوں۔ ٹوٹی ہوئی بیکار پڑی تھی۔" وہ قدرے مسکرایا۔

"کیا ضرورت ہے اس کی۔ چھوڑ دو۔ عین اسی جگہ کے بیٹھنا تھا اسے۔" ماں غصے سے بولی۔

"کیوں —؟" وہ مطمئن تھا۔

"نیچے وہ سو رہے تھے۔ کچھ تو خیال کیا کرو آصف، یہ بچے تو نہیں ہو۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں میں۔ باپ کے غصے کا پتہ بھی ہے۔ پھر بھی ایسی حرکتیں کرتے ہو۔"

آصف نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ مسرور سا نظر آنے لگا۔ مجید سو نہیں سکا تھا یہ بات جان کر اسے خوشی ہو رہی تھی۔ ماں نے زبردستی ہتھوڑا اس سے چھین لیا۔ اور کرسی دوسری طرف دھکیل دی۔

"میری تو جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔ کہاں چلی جاؤں۔ ساری مصیبتیں مجھی پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ ایک لمحہ بھی تو سکھ کا نصیب نہیں ہوتا۔"

منیرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آصف نے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے

خوشی کی ہر ظاہری علامت معدوم ہو گئی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے نا۔

"کبھی سوچتے بھی ہو۔ کہ کیا کرتے رہتے ہو؟" ماں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ ساری افتاد مجھی پہ آن پڑتی ہے۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے مڑی۔

"ماں!" بڑی بے تابی اور والہانہ پن سے آصف نے بڑھ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح بلک بلک کر رو دینا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ کاش! وہ ماں کو بتا سکتا۔ سب کچھ بتا سکتا۔

ماں نے اس کے پیار بھرے انداز سے مغلوب ہو کر اس کی شفقت سے پیشانی چوم لینا چاہی۔ لیکن — وہ اپنے آپ کو اک جھٹکے سے چھڑا کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"پاگل ہو گیا ہے۔" ماں نے دکھ سے سوچا۔ اور آنسو پونچھتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔

شام تک آصف کی طبیعت معمول پہ نہ آئی۔ سوچ میں کھویا کھویا رہا۔ شاید اپنی حرکات کا تجزیہ کرتا رہا۔ اور اسی کے ردِ عمل کے طور پر یوں بے قرار تھا۔

اتفاق ہی کی بات اسی رات ثوبیہ اپنے ابو کے ہمراہ آ گئی۔ آصف نے بالکنی سے اسے دیکھا۔ نیلے رنگ کے کوٹ پر اس نے سفید سا مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھ میں سفید بیگ تھا۔ سفر سے تھکی تھی یا کوئی ذہنی پژمردگی۔ وہ سست رفتاری سے چمن عبور کر رہی تھی۔

آصف رات کھانے پر سب سے ملا۔ ثوبیہ کے ابو سے اس نے بڑی شائستگی سے مصافحہ کیا۔ کھانے پر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ منیرہ ثوبیہ سے وہی باتیں پوچھتی رہی جو آصف نے بارہا تصور میں پوچھتے دیکھا تھا۔

ثوبیہ نے اس سے بات نہیں کی۔ نہ ہی اس کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ہاں اس کے ابو خوب گھل مل کر اس سے باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد مجید اور ثوبیہ کے ابو اٹھ کر

ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے۔

"یہ برتن اکٹھے کر کے فیضی کے ہاتھ بھیج دینا بیٹی۔" مینرہ یہ کہہ کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔ اور جانے کیوں! آصف وہیں میز کے کنارے پر کھڑا رہا۔

ثوبیہ پر خفیف سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ پلیٹیں اوپر نیچے رکھتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ تھا۔

"آپ آ ہی گئیں۔" تصور میں کئی بار کہا ہوا جملہ جانے کیسے آصف کے لبوں پر تھرک گیا۔ ثوبیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔ پھر اسکی آنکھوں میں اک قہرمانی سا تاثر آ گیا۔

"آئی ہوتی تو چلی بھی جاؤں گی۔ مگر نہ کیجئے۔ مجھے ہوسٹل میں جگہ ملنے کی امید ہو گئی ہے۔"

وہ لاتعلقی سے برتن اٹھانے لگی۔

"آپ میری وجہ سے ہار رہی ہیں۔" آصف کے لہجے میں ہمیشہ والا تناؤ اور اکھڑ پنا نہیں تھا۔ عجیب سی یاسیت اور پژمردگی تھی۔

"جی ہاں۔" پٹاخ سے جواب ملا۔ "گھر کے کسی اور فرد کے لیے میں یقیناً بار نہیں ہوں۔"

وہ پلیٹیں اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اور اس کا کہا ہوا جملہ دکھ کی تیز دھار بن کر آصف کے دل میں اتر گیا۔ پریشان و بے قرار پہلے ہی کیا کم تھا۔ اس پہ یہ افتاد۔ اس کے دل کی کیا حالت تھی؟

اس کا اندازہ خود ہی لگا سکتا تھا۔ آج اس نے کتنے ذہنی اور روحانی چرکے کھائے تھے۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔ اور زندگی میں پہلی بار اس نے تقدیر سے نہیں۔ حالات سے نہیں۔ خدا سے گلہ کیا۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کا کوئی حصہ ہی نہیں تھا۔ یہ کس خطا کی سزا تھی۔ یہ کس جرم کا بدلہ تھا۔ محرومیت کے سائے اتنے گہرے تھے۔ کہ خوشی کی اک کرن بھی ان میں سے نہ جھانک سکتی تھی۔ ایسا کیوں تھا! کیوں تھا! وہ دیوانوں کی طرح سجدے میں پڑ کر اپنے رب حقیقی سے پوچھ رہا تھا۔

مصیبت ہے۔ پہلے تمہیں چھوڑنے جائیں۔ پھر وہاں سے تمہارے نوکر عجیب کے ساتھ ادھر ہی واپس آئیں۔

"ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے ثوبیہ۔ ٹیکسی لو اور گھر سدھارو۔ میں اکیلی تو کبھی جانے کی نہیں۔ دن کے وقت تو شاید ہمت کر بھی لیتی لیکن اس وقت۔ ثوبیہ۔ اس خیال ہی سے خوف آ رہا ہے۔"

"پہلے سوچ لینا تھا نا۔"

"سینما کا پروگرام اس شکو کی بچی نے بنایا۔"

"واہ جی! تم بچی تھیں نا، جو پکڑ کے لے آئی ہیں۔ مرضی تمہاری بھی تھی۔"

"مان لیا۔ لیکن اب مجھے گھر تو پہنچا دو۔ خانہ جان پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"آئندہ بن پوچھے کبھی یوں پروگرام نہ بناؤں گی۔"

"تمہاری بات اور ہے اپنا معاملہ اور۔ کیوں رخسانہ۔ کون اجازت دیتا ہے آئے دن سینما کی۔"

"ہاں بھئی — اپنا تو فلم دیکھنے کا خوب بہانہ ہے۔ جس دن فلم دیکھنا ہوئی کالج فنکشن کا بہانہ بنا لیا۔"

"بری بات ہے۔"

"تو پھر کیا کریں ثوبیہ۔ گھر والے قدامت پرست جو ہوئے۔ بات بری ہے یا اچھی۔ اس سے بحث نہیں۔ سوال فلم دیکھنے کا ہے دیکھ لی۔"

"اب فلم تو دیکھ لی۔ گھر جانے کا بھی بتاؤ۔ تم تینوں کو ایک ہی طرف جانا ہے۔ اس لیے مجھے پہلے گھر چھوڑ آؤ۔ وہاں سے نوکر کے ساتھ تمہیں بھجوا دوں گی۔"

"اتنا اندھیرا ہو چکا ہے اور دیر لگا دی تو گھر والوں پر پول ہی نہ کھل جائے۔"

"پول کیا کھلے گا۔ کہہ دینا ثوبیہ کے ہاں چائے تھی۔"

"جھوٹ۔ بکواس۔"

"کالج فنکشن کی بکواس نہیں ہو گی کیا۔؟"

"وہ تو اور بات ہے۔"

چاروں لڑکیاں باتیں کرتیں فٹ پاتھ پر سست سست قدموں سے چلی جا رہی تھی۔ ثوبیہ اکیلی جانے کو تیار نہ تھی۔ سردیوں کی ٹھٹھری شام رات کی آغوش میں جانے کو مچل رہی تھی۔ سینما سے نکلنے کے بعد ثوبیہ کا اصرار تھا۔ کہ وہ تینوں اسے گھر چھوڑ کر پھر اس کے نوکر کے ہمراہ اپنے ہاں چلی جائیں۔ وہ تینوں ایک ہی محلے میں رہتی تھیں۔ گھر سے کالج فنکشن کا بہانہ کر کے فلم دیکھی تھی۔ دل میں چور تھا اس لیے جوں جوں اندھیرا ہو رہا تھا۔ تینوں متفکر اور پریشان نظر آ رہی تھیں۔

"بخدا ٹیکسی لے لو۔ اور گھر چلی جاؤ۔"

"ثوبیہ کر دو شکو۔ میں تو کبھی بھی اکیلی ٹیکسی میں نہیں جاؤں گی۔"

"اچھی مصیبت بن گئی ہو تم بھی۔" شکو نے کہا۔

"پتہ ہوتا تو اسے دعوت ہی نہ دیتے۔" رخسانہ بولی۔

"ثوبیہ بھی سچ کہتی ہے۔ ایک لڑکی کا اس وقت ٹیکسی میں اکیلے جانا اچھا بھی تو نہیں ——" فاخرہ نے کہا۔

چاروں فٹ پاتھ پر پھر خاموشی سے چلنے لگیں۔ رات اترتی آ رہی ہے۔ دکانوں کا شور جگمگانے لگا تھا۔ چہل پہل اور رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ کشادہ سڑک پر موٹریں

کاریں، ٹیکسیاں اور رکشے پھسلتے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر بھی راہ گیروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

"ثوبیہ یوں کرو ہمارے ہاں چلو۔ وہاں سے تمہیں ہم کسی کے ساتھ بھیج دیں گے۔" فاخرہ نے کہا۔ ہمارا گھر تو نزدیک ہی ہے نا۔"

"لیکن پھر وہی اکیلے جانے کا سوال۔"

"اکیلے کیوں میرے بھائی جان چھوڑ آئیں گے۔"

"نہیں بھئی میں ان کے ساتھ بھی نہیں جاؤں گی۔ خالہ جان کیا کہیں گی!"

معاملہ کسی طرح طے نہ ہو رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ چاروں متفکر اور پریشان ہوتی جا رہی تھیں۔ آج بہانہ بنا کر دیکھی ہوئی فلم کچھ مہنگی ہی پڑی تھی۔

"وہ —— وہ"۔ اچانک شکو زور سے چیخی۔

"اے ہے کیا بیہودہ آوازیں نکال رہی ہو۔ کیا ہوا؟" —— سب رکیں۔

"کام بن گیا۔" شکو دوسری طرف فٹ پاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیسے بن گیا کام؟" فاخرہ نے جلدی سے پوچھا۔

ثوبیہ شکو کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے دوسرے فٹ پاتھ پر جانے والے آصف کو دیکھ کر شکو کا اشارہ سمجھ چکی تھی۔

"وہ تمہارے آصف جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ سدھارو گھر۔"

"کون آصف؟" فاخرہ نے تجسس سے پوچھا۔

"بتاتی ہوں" کہہ کر شکو تیزی سے سڑک پار کر کے آصف تک جا پہنچی۔ ثوبیہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ آصف سے جانے اس نے کیا کہا۔ کیا نہیں۔ بہر حال اس نے آصف کو ثوبیہ کے گھر پہنچانے پر رضامند کر لیا تھا۔ سڑک پار ادھر اُدھر دیکھتے وہ تیزی سے اپنی سہیلیوں کی جانب لوٹی۔

"جاؤ! اس نے تیکھی اور شریر نظروں سے ثوبیہ کو دیکھا۔

آصف سست سست قدموں سے انہی کی جانب آ رہا تھا۔

"لیکن ۔ میں ۔" ثوبیہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ جاتی ہو تو جاؤ اس کے ساتھ ۔ ہم تو چلے ۔"

وہ فاخرہ اور رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر واقعی پلٹ کر چل دی ۔

فاخرہ اور رخسانہ آصف کے متعلق اس سے پوچھنے لگیں ۔

آصف فٹ پاتھ پر ثوبیہ کے قریب آگیا ۔ ثوبیہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ۔ وہ جھجکی جھجکی کھڑی رہی ۔

دونوں خاموشی سے فٹ پاتھ پر چلنے لگے ۔ دونوں کے قدم برابر اٹھ رہے تھے ۔

دونوں کے دل برابر دھڑک رہے تھے ۔ دونوں کی سوچیں بھی برابر الجھ رہی تھیں لیکن دونوں نے بات نہ کرنے کا جیسے تہیہ کر لیا تھا ۔

تین دن پہلے ثوبیہ اور آصف کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی تھی ۔ اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے ایک جملہ بھی نہیں کہا تھا ۔ دونوں ایک دوسرے سے بیگانگی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے رہے تھے ۔ دونوں خاموشی سے چلتے جا رہے تھے ۔

کھمبوں سے لگی ٹیوب لائیٹس کے قریب سے گزرتے وقت ان کے سائے کبھی لانبے ہو جاتے ۔ کبھی قدموں میں سمٹ آتے اور کبھی پیچھے رہ جاتے ۔ ان کے جذبات کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی ۔

کبھی زبان پر آنے کو مچل اٹھتے ۔ تو ۔ کبھی دل کی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے جاتے ۔

خاموشی اکتاہٹ بن گئی ۔ ثوبیہ کو تو اس خاموشی پر جھلاہٹ محسوس ہونے لگی ۔

"پیدل ہی چلیں گے ۔۔۔؟" ثوبیہ نے اکتائے اور جھلائے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا ۔ آصف نے گردن کو خم دے کر غور سے ثوبیہ کو دیکھا ۔ اور گھمبیر سی آواز میں بولا ۔

"تھک گئی ہیں ۔ یا میرے ساتھ چلنے میں کوفت محسوس ہو رہی ہے ۔؟"

"جلی کٹی باتوں کے سوا اور بھی آپ کو کچھ آتا ہے ۔؟" ثوبیہ غصے سے بھنا گئی ۔

"شاید ۔ کچھ بھی نہیں ۔" آصف کا لہجہ متین اور سنجیدہ تھا ۔

ثوبیہ نے تیز نظروں سے آصف کو دیکھا ۔ لیکن ۔۔۔ اس کے چہرے پر جانے کیا شے نظر آئی ۔ اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا ۔ دل میں اک درد سا اٹھا ۔ وہ شاید کچھ کہنے کو تھی ۔

لیکن ۔۔۔ آصف اس ٹیکسی کو ہاتھ دینے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جو سامنے سے خالی آ رہی تھی ۔ ٹیکسی رکی ۔ آصف نے پچھلا دروازہ کھولا ۔ ثوبیہ بے جان لاش کی طرح سیٹ پر جا بیٹھی ۔

آصف نے دروازہ بند کیا ۔ اور اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا ۔ اسے گھر کا پتہ بتایا ۔

ٹیکسی چل پڑی ۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا ۔

گھر کے گیٹ پر آصف ٹیکسی سے اترا ۔ پچھلا دروازہ کھولا ۔ ثوبیہ چپ چاپ اتر کر گیٹ میں داخل ہو گئی ۔ اس کی روح بوجھل اندھیروں میں بھٹک رہی تھی ۔ آصف اس کے ساتھ اندر نہیں گیا ۔

جب اس نے پلٹ کر دیکھا ۔ تو وہ ٹیکسی میں پھر بیٹھ رہا تھا ۔ اس کے دیکھتے ٹیکسی مع آصف کے چل دی ۔

بوجھل دل اور تھکے تھکے قدموں سے وہ اندر آ گئی ۔

—— ۞ ——

آ گئیں۔ آنٹی آ گئیں۔ ثوبیہ کے برآمدے میں پہنچتے ہی نادرہ لپکی اور جوشِ مسرت سے ثوبیہ سے چمٹ گئی۔ ککو، بجی، فاخرہ اور ہما شاید اسی آواز کے منتظر تھے۔ سبھی ڈرائینگ روم سے نکل بھاگے اور ثوبیہ کو گھیرے میں لے کر متضاد سوالات کی بھرمار شروع کر دی۔

ثوبیہ کو سمجھتے دیر نہ لگی۔ کہ آج آمینہ ثمینہ کی یہ فوج پھر وارد ہوئی ہے۔ مضمحل نڈھال اور ملول ہو رہی تھی۔ تنہائی چاہتی تھی۔ بچوں کو یونہی تھپکیاں دے دلا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

لیکن بچوں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا، کمرے میں آ دھمکے۔

"مجھے آج بہت سا کام کرنا ہے۔" وہ ان کے شور سے چڑ سی گئی۔ بچے بھلا اس کی چڑ کو اور جھلاہٹ کو کیوں کر سمجھتے۔ کبھی اس کی کتابوں کو چھیڑتے۔ کبھی پلنگ پر چڑھ جاتے۔ کبھی الماری کھول کر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگتے۔

اور — کبھی بے تکے سے سوال کرنے لگتے۔

ثوبیہ کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے نکل گئی۔ ان سے پیچھا چھڑانے کا یہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف گئی۔

"آ گئیں بیٹی —؟" منیرہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "آج اتنی دیر لگا دی۔!"

"کالج میں کچھ کام تھا۔" وہ کوشش کے باوجود ظلم کا نہ کہہ سکی۔

"ثمینہ آپا آئی ہیں؟" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"وہ تو نہیں، بچے آئے ہیں۔ کل چھٹی ہے رات یہیں گزاریں گے۔" منیرہ ہنڈیا

میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔

"لائیے میں پکا دوں۔" ثوبیہ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"نہیں۔ تم رہنے دو۔" منیرہ نے پیار سے کہا۔ "ہاں تم ذرا بڑے بکس سے بستر نکلوا کر لگا دو۔ فخری اور ساجد کے بستر اوپر آصف کے ساتھ والے کمرے میں بچھا دو۔ لڑکیاں میرے کمرے ہی میں سو جائیں گی۔"

"اچھا —"

منیرہ نے چابیوں کا گچھا ثوبیہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "سائن کی سرخ رضائی فخری کو دے دینا اور نیلی ساجد کے لیے — بچوں کے لیے چھینٹ کی رضائیاں نکال دینا اور ہاں تکیے بھی ایک طرف ہی پڑے ہیں۔ فیضی کو ساتھ لے لو۔ چادریں بھی وہیں پڑی ہیں۔"

ثوبیہ کے باورچی خانے سے جاتے جاتے وہ ہدایات دیتی رہی۔

ثوبیہ نے بستر نکلوائے۔ بچیوں کے لیے دو بستر منیرہ کے کمرے میں لگا کر باقی چیزیں فیضی سے اٹھوا کر اوپر پہنچائیں۔

آصف کے ساتھ والے کمرے میں چار پائیاں پڑی تھیں۔ اس نے دونوں چارپائیوں پر بستر بچھا دیئے۔ نڈھال نڈھال سی وہ کام میں مصروف رہی۔ شام کا تلخ واقعہ ابھی تک ذہن میں مچل رہا تھا۔ آصف کی مایوس اور محرومیوں کی آئینہ دار صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ دل بوجھل تھا۔ دماغ بوجھل تھا۔ روح بوجھل تھی۔

نیچے بچوں کی اچھل کود سے ہنگامہ بپا تھا۔ اس کا جی نیچے جانے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ رضائی کو ایک طرف اٹھا کر کے وہ اس کا سہارا لے کر نیم دراز سی ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جانے کیوں جی مچل مچل کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ تنہائی اور خاموشی کی آڑ لے کر وہ خوب روئی لیکن رو لینے کے باوجود دل ہلکا نہ ہوا۔ اک خلش۔ اک پھانس۔ اک گرہ طبیعت کو

بوجھل بنائے رہی۔ آصف۔ صرف آصف ہی کا خیال ذہن میں تھا۔ وہ کتنا افسردہ، کتنا بے کل اور کتنا پژمردہ نظر آتا تھا ان دنوں!۔

کافی دیر خیالوں میں الجھی پڑی رہی۔ پھر اٹھی۔ رضائی ٹھیک سے تہہ کر کے رکھی بتی گل کی — اور کمرے سے باہر صحن میں آ گئی۔ نیچے ابھی تک وہی شور و غل اور وہی ہنگامہ تھا۔ اس کا جی نیچے جانے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تو تنہائیوں میں ڈوب جانے کی متمنی تھی۔ ایسی تنہائیاں — جن میں وہ اپنی ذات سے بھی دور ہو جائے۔ اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو جائے۔

وہ کچھ دیر دروازے سے لگی کھڑی رہی۔ پھر بوجھل قدموں سے دائیں ہاتھ چل دی۔ آصف کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے جانے کیا خیال آیا۔ وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے مڑی۔ اور کمرے میں چلی گئی۔

دروازے کی قریبی دیوار پر لگا بجلی کا بٹن ٹٹولا اور پھر بتی جلا دی۔

"اوہ —" روشنی کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے ادھوری سی کپکپاتی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ تحیر زدہ نگاہوں سے پلنگ کی جانب دیکھنے لگی۔

پلنگ — جس پر آصف ٹانگ پر ٹانگ اور دونوں ہاتھ سر تلے رکھے آڑا ترچھا سا لیٹا تھا —

"آپ —؟" وہ برق کی سی تیز رفتاری کے ساتھ اٹھ کر اس کی جانب آیا۔ اور وہ ندامت اور گھبراہٹ میں بھاگ بھی تو نہ سکی۔ وہ تو پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔

"ثوبیہ —!" آصف پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کوٹ پیچھے سرکائے، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ثوبیہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ کام تھا —؟" آصف اس کی سرخ سرخ آنکھوں کو دیکھ کر بے کل ہو گیا۔

ثوبیہ آصف کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور کترا کر کمرے سے نکل جانا چاہا۔ لیکن آصف نے بڑھ کر اپنا بازو دروازے کی پٹ پر ٹکا کر اس کا راستہ روک لیا۔

"جانے دیں!" وہ خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔

"نہیں —" اٹل فیصلہ تھا۔

ثوبیہ نے گھبرا کر دیکھا۔ آصف کی عجیب حالت سی ہو رہی تھی۔ بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت سی تھی۔ چہرہ بے آب و گیاہ میدان کی طرح چٹیل اور ویران نظر آ رہا تھا۔

"مجھے جانے دیں —" وہ سہم کر بولی۔

"جانا ہی تھا تو آئی کیوں تھیں؟" بڑے دکھ سے وہ بولا۔

"مجھے پتہ نہیں تھا۔ آپ — آپ اندر ہیں —" وہ بدستور گھبرائی گھبرائی تھیں۔

"پتہ ہوتا تو نہ آتیں؟" بچوں کی سی معصومیت سے آصف نے پوچھا۔

"جی —" اس جی سے جانے اس کا مطلب کیا تھا۔ لیکن — اس جواب سے آصف کا چہرہ بالکل ہی ویران ہو گیا۔ دکھ درد کے سائے اتنے گہرے ہو گئے۔ کہ وہ مجسم غم نظر آنے لگا۔

راستہ روکنے والا بازو ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گیا۔ اس نے دونوں بازو سمیٹ کر چھاتی پر باندھ لیے۔ اور ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا "نفرت میرے لیے انجانی چیز نہیں۔ اور — پھر چند لمحوں کے رمز فرسا سکوت کے بعد بڑی لاتعلقی سے بولا۔

"آپ جا سکتی ہیں۔"

وہ تیزی سے مڑا۔ اور اپنے پلنگ کی جانب چل دیا۔ اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ واضح تھی۔ ثوبیہ نے اسے دیکھا۔ صبر و ضبط کا یارا نہ رہا۔

"آصف!" وہ گلوگیر آواز میں کہتے ہوئے اس کی جانب والہانہ انداز میں بڑھی۔
اس کا بازو تھام کر اپنا سر اس کی پشت سے ٹکا دیا۔
"آپ — آپ — سمجھتے کیوں نہیں۔ آصف!" اس کی آواز گھٹ گئی۔ اس کا وجود کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو سیال رود بن کر بہنے لگے۔
آصف اس انتہائی غیر متوقع التفات سے بوکھلا گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اور جب سمجھا — تو اسے یوں لگا جیسے وہ فضا کو چیرتا ہوا خلا میں پہنچ گیا ہو۔
خلا — جہاں وہ سانس تک نہ لے سکتا ہو۔
اور جہاں توازن قائم رکھنا بھی ممکن نہ ہو۔
"آصف — آپ سمجھ کیوں نہیں جاتے۔ آصف۔ آپ" سسکیوں سے ابھرتی آواز آصف کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔
وہ بے تابی سے پلٹا۔ دوسرے لمحے وہ خلا سے لوٹ چکا تھا۔
ثوبیہ اس کے مضبوط بازوؤں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔
اور — وہ — وہ — تقدیر کی اس غیر متوقع نوازش پر حواس کھوئے جا رہا تھا۔ —

کی رات بھیگتی جا رہی تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور پوری بستی پر چاندنی سرد یوں کا گھلا گھلا نور لمسوں کا جال پھیلائے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کی سرگوشیاں پُراسرار سی ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر سُو خاموشی تھی۔ جسے گاہے گاہے کتوں کے بھونکنے کی آواز توڑ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے استادہ کھمبوں کے ساتھ لگی ٹیوب لائٹیں مدھم مدھم روشنی بکھیرتی نظر آ رہی تھیں۔
آصف کب سے بالکنی میں ستون کے سہارے کھڑا بے معنی سی نظروں سے سڑک کی بے نور روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وقت کا اسے احساس تھا نہ سردی کا۔ آج خوشیوں کی ایکا ایکی یلغار نے اسے بے سُدھ کر دیا تھا۔
اسے رہا تھا۔ جیسے اس کا وجود ہر بوجھ سے آزاد ہو کر ہوا کی سبک لہروں کے دوش پر اڑتا چلا جا رہا ہو۔
جیسے وہ کوئی مسرور سا نغمہ ہو جو انبساط کی کوکھ سے جنم لے کر آسودگی کی گود میں پروان چڑھ رہا ہو۔
یا جیسے وہ کوئی صاف و شفاف پانی کی ندی ہو۔ جو بڑی روانی سے گاتی گنگناتی اپنی منزل کی جانب بڑھی جا رہی ہو۔
رات گزرتی جا رہی تھی۔ اور آصف کی جنوں خیزیوں کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔
آج اس کو کسی نے اپنا لیا تھا۔ آج وہ کسی کا ہو گیا تھا۔
پیار کے چشمے ابل پڑے تھے اور اس کی جنم جنم کی پیاسی روح ان سے سیراب ہو رہی تھی۔

اسے اپنے بازوؤں میں سسکیاں بھرتی ثوبیہ کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے کانپتے وجود کی لرزش کا احساس ابھی تک باقی تھا۔ بالکنی سے ہٹ کر وہ صحن میں آگیا۔ کافی دیر خیالوں کے تانے بانے بُنتے ہوئے ٹہلتا رہا۔ کبھی مستقبل کے سہانے روپ نظر آتے۔ کبھی ماضی کی تلخ ترش یادیں ذہن میں منڈلانے لگتیں۔

اسے وہ دن شدت سے یاد آرہا تھا جب ثوبیہ یہاں پہلی بار آئی تھی۔ اس کے والدین اسے یہاں چھوڑ کر تھوڑی ہی دیر پہلے ملتان روانہ ہوئے تھے۔ وہ باہر سے آیا تو ثوبیہ میز کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ درمیانی میز پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ چائے پی جاچکی تھی۔ ثوبیہ قدرے گھبرائی۔ قدرے سہمی سی بیٹھی تھی۔ اس نے سفید لٹھے کی شلوار پر آسمانی چوکور خانوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اسی کے ہم رنگ دوپٹہ تھا۔ تراشیدہ بال خوبصورتی سے بنے ہوئے تھے۔

اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اک بھرپور نظر ڈالی تھی۔ وہ شاید کچھ سمٹ بھی گئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اسے کوئی اہمیت دیے بغیر سامنے والے دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"آصف بیٹے ——؟" ماں نے کچھ زیادہ ہی پیار بھرے لہجے میں پکارا تھا۔

"کیا ہے؟" اس کا لہجہ بے انتہا اکھڑ تھا۔ شاید اسی لیے ثوبیہ نے چونک کر پوری آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"کبھی تو سیدھے منہ بات کیا کرو۔" ماں شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

لیکن اسے ماں کی خفت کا احساس ہوا تھا۔ نہ ثوبیہ کے چونک جانے کا۔ اپنی عادت کے مطابق بے پروائی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔ ثوبیہ کو اہمیت دینا تو کجا۔ اس نے پلٹ کر اسے اک بار دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔

آصف کو وہ وقت یاد کر کے افسوس ہو رہا تھا۔ کاش پہلے دن ہی وہ ثوبیہ کی

جانب جھک گیا ہوتا۔ اس کی زندگی میں بہاروں ہی بہاروں کا حسن بھر گیا ہوتا۔

پھر یکے بعد دیگرے اسے کئی واقعات یاد آنے لگے۔ جب ثوبیہ کی قربت کا یقینی امکان تھا لیکن ہر بار اس نے یہ موقع اپنی ہٹ دھرمی اور اکھڑ پنے سے کھو دیا تھا۔

اسے وہ شام بھی یاد آئی —— ثوبیہ کو گھر میں آئے تقریباً دس دن ہو چکے تھے۔ ان دس دنوں میں ایک بار بھی اس نے ثوبیہ سے بات کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔

شام ہو رہی تھی اور وہ کسی ریسٹورانٹ میں وقت گزارنے کے خیال سے تیار ہو کر نیچے آیا۔ کوریڈور میں اس نے ثوبیہ کو دیکھا۔ لیکن حسبِ عادت اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے گزرا۔

"آپ ——!" ثوبیہ نے اسے پکارا۔

"مجھے بلایا؟"

"جی۔"

"کیوں؟"

"کچھ۔"

"کیا ——؟ کچھ ——!"

اس کے جھلانے سے ثوبیہ شاید ڈر گئی تھی۔ جلدی سے بولی:

"آپ بازار جا رہے ہیں؟"

"جا رہا ہوں تو پھر!"

"میں نے ایک کتاب منگوانی ہے۔"

"منگوانی ہے تو منگوالیں۔ میں کیا کروں۔"

"آپ جا ہی رہے ہیں —— واپسی پر لیتے آئیے گا۔"

"میں نہیں لا سکتا۔"

"صاف صاف جواب دے کر وہ باہر چل دیا۔ ثوبیہ کی طرف مڑ کر اس نے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔

کتنا کم فہم تھا وہ۔ کتاب لا کر دینے کا تو بہانہ ہی ہو جاتا۔ اپنے جنگلی پنے پر تاسف سے ہاتھ ملتا۔ آصف اپنے کمرے میں آ گیا۔

اور — پھر — پھر — اسے وہ رات یاد آ گئی۔ جب مجید منیرہ کو نئے پردوں کے لیے خریدا ہوا کپڑا دکھا رہا تھا۔ ثوبیہ بھی منیرہ کے ساتھ کپڑے کی تعریف کر رہی تھی۔

"بہت ہی خوبصورت ہے۔"

"رنگ بہت اچھا ہے۔"

"یہ پھول صوفے کی مناسبت سے بہت بھلے لگیں گے۔ سادہ پردے تو بالکل نہ اچھے لگتے۔"

"قالین کے ساتھ بھی یہ رنگ بہت اٹھے گا۔"

"کپڑا قیمتی بھی ہے نا — ہاتھ میں لے کر دیکھو۔ کتنا موٹا ہے۔"

"واقعی — واقعی۔!"

"بہت عمدہ چیز ہے۔"

"ہونہہ" آصف ان کی تعریف اور مجید کے پھولے نہ سمانے سے چڑ گیا۔

"کیوں؟" ثوبیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"خواہ مخواہ تعریف کیے جانا عورت کی سرشت میں داخل ہے شاید۔" آصف نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیوں؟ چیز بھی تو دیکھیں کتنی اچھی ہے۔ تعریف یونہی تو نہیں کر رہے ہم۔" ثوبیہ شاید اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"یہ بھی کوئی خریدنے کی چیز ہے۔" آصف اس سے زیادہ مجید کے چہرے کے اُتار

چڑھاؤ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"تمہاری پسند کے کیا کہنے — جواب کہاں ہے؟" — مجید نے طنزیہ کہا۔

"اس میں شک ہی کیا ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

کبھی پسند کی چیز خرید کر لانے کی توفیق تو ہوتی نہیں۔ باتیں بنانا آتی ہیں بس۔" مجید نے غصے سے جل بھن کر کہا۔

"یہ بھی کسی کسی کا کام ہے۔" ثوبیہ نے مذاق کے انداز میں کہا۔

"چپ رہو آصف۔" ماں نے آصف کے کسی جواب سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

"کیوں؟" وہ تنک کر بولا۔

"کیوں منہ لگتی ہو اس کے۔" مجید اسے کرخت نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "بات کرنے کی اسے تمیز ہی نہیں۔"

منیرہ چپ ہو گئی۔ مجید اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد منیرہ بھی باورچی خانے کی طرف چل دی۔ ثوبیہ دانستہ وہاں کھڑی رہی۔

آصف نے کپڑا ہاتھ میں لیا اور پھر جھٹکا دینے کے انداز میں قالین پر پھینک دیا۔

"مجید چچا کتنی خوشی سے کپڑا لائے تھے۔ آپ نے بھی تعریف کر دی ہوتی۔" ثوبیہ نے متبسم نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہ کرو۔" تڑاخ سے آصف نے کہا۔ اس کا موڈ یک لخت اتنا خراب ہو گیا۔

ثوبیہ نادم ہو گئی اور وہ زور زور سے پاؤں زمین پر پٹختا کوریڈور میں چلا گیا۔

آصف اس سے یگانگت اور لگاؤ کی دو چار باتیں ہی کر لیتا۔ تو وہ کتنی مدت پہلے ہی اس کے قریب آ گئی ہوتی۔

لیکن وہ تو اپنے مزاج کے تلوّن اور عجیب و غریب عادات کی وجہ سے اس سے دُور

دُور ہی ہوتا گیا تھا۔

لپک جھپک کر کئی یادیں اس کے ذہن میں ابھریں۔ سب ہی تلخ و ترش تھیں۔ اسے اپنا ہی قصور نظر آیا۔ اس نے کبھی ثوبیہ کو اچھا تاثر دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی اپنی الٹ پلٹ حرکات کو اس سے چھپانے کی سعی نہیں کی تھی۔

لیکن — اس کے باوجود آج! آج اس کی زندگی نے اتنا حسین پلٹا کھایا تھا۔ آج ثوبیہ اس کی ہو گئی تھی۔

آج وہ ثوبیہ کا ہو گیا تھا۔

زندگی کا وہ خلا جو کبھی پُر ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ آج یوں اچانک بھر گیا تھا۔

آصف کا جی جھوم جانے کو چاہ رہا تھا۔

بستر میں لیٹ کر بھی اسے بڑی دیر نیند نہ آئی۔ ثوبیہ کا حسین تصور نگاہوں میں تھا۔ نیند ان نگاہوں سے یہ جگ مگ کرتا تصور چھین لینے کی جرأت ہی نہ کر سکتی تھی۔

—

"خالہ جان۔!"

"جی بیٹے۔"

"میں آج دیر سے گھر آؤں گی۔"

"کیوں — ؟"

"کالج میں پارٹی ہے۔ ہماری ایک مس جا رہی ہیں۔ انہیں الوداعی دعوت دی ہے۔"

"کب تک لوٹو گی؟"

"شام ہو ہی جائے گی۔ آپ فکر نہ کیجئے گا۔ میں عارفہ اور جمیلہ کے ساتھ آجاؤں گی۔"

"بہت اچھا۔ کوشش کرنا جلدی آجاؤ۔ تمہیں دیر ہو جائے تو میرے جی میں سینکڑوں وسوسے رینگنے لگتے ہیں۔ آج کل کا زمانہ بھی تو بڑا خراب ہے بیٹی۔ احتیاط ہی بھلی۔"

"آپ بے فکر رہیں خالہ جان۔ میں اکیلی کبھی نہیں آتی۔ عارفہ اور جمیلہ ساتھ ہوں گی۔"

ثوبیہ اپنی کتابیں اٹھا منیرہ کو سلام کر کے باہر نکل گئی۔ چمن عبور کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آصف برآمدے میں کھڑا تھا۔ گرے پتلون اور جیکٹ کوٹ میں وہ بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ ثوبیہ اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ آصف بھی مسکرایا۔

ثوبیہ گیٹ سے نکل کر سڑک پر ہو لی۔ بس سٹاپ تک اسے روزانہ پیدل جانا پڑتا تھا۔

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ ان دنوں اس کے دل و دماغ پر آصف ہی چھایا ہوا تھا۔ رات گئے تک دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہتے۔ آصف کا بہانہ پڑھنے کا ہوتا۔ اور ثوبیہ کا درس کی کتاب لیکن کہاں وہ اور کہاں کورس کی کتاب۔

دونوں کتابِ عشق کے اوراق الٹتے پلٹتے بہت دُور نکل جاتے۔

ثوبیہ اس وقت بھی رات کی باتیں یاد کر رہی تھی۔ کس سادگی سے آصف اپنے جذبات کا اظہار کر دیتا تھا۔ ثوبیہ کو اس کا یہ انداز کتنا بھاتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ وقت وہیں تھم جایا کرے۔ اور آصف سادگی کے دل نشین انداز میں مَن کی ساری باتیں اس سے کہتا رہا کرے۔

ٹن۔ ٹن۔ ٹناں ٹُنن ٹن۔ سائیکل کی گھنٹی کی مسلسل آواز پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

"اوہ۔ آپ۔!" وہ مسکرادی۔

"اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا تھا۔ تم سن ہی نہیں رہی تھیں۔" آصف ہنستے ہوئے سائیکل سے اُتر کر اس کے برابر چلنے لگا۔

"گھنٹی بجانے میں بڑے ماہر ہیں۔" ثوبیہ نے شوخی سے کہا۔

"متوجہ کرنے کا آسان ترین طریقہ ہے۔" وہ ہنسا۔

"ایسی کیا ضرورت تھی متوجہ کرنے کی۔ ابھی ابھی تو گھر سے آئی ہوں۔"

"بڑی اشد ضرورت۔"

"یعنی ——؟"

"آج تمہارے کالج میں پارٹی ہے؟"

"ہاں۔"

"کتنے بجے ——؟"

"تقریباً چار بجے۔"

"چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟"

"تین بجے۔"

"ہوں۔"

"یہ اتنی لمبی تمہید کس سلسلے میں بندھی؟"

"میں تین بجے تمہیں لینے آؤں گا۔"

"مجھے ——؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی!"

"بہت بھلی بات۔ تم پورے تین بجے گیٹ پر آجانا۔"

"پھر؟"

"پھر میں تمہیں اغوا کر لوں گا۔"

"اوئی اللہ! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"بڑی دلفریب۔"

"توبہ۔ توبہ!"

دونوں ہنس دیئے۔ کچھ دیر دونوں خاموشی سے قدم اٹھاتے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"آپ دفتر جا رہے ہیں؟"

"ابھی نہیں!"

"پھر کہاں؟"

"واپس گھر۔"

"گھر؟"

"ہاں تمہیں صرف پیغام دینے آیا تھا۔"

"جی۔"

"بھری ہو۔ کہنا۔ تین بجے کالج آؤں گا۔"

"ہائے اللہ۔ آپ۔"

"آپ۔ آپ کچھ نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ پورے تین بجے آؤں گا۔ پھر۔ پھر ہم کہیں باہر جائیں گے۔ تین چار گھنٹے پارٹی میں ضائع کرنے سے بہتر نہیں کہ ہم دونوں یہ وقت اکٹھا گزاریں۔"

"لیکن!" وہ گھبرا کر بولی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" آصف نے مسکراتے ہوئے پیڈل پر پیر رکھا اور اسے ٹاٹا کرتا واپس ہو لیا۔

ثوبیہ عجب سی کش مکش میں مبتلا ہو گئی۔ وہ رات گئے تک آصف کے ساتھ بیٹھی رہتی تھی۔ دن میں بھی کئی دفعہ اس کے قریب ہوتی تھی لیکن اس کے ساتھ کہیں اکیلا جانے کا اتفاق اب تک نہ ہوا تھا۔ کالج سے یوں فرار ہو کر اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے تصور ہی سے اسے ڈر لگنے لگا۔ آصف کی قربت کا ہر لمحہ سرور انگیز سہی لیکن وہ اتنی بڑی جرأت پر اپنے کو آمادہ نہ کر سکی۔

کالج میں سارا وقت وہ پریشان۔ تذبذب کا عالم تھا نا اور وہاں کے درمیانی مرحلے جاں لیوا تھے۔ کبھی آصف کے ساتھ جانے میں قباحت نظر آتی اور کبھی دل کے تقاضے اس سنہری موقعہ سے استفادہ کرنے پر اکساتے۔ کوئی ہرج نظر نہ آتا۔ کوئی برائی محسوس نہ ہوتی۔ وقت گزر رہا تھا۔ اور اس کے ہر لمحے کے ساتھ ثوبیہ کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اور آخر پیریڈ میں تو وہ اتنی نڈھال ہو گئی۔ کہ شکو کو پوچھنا پڑا۔

"کیا ہو رہا ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے شکو!"

"باہر جا کر چمن میں تھوڑی دیر بیٹھو۔"

اس کی طبیعت واقعی بگڑ گئی۔ شکو اسے لے کر باہر آ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے بہلاتی رہی۔ عارفہ، شاہین اور ریحانہ بھی آ گئیں۔

"پتہ نہیں۔ مجھے کیا ہو رہا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"گھر چلی جاؤ۔" ریحانہ نے کہا۔

"لیکن پارٹی؟" ثوبیہ مجبرانہ انداز میں بولی۔

"پارٹی ایسی کون سی ضروری ہے۔" شاہین نے کہا۔

"طبیعت یوں خراب ہو تو پارٹی میں شرکت کے لیے۔ خود بھی بور ہو گی۔ اور دوسروں کو بھی کرو گی۔" شکو نے کہا۔ "تم گھر ہی چلی جاؤ۔ تو اچھا ہے۔"

اور۔ جانے یہ سہیلیوں کا مشورہ تھا۔ دل کا تقاضا یا آصف کا اصرار۔ ثوبیہ جھٹ ہوتے ہی گیٹ پر پہنچ گئی۔ سڑک کے پار سامنے والے فٹ پاتھ پر آصف بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس کی نظریں گیٹ پر ہی جمی تھیں۔ ثوبیہ کے باہر آتے ہی اس کے چہرے پر فاتحانہ سی چمک آ گئی۔

ثوبیہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سہمی سہمی سی گیٹ سے نکلی اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی دائیں ہاتھ چل دی۔ آصف کی طرف اس نے دیکھنے کی جرأت ہی نہ کی۔ آصف نے ادھ جلا سگریٹ زمین پر پھینک کر بوٹ سے مسل دیا۔ اپنے تلے قدموں سے سڑک پار کی اور ثوبیہ کے تعاقب میں آ گیا۔ دو لمحوں بعد وہ ثوبیہ کے برابر چل رہا تھا۔

"بھاگی کیوں جا رہی ہو—؟" آصف نے آہستگی سے کہا۔

ثوبیہ نے ڈری ڈری سہمی سہمی نظر اس پر ڈالی۔ آصف مسکرا دیا۔

"تم آ ہی گئیں—؟"

"بری بات ہے آصف" وہ گھبراہٹ میں بولی۔

"بری بات تھی۔ تو آئی ہی کیوں تھیں—؟" آصف نے لاپروائی سے سگریٹ سلگایا۔

"آپ کی خفگی کا بھی تو ڈر تھا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی؟" آصف انتہائی مسرور لہجے میں بولا۔

"اور کیا ——" ثوبیہ شکوہ کرنے کے انداز میں بولی۔ "آپ سنجیدگی سے بولا۔

"تو اور کیا ——؟"

"میں کتنا خوش نصیب ہوں ثوبیہ۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے۔ جیسے میں —— میں نہیں کہا۔ کسی اور وجود میں ڈھل گیا ہوں۔ اتنی اہمیت کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔" اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے دھیرے سے ثوبیہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ "تم یقین نہیں کرو گی ثوبیہ میں آج کل کتنا خوش ہوں۔ خوشیوں کی یلغار کے سامنے اپنے دل کی وسعتیں بھی تنگ معلوم ہونے لگتی ہیں۔"

"شاعری جانے دیجئے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو ——" ثوبیہ اب تک خوف زدہ سی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اَن گنت سائے اس کے تعاقب میں دوڑ رہے ہوں۔ آصف کی باتیں سنی ان سنی کر کے وہ بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"اتنا ڈرتی کیوں ہو ثوبیہ ——؟" آصف نے اس کے بار بار پلٹ کر دیکھنے پر کہا۔

"بزدل ہوں۔" ثوبیہ نے جبراً مسکرا کر کہا۔

"کسی کی پرواہ نہ کرو ——" کسی کی بھی نہیں۔" آصف اپنی رَو میں کہے گیا۔ "میری طرح۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ کسی کی پروا نہیں۔"

پھر اس نے سامنے سے آنے والی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"کہاں جا رہے ہیں ——؟" ثوبیہ نے سہم کر پوچھا۔

"چپ چاپ چلتی جاؤ۔ خود بخود پتہ چل جائے گا۔ کہاں جا رہے ہیں۔" آصف نے کہا۔

ٹیکسی رکی۔ "شیراز" پچھلی سیٹ پر ثوبیہ کے برابر بیٹھتے ہوئے آصف نے کہا۔

ثوبیہ نے گھبرا کر کچھ کہنا چاہا لیکن آصف نے اس کا ہاتھ دفورِ جذبات سے دبا کر اس کی آنکھوں میں اس حسین انداز میں جھانکا۔ کہ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

شیراز میں جانے پینے کے بعد بھی وہ کافی دیر وہیں بیٹھے رہے۔ ثوبیہ کو ہر آن یہی

دھڑکا تھا۔ کہ کوئی جاننے والا دیکھ نہ لے۔ لیکن اس کے برعکس آصف مطمئن تھا۔ ثوبیہ کی گھبراہٹ خوب لطف لے رہا تھا۔

"اب تو میں کبھی یہاں نہیں آؤں گی۔" ہوٹل سے نکلتے ہی ثوبیہ نے کہا۔

"کیوں ——؟"

"میرا تو سیر بھر خون کم ہو گیا۔ یہی دھڑکا لگا رہا۔ کسی نے دیکھ لیا تو!"

"بزدل۔" وہ مسکرایا۔

"بزدل سہی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اچھا کل یہاں نہیں آئیں گے کہیں اور چلیں گے۔" آصف نے شوخ نظروں سے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

ثوبیہ نے بظاہر خفگی کے انداز میں اسے گھورا لیکن آصف کی شوخ نظروں کی گدگدی سے وہ مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔

وعدہ رہا نا؟ آصف نے بڑی محبت اور اپنائیت سے کہا۔

"کل دریا کے کنارے چلیں گے۔ وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ آج کی طرح سہمی سہمی نہیں ہو گی چلو گی نا ——؟ بولو نا ۔ وعدہ کرو!"

ثوبیہ مسکرا دی۔

اس مسکراہٹ کو وعدہ سمجھ کر آصف مسحور سا ہو گیا۔

—— ❊ ——

گوشۂ مغرب میں دم توڑ رہا تھا۔ اس کے خون سے سینہ چرخ داغدار تھا۔ دریا کے پانی پر خونِ ناحق کی سرخی چھلک رہی تھی۔

سورج

موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ دھیرے دھیرے بہتے پانی میں اٹھنے والی پُرسکون سی لہروں کا ہلکا ہلکا شور فضا کو نغمگی بخش رہا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوائیں مدہوش کن تھیں۔ درختوں کی جھکی جھکی شاخوں سے بھیگے بھیگے مترنم جھونکوں کی چھیڑ بڑی جانفزا تھی۔

فضا انتہائی رومان پرور تھی۔

آصف اور ثوبیہ دریا کے اس ریتلے۔ ویران اور سنسان کنارے پیار کی راہیں آباد کر رہے تھے۔ ہاتھ میں ہاتھ دونوں کبھی ٹہلنے لگتے۔ کبھی کسی درخت کے موٹے تنے کے سہارے بیٹھ جاتے۔ کبھی جھک کر پانی اچھالنے لگتے۔ کبھی دونوں باتیں کرنے لگتے اور کبھی خاموشی سے ایک دوسرے کی قربت کے جانفزا احساس سے مغلوب مغلوب اپنے اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے لگتے۔ آصف تو خوشی اور فرحتی آسودگی سے جیسے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ مدتوں کی تشنہ تمنائیں بر آئیں اسے پیار مل گیا تھا۔

پیار۔ جس کے لیے ۔۔۔ وہ۔ عمر بھر ترسا تھا ۔۔۔

ثوبیہ اس کے جذبات کی شدت سے تو آگاہ تھی۔ لیکن نوعیت سے بے خبر۔

دریا کا سنسان کنارہ، رومان پرور فضا۔ تنہائی اور ایک نوجوان مرد کا ساتھ۔ وہ اپنے آپ سے ڈر رہی تھی۔ سینے میں طوفانوں کا شور تھا۔ جذبات نشہ بن بن کر حواس پر چھائے جا رہے تھے۔ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے کئی بار آصف کا ہاتھ زور سے دبایا

تھا۔ کئی بار اس کی چوڑی چھاتی سے گرنے کے بہانے ٹکرا گئی تھی۔ اس کی گہری گہری فسوں خیز آنکھوں میں ڈوب جانے کی تمنا میں کئی بار لڑکھڑا کر اس کے بازوؤں کا سہارا لیا تھا۔

مخمور و سرشار آصف بھی تھا لیکن اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی جیسے اخلاق کی حدود سے باہر کہا جا سکے۔ ثوبیہ تو اس کا مقدس پیار تھی۔ اس تقدس میں کسی جذباتی لغزش یا سفلی جذبے کی آلائش نہ تھی۔

"چلو آصف واپس چلیں۔" ثوبیہ کا خوف اور جذباتی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے وہ گھبرا گئی۔

"ابھی سے۔" آصف مطمئن سے انداز میں بولا۔

"ہاں" اس نے بیچارگی سے آصف کو دیکھا۔

"کیوں؟" وہ قدرے حیران ہو کر بولا۔

"بس۔" اس نے مختصر سا جواب دے کر گردن جھکا لی۔

"یہ ہوٹل تو نہیں۔ جہاں کسی کے دیکھ لینے کا دھڑکا تھا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ ایک تم ۔۔۔ ایک میں ۔۔۔" آصف نے لاپروائی سے کہا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں۔ واپس چلو۔" وہ جانے پر اصرار کرنے لگی۔

"ابھی کچھ زیادہ وقت تو نہیں ہوا۔ تم نے جانے کی رٹ بھی لگا دی۔ اللہ قسم اپنا تو جی چاہ رہا ہے۔ زندگی یہیں بیت جائے۔ یہ مہکتی ہوئی تنہائی۔ یہ خوش فضا۔ اور یہ۔ یہ اپنی۔ بالکل اپنی ثوبیہ کا ساتھ۔ اس نے قدرے جھک کر ثوبیہ کی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے جھانکا۔ ان گہری گہری آنکھوں کے خاموش طوفانوں سے ثوبیہ ایک بار پھر لرز گئی۔

"آصف واپس چلو۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"پھر وہی بے تکی بات۔ دیکھو تو موسم کتنا حسین ہے۔ اس ڈوبتے سورج کو دیکھو۔ پانی پر تھرکتی اس لالی پر نگاہ ڈالو۔"

"سب ٹھیک ہے۔ لیکن!"

"لیکن کیا؟"

"یہاں۔ یہاں اکیلے۔ آنا اچھا نہیں آصف۔" رک رک کر اس نے کہہ ہی دیا۔

"کیوں؟" آصف نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"ڈر لگتا ہے" وہ نظریں چرا کر آہستگی سے بولی۔

"کس سے؟" آصف اب بھی کچھ نہ سمجھا۔

"آپ سے" وہ سنجیدہ سی آواز میں بولی۔

"کیوں؟" وہ ایک دم حیران ہو کر اسے تکنے لگا۔

ثوبیہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خفت سے مسکرا دی۔ آصف اس کی خفیف مسکراہٹ کا مطلب سمجھ کر افسردہ سا ہو گیا۔

"مجھ پر اعتماد نہیں؟" اس نے کچھ ایسے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ کہ ثوبیہ لاجواب ہو گئی۔ سر جھکا کر نادم سی مسکراہٹ لبوں پر لیے وہ گیلی گیلی ریت پر اپنے جوتے سے نیم دائرے سے بنانے لگی۔

کچھ دیر بعد عجیب سی چھائی رہی۔ ثوبیہ نظریں اٹھا کر آصف کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔

"ثوبیہ!" آصف نے چند لمحوں کے بوجھل سکوت کے بعد کہا۔

"جی" وہ اسی انداز میں سر جھکائے بولی۔

"تم میرے جذبات کو شاید نہیں سمجھ سکتیں۔ میں نے زندگی بھر بھٹکنے اور گھر گھر کے گھاٹ کھانے کے بعد تمہیں پایا ہے۔ مجھے پیار کی متاع اب ملی ہے۔ تم نہیں جانتیں۔ یہ متاع مجھے کتنی عزیز ہے۔ میں تمہیں بتاتا اور یقین دلاتا ہوں ثوبیہ۔ اس نے نرم و گداز ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور سنجیدگی سے بولا۔

ثوبیہ ویران اور سنسان تنہائیاں ہوں۔ یا راتوں کی پُراسرار تاریکیاں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرا تمہارا ساتھ تقدس کا امین ہو گا۔ میں اپنے پیار کی تقدیس پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔" اس نے بڑی ملائمت سے ثوبیہ کا ٹھنڈا ہاتھ دبا دیا۔ اور پھر اسی انداز میں بولا۔

"میری طرف سے کوئی خدشہ۔ کوئی وسوسہ تمہارے دل میں ہے۔ تو اسے گناہ سمجھ کر دل سے نکال دو۔ اگر تمہارے ذہن میں میرے لیے ذرہ بھر بھی بد اعتمادی ہوئی تو میں اسے جذبوں کی توہین سمجھوں گا۔"

آصف نے اس کا ہاتھ چھوڑ دینے کو اپنا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ لیکن ۔۔۔ ثوبیہ نے اس کے ہاتھ پر اپنے نرم و گداز ہاتھ کی گرفت سخت کر دی۔ اس کی آنکھوں میں شرم سے بوجھل بوجھل آنکھیں ڈال کر بڑے حسین انداز میں مسکرا دی۔ شاید اس کی محبت ہر ڈر اور ہر خوف کے سامنے سینہ سپر ہو گئی تھی۔

"ثوبیہ ۔۔۔!" آصف نے اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر دبا دیا۔

"تم کتنی اچھی ہو ثوبیہ۔ کتنی اچھی ہو۔"

دونوں مسحور و مسرور دریا کے سنسان کنارے ٹہلتے رہے۔ شام کے دھندلکے جب خاصے گہرے ہو گئے تو آصف ثوبیہ کو ساتھ لے کر واپس ہوا۔

"کل پھر یہیں آئیں گے نا؟" اس نے ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے ثوبیہ سے وعدہ لیا۔

"اچھا۔" اس نے سحر زدہ سی آواز میں کہا۔

آصف نے بس سٹاپ کے قریب اسے ٹیکسی سے اتارا۔ خود پھر شہر کی جانب لوٹ گیا۔ عمران سے ملے آج کئی دن ہو چکے تھے نا۔

ثوبیہ گھر کی طرف چل دی۔

منیرہ اس کے انتظار میں برآمدے ہی میں ٹہل رہی تھی۔ پرائی بیٹی کی ذمہ داری سر لی ہوئی تھی۔ اس لیے جب بھی وہ دیر سے گھر لوٹتی۔ وہ فکر مند ہو کر اس کا انتظار کیا کرتی

"آج پھر اتنی دیر لگادی بیٹی!" اس نے ثوبیہ کو دیکھتے ہی سکھ کا سانس لیا۔

"آجکل ہمارے پریکٹیکل شروع ہو گئے ہیں خالہ جان۔ دیر سے آیا کروں تو فکر نہ کیا کریں۔" اس نے راستے میں سوچا ہوا بہانہ بڑی جرأت سے خالہ کے گوش گزار کر دیا۔

"اتنی دیر تو نہ لگایا کرو۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔"

"کہا نا خالہ جان! آپ فکر نہ کیا کریں۔ پریکٹیکل ہوتے ہیں دیر ہو جایا کرے گی۔"

جذبات کی آندھی چڑھی تھی۔ ثوبیہ انجام و عواقب سے بے خبر ہو گئی تھی۔ خالہ کو مطمئن کر کے وہ اپنے کمرے میں چل دی۔ کتابیں میز پر پھینکیں۔ دوپٹہ کرسی پر۔ اور دھم سے بستر پر گر کر آنکھیں بند کر لیں۔

آصف کی باتیں کانوں میں شیریں نغمے کی طرح اترنے لگیں۔

اور

وہ بے خود سی — بے سدھ سی ان باتوں کی شیریں نغمگی میں کھوئی کھوئی پڑی رہی۔

—÷—

آصف کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرہ پھر کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ وہ غصے سے جھنجھلا گئی۔ ابھی پرسوں ہی تو اس نے کمرے کی صفائی کی تھی۔ ہر چیز ترتیب اور قرینے سے رکھی تھی۔ آصف کو اچھا خاصا لیکچر دیا تھا۔ اس وقت وہ کتنی فرماں برداری سے سنتا رہا تھا۔ چیزیں الٹ پلٹ نہ کرنے اور کمرے کو حتی الوسع صاف ستھرا رکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

لیکن آج کمرے کی وہی حالت دیکھ کر وہ غصے سے بھنّا گئی۔ آصف آخر بچہ تو تھا نہیں۔ اتنا بڑا آدمی اور ایسی الٹ پلٹ عادتیں۔ اسے کچھ گھن سے آنے لگی۔ فیضی کو بلوا کر اس نے کمرے میں جھاڑو دلوائی۔ خالہ سے دھلے ہوئے پلنگ پوش اور میز پوش لیے نیچے سے گلدان لا کر اس میں پھول سجائے۔ گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد اس نے کمرہ درست کیا۔ میلے کپڑوں کا ڈھیر اکٹھا کر کے صحن میں تخت پر پھینکا۔

کھڑکی سے شیو کی چیزیں اٹھا کر غسل خانے میں لے گئی اور جب وہ دیوار کے ساتھ لگی میز پر چیزیں رکھ کر واپس کمرے میں آئی تو آصف کندھے پر کوٹ لٹکائے گنگناتا ہوا کمرے میں آدھمکا تھا۔

"زہے نصیب۔" وہ اسے دیکھتے ہی بڑی خوش دلی سے مسکرایا۔ کوٹ پلنگ پر پھینک دیا۔ ہونٹوں میں دبا سگریٹ لاپروائی سے دروازے کے قریب پھینک کر بوٹ سے مسل دیا۔

"ثوبیہ تم ناحق تکلیف کرتی ہو۔" اس نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے اسکی طرف دیکھا۔

"واقعی ناحق تکلیف کرتی ہوں۔ وہ غصے سے بولی۔ "آئندہ نہیں کروں گی۔"

"اوہو" وہ بڑے مستی بھرے انداز میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "بڑے رعب ہو۔ خیریت ——؟"

"آپ نے کمرے کا وہی حال پھر کر دیا تھا۔ کوئی چیز ٹھکانے پہ نہیں تھی۔" ثوبیہ نے خفگی سے منہ بنایا۔

"ہاہاہا۔" آصف نے اک قہقہہ لگایا۔ "تو جناب اس بات پر غصے میں ہیں؟"

"غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو۔" وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔

"ہر چیز بے ترتیب ہر شے بے ٹھکانہ۔ اللہ جانے آپ کو قرار کیسے آتا ہے۔"

"قرار۔" آصف ہنس کر اس کے قریب آگیا۔ "تمہیں دیکھتا ہوں تو قرار آجاتا ہے۔"

"ہٹیے۔" ثوبیہ بڑے ناز سے ہونٹ ٹیڑھے کر کے مسکرائی۔

"دیکھو ثوبیہ۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ٹائی کھول کر کندھے پر ڈالی۔ اور قمیض کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے نا۔ یہ بے ترتیبی میری زندگی میں کچھ اس طرح رچ بس گئی ہے۔ کہ اب ترتیب سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ یقین مانو اس طرح صاف ستھرا کمرہ ہو تو مجھے بے چینی سی لگی رہتی ہے۔ چیزیں ترتیب سے پڑی ہوں تو مجھے کوفت ہونے لگتی ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ یہی احساس ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے مجھ سے میرا ٹھکانہ چھین لیا ہو۔" ثوبیہ حیران حیران سی کھڑی اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"حیران کیوں ہو رہی ہو؟" وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "اللہ قسم، تمہارا حکم ماننے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہی بے چینی اور بے قراری اعصاب پر مسلط ہو گئی۔ یوں سمجھو کہ کمرے کو بے ترتیب کرنے پر میں مجبور ہو گیا۔"

ثوبیہ حیران سی کھڑی اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ آصف بات مذاق میں کہتا تو اسے عجیب نہ لگتا۔ لیکن وہ تو سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

آصف قدم بڑھا کر اس کے قریب آگیا۔ کندھے پر پڑی ٹائی اتاری اور ثوبیہ کی گردن

ڈال کر نادم لیکن بڑے حسین انداز میں مسکرایا۔ "میری باتیں عجیب لگ رہی ہیں نا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ کہ میں عام آدمیوں سے ہٹ کر کسی جبلا قسم کا آدمی ہوں۔ میری عادتیں مختلف ہیں۔ میری خواہش مختلف ہے۔ کبھی مجھے بالکل معمولی بات پہ اتنا غصہ آجاتا ہے کہ مخالف کو قتل کر دینے کے لیے بل کھانے لگتا ہوں۔ کبھی بڑے سے بڑے وقوعے اور اشتعال انگیز واقعے کو درگزر کرتا ہوں۔ بولو کیا سمجھیں؟" اس نے ٹائی کے دونوں سروں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"ہائے اللہ!" ثوبیہ اک ادائے ناز سے مسکرا دی۔ گردن سے ٹائی نکال کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کچھ آیا سمجھ شریف میں؟" آصف اسے تیکھی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"ہوں۔" اس کی آنکھیں بھی شوخی سے چمک اٹھیں۔

"کیا ——؟"

"یہی کہ مجید چچا۔" اس نے شرارت بھرے انداز اور شوخ شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مجھے ٹھیک ہی وحشی کہتے ہیں۔ یہی کہنے والی تھیں نا ——؟" آصف نے نیم باز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"ہاں ——" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے باہر کی جانب بھاگی۔ آصف نے فوراً لپک کر اسے کندھے سے پکڑ لیا۔ اس کا چہرہ اپنی طرف گھما کر بولا۔ "تم بھی مجھے وحشی سمجھتی ہو؟"

"نہیں۔ نہیں تو۔" آصف نے کچھ اس وحشیانہ انداز میں کہا۔ کہ ثوبیہ ڈر گئی۔ اس کے کانوں میں آصف کا ابھی ابھی کہا ہوا جملہ گونج گیا۔

"کبھی مجھے معمولی سی بات پر اتنا غصہ آجاتا ہے کہ مخالف کو قتل کر دینے کے لیے بل کھانے لگتا ہوں۔"

ثوبیہ نے پلکیں جھپکا جھپکا کر سہمے ہوئے انداز میں آصف کو دیکھا وہ بھی اب مسکرا رہا تھا۔ ثوبیہ کی جان میں جان آئی۔ ڈر کا وقتی لمحہ گزر چکا تھا۔

"میں بھی عجیب و غریب انسان ہوں۔" آصف اب ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

ثوبیہ اس کے پل پل بدلتے موڈ سے کچھ خائف بھی تھی۔ لیکن آصف سے ہمدردی کئی گنا بڑھی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ کتنا پیار آ رہا تھا اسے اس پر۔

"عجیب ہی عادتیں ہیں۔ وہ افسردہ سا نظر آ رہا تھا۔

"عادتیں بدلی جا سکتی ہیں آصف۔ آپ بدلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔"

وہ بڑی اپنائیت اور محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی،

"یہ عادتیں فطرت ثانیہ بن چکی ہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔ کوشش کریں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"واقعی۔"

"اور کیا۔"

"اچھا بھئی! کوشش آج ہی سے شروع کر دوں گا۔ لو دیکھو!"

وہ قدم بڑھا کر پلنگ کے قریب گیا۔ الٹ پلٹ پھینکا ہوا کوٹ اٹھایا۔ اسے ہینگر میں ڈالا۔ پھر الماری میں لٹکا دیا۔ ٹائی بھی ہینگر میں ڈال کر الماری میں رکھ دی۔

دروازے کے قریب بوٹ سے مسلا ہوا سگریٹ بھی اٹھایا۔ اور ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

وہ کسی معصوم اور فرماں بردار بچے کی طرح یہ سارے کام کر رہا تھا۔ ثوبیہ کو ہنسی بھی آ رہی تھی۔ لیکن چپ چاپ دیکھے گئی۔

"لیں میڈم۔" وہ اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سفید قمیض کے کالر کھلے تھے۔ وہ اس کی چوڑی چکلی چھاتی کے سیاہ بال کھلے گریبان سے جھانک جھانک کر اس کے مردانہ حسن میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے۔

کتنا وجیہہ نوجوان تھا وہ — ثوبیہ نظر بھر کر اسے دیکھنے کی ہمت ہی نہ کر سکی۔

"کوئی اور حکم جناب —؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہکنے کے انداز میں بولا۔

"بس۔" ثوبیہ نے متبسم نظریں جھکا لیں۔

"تم کتنی اچھی ہو ثوبیہ۔ تم نے میری زندگی یکسر بدل ڈالی۔ تم وہ سنہرا روپ ہو جو میری زندگی کے اندھیروں کو نگل گیا۔ تم وہ رحمت کی بدلی ہو۔ جو میری تپتی ہوئی زندگی کو جل تھل کر گئیں۔ تم۔ تم۔"

بس بس۔ ثوبیہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ "شاعر صاحب! کوئی اور کام کیجئے۔"

آصف اسے محبت سے دیکھ کر مسکرا دیا۔ "میرے جذبات کی گہرائی اور گیرائی کو تم نہیں جان سکتیں ثوبیہ۔ تم یہ بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ تم میری رہبر ہو۔ ایسی ہو۔ میری خودسری کو درگزر کر سکو۔ تو پیار سے سمجھا دیا کرو۔ غصے سے نہیں۔"

ثوبیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔

"پیار سے کہو گی تو ہر بات مان لیا کروں گا۔" آصف نے بڑے بھولے بھالے اور معصوم انداز میں کہا۔ ثوبیہ کو وہ اس بچے کی طرح لگا۔ جسے قدم قدم پر ماں کے سہارے اور رہبری کی ضرورت ہے۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا۔ کہ وہ آصف کے لیے یہ عظیم سہارا ہمیشہ کے لیے بنی رہے گی۔ اس نے اپنے دل میں آصف سے ہمدردی اور پیار اور محبت کے جذبات امنڈتے ہوئے پائے۔ اس کا ہاتھ پیار سے تھپ تھپاتے ہوئے محبت سے بولی۔ "میں آپ کی زندگی سے انتشار، بے چینی اور بے قراری چھین کر قرار، سکون اور اطمینان کی لہریں دوڑا دوں گی۔"

"ثوبیہ۔" آصف نے طمانیت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام کر دبا دیا۔

چند لمحے لطیف سی خاموشی چھائی رہی۔ ایسی خاموشی جس میں جسم ساکت ہو جاتے

ہیں۔لیکن روحیں گدگداتی ہیں۔

کیف و سرور کے ان خاموش لمحوں کو فیضی کی آواز نے درہم برہم کر دیا۔

"بڑی بیگم صاحب آپ کو بلا رہی ہیں۔"

"چلو میں آتی ہوں۔"

فیضی واپس چلا گیا۔

"ابھی نہ جاؤ ثوبیہ۔" آصف نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"خالہ جان نے بلایا ہے۔" ثوبیہ مسکرائی۔وہ بھی جانے دل میں کیا سوچتی ہوں گی میں کب سے اوپر آئی ہوں۔"

"خوش ہو رہی ہوں گی۔کہ ان کے بیٹے کا خیال رکھنے والا کوئی تو اس گھر میں ہے۔آصف کی آواز میں قدرے سنجیدگی تھی۔

ثوبیہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔اس نے کمرے سے نکل جانے کو قدم اٹھائے۔آصف نے ہاتھ بڑھا کر پھر اسے روکنا چاہا۔

پھر آجاؤں گی۔آج تو چھٹی ہے۔" وہ جاتے جاتے بولی۔

"کل سینما چلو گی؟" آصف کو جیسے اچانک بات یاد آ گئی۔ثوبیہ کچھ ہچکچائی۔

"کیوں؟" آصف جلدی سے بولا۔

"روز روز کالج سے فرار ہونا اچھا نہیں آصف۔"

"روز روز کہاں؟"

"دوسرے چوتھے ہی سہی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔"بری بات ہے۔کسی کو پتہ چل گیا تو۔اور پھر آصف جب ہم گھر پہ اکٹھے رہ سکتے ہیں تو پھر۔"

"اس گھر میں مجھے تم سے مل کر وہ سکون نہیں ملتا جو اس گھر سے باہر ملتا ہے۔گھٹن سی محسوس ہوتی ہے یہاں۔"

"یہ بھی آپ کی ان عجیب و غریب عادتوں میں سے ایک ہے آصف۔اس عادت کو بدل دیں۔گھر میں دلچسپی لینا شروع کر دیں۔کسی گھٹن کا احساس نہیں ہوگا۔"

"اچھا اس لیکچر کو چھوڑو۔کل پکچر کا پروگرام پکا ہے سمجھیں!"

"ایک شرط پر" ثوبیہ جانتی تھی۔آصف اپنی بات سے ٹلنے کا نہیں۔

"ہر شرط منظور۔" وہ خوشی سے جھوم کر بولا۔

"آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر ہر طرح کی دلچسپی لیا کریں گے۔"

"منظور۔کچھ اور۔۔۔؟"

"خالہ جان سے اپنا رویہ یکسر بدل کر فرماں بردار بیٹوں کی طرح رہیں گے۔" ثوبیہ نے موقع جان کر کہہ دیا۔وہ کئی دنوں سے اس سلسلے میں آصف سے بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔

"منظور۔" وہ فرماں برداری سے جھک گیا۔"کچھ اور؟"

"چچا جان سے بھی اپنا رویہ بدل کر دوستانہ رویہ اختیار کریں گے۔"

آصف کے چہرے پہ بیزاری سے ہلکی ہلکی شکنیں ابھریں۔

"دیکھیں آپ نے میری باتیں ماننے کا وعدہ کیا ہے۔"

"اچھا صاحب! جو کچھ آپ کہیں گی کریں گے۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔"تو کل کا پروگرام پکا؟۔۔۔"

"بالکل بالکل۔" ثوبیہ ادائے جانانہ سے مسکراتی کمرے سے نکل گئی۔

آصف

میرے لیے قمیض کا کپڑا لایا ہے۔" منیرہ نے چھوٹے چھوٹے زرد پھولوں والی ہلکے نسواری رنگ کی کریپ کا ٹکڑا بڑے فخر سے مجید کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنے؟" مجید کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا۔

"اگلے دن دس روپے بھی دیے مجھے۔ اللہ جانے کہاں سے یہ خیال آگیا۔"

"کچھ انسان بنتا جا رہا ہے۔"

"واقعی۔ بڑی تبدیلی آگئی ہے اس میں۔"

"میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ اب میرے ساتھ بھی ذرا شائستگی ہی سے پیش آتا ہے ورنہ پہلے تو۔ تم جانتی ہی ہو۔"

"میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں۔ اب تو کتنی کتنی دیر میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہنستا ہے۔ بات بات پر قہقہے لگاتا ہے۔ اتنا خوش تو میں نے اسے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"ہوں۔" مجید نے یوں کہا۔ جیسے اسے آصف کی اس تبدیلی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔

"خوش کیوں نہ ہوتی۔ اس تبدیلی سے گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔

"اب تو رات کو بھی دیر سے نہیں لوٹتا۔ ورنہ پچھلے دنوں یاد ہے آپ کو!" منیرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یاد نہیں تو کیا بھول گیا ہوں۔ تھوڑا تنگ کیا اس نے۔ اللہ قسم بے ساختہ جی چاہتا تھا اس کا گلا گھونٹ دوں۔ یا اپنا۔"

"خدا جانے اسے کیا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہ کچھ ہوا ہی رہتا ہے۔ اب خیر مناؤ۔ کہیں پھر!"

"اللہ نہ کرے۔"

"مجھے تو اس کے التفات سے بھی ڈر ہی لگتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسی بھی کیا سوچ۔ خود ہی راہِ راست پر آگیا ہے۔"

"راہِ راست سے بھٹکنے اسے دیر بھی تو نہیں لگتی۔" مجید ہنسا۔

"نہیں جی۔ میرا دل کہتا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب ماشاء اللہ سیانا ہے اچھے برے کو سوچ سمجھ سکتا ہے۔ بچپنا تھا۔ الٹی سیدھی حرکتیں کر کے تنگ کرتا رہتا تھا۔"

"بائیس تئیس سال کے آدمی میں بھی بچپنا ہو تو۔"

"اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔"

"خدا کرے ٹھیک ہی ہے۔"

مجید اور منیرہ کافی دیر آصف ہی کی باتیں کرتے رہے۔ بڑے بڑے لفظوں میں منیرہ نے مجید سے بار بار کہا۔ کہ وہ آصف سے اب پیار و محبت کا سلوک ہی رکھے اسے دل میں ڈر تھا نا۔ میں سنبھلا سنبھلایا آصف پھر نہ بگڑ جائے۔

لیکن ــــ سیدھی سادی عورت آصف کے سنبھلنے کے محرک سے کہاں واقف تھی۔ وہ تو آصف کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

آصف کی خوشیوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ماضی کو تقریباً بھول چکا تھا۔ تلخ و ترش یادیں دبک کر لاشعور کے گوشوں میں گم ہو چکی تھیں۔ حال کی خوش حالی سے وہ مسرور و مسحور ہوا جا رہا تھا۔ ثوبیہ کے قربت میں گزرے ہوئے لمحے حاصلِ زندگی تھے۔ وہ جب تک اس کے ساتھ رہتی۔ وہ ان قربت کے جانفزا لمحوں کے اثر سے بن پیئے مست رہتا۔ اور جب وہ نہ ہوتی ان جانفزا لمحوں کا تصور ہوش و حواس کی دنیا پر نشے کی طرح چھایا رہتا۔

ثوبیہ اس کی زندگی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تھی۔ اس کی رگوں میں بہتا ہوا لہو تھی
کی روح تھی۔ اس کا ایمان تھی۔ اور اب تو وہ عشق کے ان منازل سے گزر رہا تھا۔ جہاں محب
اور محبوب کا تصور ایک ہی تصویر کے دو رُخ بن جاتے ہیں۔ جس رُخ کو دیکھا قرار آ گیا۔
ثوبیہ بھی عشق کے ان مراحل کو سنجیدگی سے طے کر رہی تھی۔ یا صرف جوانی کے تیار
دور میں یک جائی اور تنہائی کا پیدا کردہ لگاؤ تھا۔ آصف نے اس کے متعلق کبھی سوچنے کی
ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ وہ تو اپنی ہستی کو ثوبیہ میں مدغم پاتا تھا۔
کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح ثوبیہ کی باتیں مان لیتا۔ اسی کے حکم کی تعمیل تھی
جو وہ ماں سے فرماں بردار بچوں کی طرح پیش آنے لگا تھا۔ اور مجید سے بھی شائستہ
سلوک کرنے لگا تھا۔

ثوبیہ کی ساری ناز برداریوں اور اطاعت گزاریوں کا صرف ایک صلہ وہ چاہتا تھا
اور وہ صلہ تھا۔ گھنٹوں ایک دوسرے کی سنگت میں باہر گھومتے پھرتے رہنا۔
کبھی ہوٹل ــــ کبھی سینما ــــ اکثر دریا کے سنسان اور ریتلے کناروں پر ثوبیہ کی
سنگت میں گھومتے پھرتے رہنا اسے ثوبیہ ہی کی طرح محبوب تھا۔ ثوبیہ کبھی کالج سے اکثر
غائب ہو جانے کی قباحت پر اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی تو وہ اڑیل گھوڑے کی
طرح بدک جاتا۔ صرف یہی بات تھی جو وہ ثوبیہ کے سمجھانے ــــ منت سماجت کرنے اور
روٹھ جانے کی دھمکی دینے پر بھی ماننے کو تیار نہ ہوتا۔

خوش باش رہنے کے باوجود گھر میں اسے الجھن سی ہوتی تھی۔ ذہن میں رچی بسی یہ الجھن
دب گئی تھی لیکن مٹی نہیں تھی۔ اسی لیے وہ جتنی دیر گھر سے دُور ہو کر ثوبیہ کی معیت میں
وقت گزارتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کی بیمار روح کو کوئی کیف پرور سی تھپکیاں دے
دے کر سُلا رہا ہے۔ مدتوں کی خواہش تکمیل کو اب پہنچی تھی۔ قرار و سکون کے یہ لمحے اسے اب
ملنے آئے تھے۔ انہیں کھو دینے کا تو وہ بھی تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ــــ ۲ ــــ

ذرا ہمیں بھی تو معلوم ہو۔ وہ کون سے پریکٹیکل ہو رہے ہیں۔ جن کے لیے جناب
"بے بنّو" کو دوسرے چوتھے شام کو گھر لوٹنا پڑتا ہے ــــ؟"
ثوبیہ کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شکوہ اللہ کھڑی ہوئی۔ اور آنکھیں مٹکا کر استفسار کیا۔
ثوبیہ نے اسے دیکھا۔ جرم کا احساس دھڑک اٹھا۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ خفت
و ندامت سے منہ سے بات نہ نکل سکی۔ کتابیں تک میز پر رکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گنگ
سی کھڑی شکو کو دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے ثوبیہ رانی۔ سنا ہے کالج میں پریکٹیکل شروع ہو گئے ہیں۔ ہم بڑے
کے بڑے ہی رہ گئے۔ اور جناب ہر پریکٹیکل بڑی باقاعدگی سے کرنے لگیں۔" شکو کی
معنی خیز مسکراہٹ اور شوخی سے ناچتی آنکھوں کا سامنا ثوبیہ نہ کر سکی۔ سر جھکا کر مجرمانہ
انداز میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ ثوبیہ حسبِ معمول آصف کے ساتھ دریا کے ریتلے اور ٹھنڈے
کناروں پر جذبات کی حدت سے پھٹتی کہانیاں دُہرا کر لوٹی تھی۔ عشق کے نغمے الاپ کر
واپس آئی تھی۔ آج ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی بھیگی ریت پر مستانہ وار جھومتے درختوں تلے ــــ
عطر بیز ہوا کے نرم نرم جھونکوں میں نشاط و انبساط کے کتنے پھول مہک رہے تھے۔ آج وہ آصف
کی مخمور آنکھوں میں ڈوب ڈوب کر ابھری تھی۔ لطف و مسرت کی تشنجی کیفیت سے بہک
بہک کر آصف کے چوڑے چکلے سینے سے لگ لگ گئی تھی۔ ہر بار اسے آصف نے سنبھال
دیا تھا۔ آنے کو تو اس کا اب بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن آج سورج غروب ہونے

سے کچھ دیر پہلے ہی وہ لوٹ آئی تھی۔ پھر بھی گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔ شکو کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ تو منیرہ کے ڈر سے آج ذرا جلدی آ گئی تھی۔ پچھلی دفعہ منیرہ نے اس کے آنے دن دیر سے آنے پر کچھ تشویش سی ظاہر کی تھی۔

ہو سکتا ہے۔ تشویش کا احساس ثوبیہ کے مجرم دل کی مجرمانہ صدا ہو لیکن وہ ڈر ضرور گئی تھی۔ افشائے راز کا خطرہ محسوس کر کے آج ذرا پہلے ہی گھر آ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شکو کو دیکھ کر وہ بری طرح چکرا گئی تھی۔ اور جب شکو نے پریکٹیکل کا ذکر کیا تو اس کا دم ہی نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی۔ کہ شکو منیرہ سے مل چکی ہے۔

تو کیا — کیا اس کا راز کھل گیا ہے! — اس خیال سے اس پر مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی —

"کیوں جناب؟" شکو اس کے قریب آ کر ہنستے ہوئے بولی۔ "کہاں سے آ رہی ہو"

ثوبیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور وہ خزاں کے سوکھے پتے کی طرح جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے کھڑکھڑاتے ہوئے شاخ سے جدا ہو کر زمین کی طرف جاتا ہے۔ صوفے پر گر گئی۔

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور کچھ یوں بھی شکو کو ثوبیہ کے جرم کی شدت نوعیت کا پتہ نہ تھا۔ اس لیے وہ اس کی متغیر ہوتی حالت کا صحیح اندازہ نہ کر سکی۔

"چپ کیوں سادھ لی ہے ثوبیہ —" وہ اس پر جھکتے ہوئے بولی "کہاں ہو —؟ کچھ پتہ چل رہا ہے۔ بے ہوش تو نہیں ہوئی جا رہیں"

وہ مذاق میں کہہ رہی تھی — لیکن ثوبیہ واقعی ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی منزل میں تھی۔

چند لمحے اس پر سکوت و جمود طاری رہا۔ شکو بار بار جلتے جلتے جملے کہہ رہی تھی۔ ثوبیہ نے اپنے آپ کو سنبھالا —

وہ اٹھی۔ اور شکو کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی — اسے کرسی پر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

"ثوبیہ —" شکو کچھ کہنے والی تھی۔ کہ ثوبیہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی "تم کیسے ہیں —؟"

"کیوں؟ —" گھبرا کیوں رہی ہو۔ اتفاق ہی ہے جو میں آ گئی۔ ورنہ خدا جانے تمہارے پریکٹیکل کب تک ہوتے رہتے"

"خالہ جان سے تو تم نے کچھ نہیں کہا؟" ثوبیہ وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

"کہا کیوں نہیں"

"ہائے شکو۔ کم بخت۔ کیا کہا؟ اس نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے مری مری آواز میں کہا۔

شکو کو تو شک پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اب ثوبیہ کے انداز اور گھبراہٹ سے بہت کچھ سمجھ گئی اور بہت کچھ سمجھ کر خود اسے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ کالج کی لڑکیوں کے رومانوی قصے بہت عام تھے۔ کئی لڑکیاں اپنے دوست لڑکوں کے ساتھ کالج سے فرار بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن ثوبیہ بھی ایسی لڑکیوں کی فہرست میں شامل ہو گی۔ شکو کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اسی لیے بہت کچھ سمجھ کر اسے ذہنی دھچکا سا لگا۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ اٹھ کر ثوبیہ کے برابر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور بڑی سنجیدگی سے بولی "یہ دوسرے چوتھے گھر پہ پریکٹیکل کا بہانہ کر کے کہاں جاتی ہو تم —؟"

ثوبیہ اس مجرم کی طرح نظر آئی جسے اعتراف جرم کے سوا دوسری کوئی راہ نظر نہ آتی ہو۔ شکو کو دیکھ کر وہ بڑے بھونڈے انداز میں مسکرائی۔

"ہوں" شکو نے اسے پھر ٹھوکا دیا۔

"بتاؤ نا! —"

"بتا دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ تم نے خالہ سے کچھ کہا تو نہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"تم کب آئیں —؟"

"کوئی دس منٹ ہوئے ہیں۔"

"خالہ سے ملیں۔؟"

"ہاں۔"

"انہوں نے کیا کہا۔ تم نے کیا پوچھا؟"

"یہ وکیلوں والی جرح کیوں کر رہی ہو۔ ظاہر ہے میں نے تمہارے متعلق پوچھا ہوگا اور انہوں نے وہی جواب دیا ہوگا۔ جو تم آئے دن انہیں اپنی دیر سے آمد پر پردہ ڈالنے کے لیے کہتی ہوگی۔"

"پھر۔ پھر۔ تم۔ نے۔۔؟ ہکلاتے ہوئے ثوبیہ نے کہا۔

"میں نے کہہ دیا۔ کہ کوئی پریکٹیکل نہیں ہوتے۔"

"ہائے اللہ! ثوبیہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ شکو تم سے کوئی بات ہی نہ بن سکی؟"

شکو کا جی تو چاہا۔ کچھ دیر اور ستا کر اسے ذہنی کوفت میں مبتلا کر کے اس کے جرم کی سزا دے۔ لیکن پھر ثوبیہ کی اڑی اڑی رنگت اور مرونی چھایا چہرہ دیکھ کر ترس آ گیا۔

آج تو تمہیں معاف کر دیا۔ تمہارا پردہ رکھ لیا میں نے۔" شکو نے سنجیدگی سے کہا۔

ثوبیہ کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر شکو کو دیکھنے لگی اس کے چہرے سے سچ اور جھوٹ کا اندازہ کرنے کی کوشش میں اسے گھورنے لگی

"اب گھور کیا رہی ہو۔ کہا نا تمہارا راز افشا ہونے سے بچا لیا۔ جب خالہ جان نے پریکٹیکل کا نام ہی لیا تو میں سمجھ گئی۔ انہیں تو میں نے مطمئن کر دیا۔ لیکن یہ تاؤ۔۔ روز روز کہاں غائب ہو جاتی ہو؟ روز روز کہاں۔۔؟ ثوبیہ خفت و ندامت کے احساس سے پگھلی پگھلی نظر آ رہی تھی۔ چہرے کے رنگ کی طرح تبسم بھی پھیکا پھیکا تھا۔

"روزانہ نہ سہی دوسرے چوتھے سہی۔ شکو نے اسے کہنی ماری۔ ثوبیہ نے سر جھکا لیا۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہیں۔

"بات چھپنے کی نہیں ثوبیہ۔ کون ہے وہ جس کی خاطر سب کو جل دیے جا رہی ہو۔؟ آخر شکو نے کہا۔

"آصف۔" ثوبیہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"واقعی۔۔؟" شکو کو کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی۔

"ہوں۔" ثوبیہ اب سنبھل گئی تھی۔ مسکرا کر شکو کو دیکھنے لگی۔ گو مسکراہٹ بے دم سی تھی۔

"یہ کب سے۔؟" شکو اب بھی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

جب سے تم نے کہا۔" ثوبیہ شوخی سے بولی۔ شوخی میں ندامت کا رنگ بھی تھا۔

"ارے کم بخت! میں نے تو مذاق کیا تھا۔ شکو بولی۔

"ہم نے مذاق کو دل کا روگ بنا لیا۔ وہ ہنس دی۔

"اوہو۔ وہ نٹ کھٹ اور خود سر سا آدمی دل کو اتنا بھا گیا؟"

"بھا نہیں دل میں سما گیا کہو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"معاملہ اتنی دور تک جا پہنچا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔"

"آج ہو گئی نا۔ لیکن شکو خدا کے لیے کسی سے کہنا نہیں۔"

"ساری تفصیل بتاؤ پہلے۔ پھر وعدہ کروں گی۔"

شکو نے ثوبیہ کو مجبور کر دیا۔ اسے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہوئی۔ لیکن دونوں بے تکلف سہیلیاں تھیں۔ بات کہنے کی بنی۔ دونوں پلنگ پر آڑی لیٹ گئیں۔ اور ثوبیہ اپنے پیار کی داستان شکو کے گوش گزار کرنے لگی۔

ثوبیہ کیف میں ڈوبی آصف کی باتیں شکو کے گوش گزار کر رہی تھی۔ اپنے رومانوی قصے سنا رہی تھی۔ شکو اس کی باتیں سن کر کبھی حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگتی۔ کبھی انتہائی سنجیدہ ہو کر اسے گھورنے لگتی۔

ثوبیہ نے ایک ایک بات تفصیل سے کہہ دی۔ سارے واقعات سنانے کے بعد

گدگداتے ہوئے بولی "چپ کیوں ہو گئیں؟"

"ثوبیہ۔؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہوں۔" ثوبیہ پر کیف مستی چھایا جا رہا تھا۔

"تم بہت آگے بڑھ گئیں۔"

"ہوں۔" وہ بڑے دل نشین انداز میں مسکرائی۔ شانِ تغافل سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"محبت گناہ تو نہیں؟" وہ بڑی شانِ دلربائی سے بولی۔ گناہ نہ سہی لیکن جس راستے پر تم جا رہی ہو۔ وہ خطرناک ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اک جوان آدمی کے ساتھ گھنٹوں ویران تنہائیوں میں عشق و محبت کے نغمے الاپنا۔"

"اوہ شکو۔ تم انہیں نہیں سمجھتیں۔" نہیں سمجھ سکتیں۔ ثوبیہ نے ظالم ادا سے انگڑائی لی۔ اس کا جوان اور جذبات سے بھرپور دل اندرونی ہلچل سے بے طرح دھڑکنے لگا۔

وہ بل کھا کر اٹھی۔ اور بتی روشن کر دی۔ شکو کا سوچ میں ڈوبا چہرہ دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا۔؟" وہ اٹھلا کر بولی۔

"ثوبیہ۔!" اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ "جذبات کی آندھی چڑھی ہو تو راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اتنی بڑی جرأت کیونکر کر لی۔ تمہیں ڈر بھی نہیں لگتا۔؟ یہ خیال بھی نہیں آتا۔ کہ کسی نے تمہیں اس کے ساتھ یوں دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ یہ باتیں چھپنے کی نہیں ثوبیہ۔ جذبات کی پاکیزگی کوئی نہیں دیکھتا۔ ہر کوئی ان ملاقاتوں کو دوسرا ہی رنگ دے گا۔ گھر والوں کی آنکھوں میں کب تک دھول جھونکو گی۔ بات نکل گئی۔ تو کتنا برا ہوگا۔ تمہارے ابو امی یہ بات برداشت کر سکیں گی۔ کس بھروسے

اور اعتماد پر وہ تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے امید نہ تھی۔ کہ تم اپنے والدین کے اعتماد اور بھروسے کو یوں ٹھیس لگاؤ گی۔ اللہ۔ مجھے تو اس خیال ہی سے کپکپی آ رہی ہے۔ تم کتنی نڈر اور بے باک ہو گئیں۔"

ثوبیہ کا سر خود بخود جھک گیا۔ والدین کے اعتماد کے سوال پر وہ سرتاپا لرز گئی۔ گھبرا کر اس نے شکو کو دیکھا۔

"محبت خلوتوں کو مہکانے کا نام نہیں ثوبیہ۔ جذبات کی دنیا کسی وقت بھی تہہ و بالا ہو سکتی ہے۔ اگر۔ اگر۔ تو بہ۔" وہ شاید کوئی اور بات منہ سے نکالنے کی ہمت نہ کر سکی۔

"میں کیا کر سکوں شکو۔ آصف مجبور کرتے ہیں۔ کئی بار انہیں احساس دلانے کی کوشش کی۔ تو بگڑ بیٹھے۔ ثوبیہ کے گلے میں پھندہ سا پڑنے لگا۔

"بگڑتا ہے تو بگڑنے دو۔ تم اپنے آپ کو دیکھو۔ اپنی عزت کو دیکھو۔ اپنے والدین کا خیال کرو۔ حد ہو گئی جذباتیت کی۔"

"محبت کو جذباتیت کا نام نہ دو۔ ثوبیہ نے کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ سر جھکا کر سوچ میں ڈوب گئی۔ رات کھانا کھا کر شکو اپنے بھائی کے ساتھ گھر چلی گئی۔ لیکن ثوبیہ کے ذہن میں سوچ کی گرہیں ڈال گئی۔

رات بھر وہ بے قرار رہی۔ اپنے والدین کا خیال کر کے اس پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ واقعی انہیں اگر اس کی محبت کا علم ہو گیا۔ آصف کے ساتھ یوں گھومنے پھرنے اور کالج سے فرار ہو کر جانے کا پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔

رات کے رینگتے لمحوں میں اس نے ڈرتے ڈرتے سوچتے سوچتے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ آصف خواہ ناراض ہو جاتے وہ اس کے ساتھ کبھی اکیلی گھومنے نہیں جائے گی۔

اس فیصلے سے اس کے دل کے کئی گوشے دکھ کر چیخ اٹھے۔ لیکن اس نے اس فیصلے کے سامنے سر جھکانے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

—

مشش — ای — " لبوں کی مدھم سی آواز نکالتے ہوئے آصف نے ثوبیہ کو مخاطب کیا۔

"ہوں —" اس نے مڑ کر دیکھا۔ آصف چوبی زینے سے اتر رہا تھا۔ اس نے چاکلیٹ پتلون پر سفید قمیض پہن رکھی تھی۔ کھلے کھلے موسم میں نکھرا نکھرا لباس آصف پہ بے حد بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ثوبیہ کے رات کے آخری پہروں میں کیے ہوئے کئی ارادے اسے دیکھتے ہی متزلزل ہو گئے۔ لیکن اس نے جلدی سے رُخ موڑ کر قدم باورچی خانے کی طرف بڑھائے۔ وہ کالج جانے کو تیار ہو کر آئی تھی۔ کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے منیرہ سے لینے کے لیے باورچی خانے کی طرف آئی۔

منیرہ سب کو ناشتہ کروا کر اٹھنے ہی والی تھی۔ کربستی دوپٹے اور فیروزی قمیض والی بھنگن اپنا مٹی کا پیالہ جس کے کنارے ٹوٹ چکے تھے لے کر آ بیٹھی۔ منیرہ نے رات کی باسی روٹی کے ساتھ چائے کا پیالہ بھر دیا۔ کالی بھجنگ لیکن جوان اور البیلی بھنگن چائے کے گھونٹوں کے ساتھ مزے لے لے کر محلے کی تازہ خبریں منیرہ کو سنا رہی تھی۔

بھنگن کیا خاصی خبر رساں ایجنسی تھی۔ ہر گھر کی خبر منیرہ کو پہنچایا کرتی تھی۔ ہر گھر کا راز اس کے سامنے اُگل دیا کرتی تھی۔ منیرہ بھی دوسروں کی باتوں اور رازوں کو پانے کی فطری حس سے مجبور تھی شاید۔ اکثر چائے کی گرم گرم پیالی دے کر اس سے محلے کی پوری پوری رپورٹ وصول کیا کرتی۔

ثوبیہ نے صبح بھی پیسوں کا ذکر کیا تھا۔ لیکن منیرہ تو بھنگن کی باتوں میں کچھ اس طرح

محو تھی۔ کہ اسے خیال ہی نہ رہا۔ کالج کا وقت ہو رہا تھا۔ ثوبیہ خود ہی باورچی خانے کی طرف آئی۔ لیکن باورچی خانے میں جانے سے پہلے ہی آصف سے سامنا ہو گیا اور اسے رک جانا پڑا۔ آصف سیڑھیاں اتر کر ثوبیہ کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستگی سے بولا "تین بجے۔"

"اوں ہوں۔" ثوبیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"خبردار۔؟" آصف نے مسکراتے ہوئے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"اے نہیں۔" ثوبیہ گھبرائی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور کوریڈور کی طرف چل دیا۔

"آصف۔ مدھم سی آواز میں ثوبیہ نے پکارا۔" ذرا سنو!"

لیکن آصف نے کچھ سننے کی بجائے آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام دیا۔ تین انگلیاں نچاتے ہوئے وہ خوش دلی سے مسکراتا کوریڈور کو عبور کر گیا۔ وہ دفتر چلا گیا۔

لیکن ثوبیہ تذبذب کے گرداب میں پھنس گئی۔ رات اس نے قطعی اور آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اب کبھی کالج سے فرار ہو کر آصف کے ساتھ نہیں جائے گی۔

لیکن آصف کا انداز — بلاوہ اور اصرار بھی تو توبہ شکن تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے وہ اپنے متزلزل ہوتے ارادے کو کوئی سہارا نہ دے سکی۔

سوچ میں ڈوبی وہ باورچی خانے میں گئی۔ بھنگن نے چائے پیتے پیتے پاؤں سکیڑ کر اس کے لیے راہ بنائی اور اس کی جوانی کو کئی دعائیں دے ڈالیں۔

"خالہ جان! دس روپے چاہئیں۔" وہ بھنگن کی جذبات انگیز دعاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے بجھے بجھے لہجے میں بولی۔

"ہائے ہائے اس سوسن کی بچی نے باتوں میں ایسا الجھا دیا۔ کہ مجھے تمہیں پیسے دینے کا خیال ہی نہ رہا۔" منیرہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "دیر تو نہیں ہو گئی؟"

"جی نہیں۔"

منیرہ نے چابیوں کا گچھا سنبھالا۔ اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ ثوبیہ شش و پنج میں مبتلا اس کے پیچھے پیچھے آ گئی۔

"اور چاہئیں؟" منیرہ نے دس روپے کا نیا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔" وہ پیسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کا جی چاہا۔ آج کالج ہی نہ جائے لیکن پھر یہ خیال فضول سا لگا بے دلی سے کتابیں اٹھا کر وہ گھر سے نکلی اور بس سٹاپ کی طرف چل دی۔

ڈیوٹی ابھرتے اس نے پھر فیصلہ کر لیا۔ کہ آج آصف کے ساتھ بالکل نہیں جائیگی۔ شکو کے الفاظ کی گونج کانوں میں ابھی تک باقی تھی۔ تم کتنی نڈر اور بے باک ہو۔"

اور واقعی اسے اپنی بے باکی اور نڈر پنے کا خیال کر کے کپکپی سی آ گئی۔ آئندہ محتاط رہنے کا تہیہ کر کے وہ مطمئن سی ہو گئی۔ آصف کے روٹھ جانے کا امکان کیا یقین تھا۔ لیکن وہ کرتی بھی کیا۔

کالج میں اس کا جی بالکل نہ لگا۔ کچھ شکو کی شک بھری آنکھوں نے بے حال کر دیا۔ اس نے آج اس سلسلے میں اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کی شکی آنکھوں سے وہ سہم سہم گئی تھی۔

چھٹی کے وقت وہ اس کے ساتھ ہی کلاس روم سے نکلی۔ شکو گیٹ کی طرف جانے کو مڑی۔ بہت سی لڑکیاں باتیں کرتی ہنستی مسکراتی گیٹ کی طرف جا رہی تھیں۔

لیکن ثوبیہ رک گئی۔

"کیوں؟" شکو نے مشکوک انداز میں اسے دیکھ کر کہا۔ "رک کیوں گئیں؟"

"میں ادھر نہیں جاؤں گی ——"

"تو کدھر جاؤ گی ——؟"

"ادھر ——!" ثوبیہ نے پچھلی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں؟" پھر کہیں فرار ہونے کا ارادہ ہے؟" شکو نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا۔

"نہیں شکو۔ ادھر —— وہ —— وہ ہو گا۔"

"وہ کون ——؟"

"آصف ——؟"

"آصف ——؟"

"ہاں" ثوبیہ نے سرگوشی کی۔ "تین بجے وہ بیرونی گیٹ کے سامنے والے فٹ پاتھ پر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"انتظار کرنے دو۔ تم کو تو بس میں جانا ہے۔"

"نہیں شکو۔ میں آج پچھلی طرف سے رکشا لے کر جاؤں گی۔" شکو کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی۔ کہ ثوبیہ بہانہ بنا کر کھسک جانا چاہتی ہے۔

"یقین نہیں آتا تو باہر جا کر دیکھ لو۔ وہ سامنے کے فٹ پاتھ پر دائیں طرف چند گز کے فاصلے پر منتظر کھڑا ہو گا۔ ثوبیہ نے لجاجت سے کہا۔ "میں ادھر نہیں جاتی شکو —— پچھلی طرف —— جاتی ہوں۔ میں نے اب عہد کر لیا ہے کہ اس کے ساتھ اکیلی کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"یار! یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ——؟" لڑکیوں کا ایک ٹولہ ان کے قریب رک گیا۔ اور رخسانہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"کچھ بھی نہیں۔" ثوبیہ گھبرا گئی۔

"کوئی پروگرام تو نہیں بنچرکا ——؟" فریدہ نے آنکھیں نچائیں۔

"سر تمہارا۔ یہ کونسا وقت ہے بھلا۔" شکو بولی۔

وہ سب ہنستی باتیں کرتیں آگے بڑھ گئیں —— ثوبیہ نے بھی شکو کو خدا حافظ کہا۔ اور پھر پچھلی طرف مڑ گئی۔ آصف تین بجتے ہی اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہی وہ ثوبیہ کا انتظار کر رہا تھا۔

کالج کے گیٹ پر موٹریں تانگے اور رکشے قطار در قطار کھڑے تھے۔ لڑکیوں کے غول کے غول برآمد ہوتے۔ تانگے، موٹریں، رکشے بھر بھر کر جانے لگے۔ بس کی لڑکیاں بھی بیٹھ کر چل دیں۔ فٹ پاتھوں پر پیدل جانے والی لڑکیاں بکھر گئیں۔

آصف مرقع انتظار بنا کھڑا تھا۔ بس میں بیٹھنے سے پہلے شکو نے اسے دیکھا تھا۔ ثوبیہ کی بات پر اسے دیکھ کر ہی یقین آیا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ثوبیہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ آصف نے کھڑے کھڑے کئی سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ کتنی دفعہ گھڑی دیکھ چکا تھا۔ معمول کے مطابق تو اسے خود ہی آصف کے پاس پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن آج اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔

کالج کا گیٹ خالی ہو گیا۔ اکا دکا لڑکیاں رہ گئیں۔ وہ بھی باتیں کرتیں فٹ پاتھ پہ پیدل چل دیں۔ غول منتشر ہو گئے۔ سواریاں چلی گئیں۔ لیکن آصف وہیں کھڑا رہا۔

اس کی نظریں گیٹ پر جمی تھیں۔ جب بھی کوئی چہرہ نمودار ہوتا اسے ثوبیہ کا گمان ہوتا۔ آصف نے انتظار سے جھنجھلا کر گھڑی دیکھی۔ چار بجنے والے تھے۔ اس کی نظریں تھک گئیں۔ ٹانگیں شل ہو گئیں۔ لیکن اس کے انتظار نے دم نہیں توڑا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ کھڑا رہا اور گیٹ کی جانب نظریں جمائے دیکھتا رہا۔

سوا چار ہوئے — اور پھر ساڑھے چار بھی بج گئے۔ کالج کا گیٹ سنسان ہو گیا وہ چوڑی سڑک بھی خالی ہو گئی۔ جس پر گھنٹہ بھر پہلے لڑکیوں کے غول کے غول بکھرے ہوئے تھے اور موٹریں بس اور رکشے آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

ثوبیہ نہ آئی۔ آصف کا بنا بنایا پروگرام خراب ہو گیا۔ آج تو موسم کے نکھار سے اس کی طبیعت میں کتنی جولانی تھی۔ ثوبیہ کی سنگت میں سکون و اطمینان کے کئی گھنٹے گزارنے کے خوش کن تصور میں اس نے اک اک لمحہ گن گن کر گزارا تھا۔

طبیعت بجھ سی گئی۔ ثوبیہ کے نہ آنے کے متعلق وہ سوچتا ہوا بوجھل قدموں سے

فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ ہر آہٹ پر اسے ثوبیہ کے قدموں کا گمان ہوتا تھا۔ اسی لیے چلتے چلتے وہ کئی بار مڑ کر پیچھے دیکھ چکا تھا۔ لیکن ہر بار مایوس ہی ہونا پڑا تھا۔

آصف بے قرار ہونے لگا۔ صبح ثوبیہ نے انکار کیا تھا نا؟ اس خیال سے اس کی بیقراری اور بڑھ گئی۔ لیکن پھر اس نے اپنے دل کو تسلی دے ڈالی۔

"ہو سکتا ہے وہ آج کالج ہی نہ آئی ہو۔"

اگلے موڑ پر

اس نے ٹیکسی لی۔

اور سیدھا گھر چلا آیا۔

——

برآمدے

میں دھوپ چھاؤں کا امتزاج موسم کی مناسبت سے بڑا دل کش تھا۔ منیرہ کی چھوٹی بھاوج سردار آئی ہوئی تھی۔ منیرہ نے کرسیاں برآمدے ہی میں منگوالی تھیں۔ سردار بے داغ سفید کشمیری شال لپیٹے دھوپ کی زد سے بچنے کے لیے ستون کی آڑ میں بیٹھی اپنی بڑی بہو کی برائیاں روایتی ساس کے انداز میں کر رہی تھی۔

منیرہ میز پر پلیٹ میں رکھے ہوئے مالٹے چھیل رہی تھی۔ سردار کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے ہوئے کبھی کبھی اپنی رائے بھی دے دیتی ہے۔ سردار کی دونوں پوتیاں چمن میں کھیل رہی تھیں۔ اونچے اونچے پھولے پھولے فراک اور سرخ سرخ ربن باندھے دونوں چلتی پھرتی گڑیاں لگ رہی تھیں۔ سردار کے دونوں بیٹے خوب کماؤ تھے۔ مالی حالت بہت اچھی تھی۔ لیکن روپے پیسے سے سکون نہ خریدا جا سکتا تھا۔ ساس بہو کے جھگڑے گھریلو فضا کا سکون درہم برہم کرتے تھے۔ کبھی کبھی دل کا غبار نکالنے منیرہ کے پاس آجاتی تھی۔ یوں بھی جب سے آصفہ جوان ہوئی تھی۔ آصف پر نظریں تھیں۔ اس لیے منیرہ کے زیادہ ہی آگے پیچھے ہوتی۔

مالٹے چھیل کر منیرہ نے دونوں بچیوں کو آواز دی۔ بڑے پیار سے انہیں مالٹے دیے۔ چھیلے ہوئے مالٹے سردار کی طرف بڑھا دیے۔

"کاٹ کر کھاؤ گی۔ یا دادی اماں کی طرح چھیل کر۔" منیرہ نے پوچھا۔

"میں خود کاٹوں گی۔" بڑی بچی بولی۔

"ہاتھ نہ کاٹ لینا ماہرہ۔" سردار نے ٹوکا۔ دوسری بچی مالٹا اٹھا کر پھر چمن میں اتر آئی۔

"تم چھیلا ہوا مالٹا لے لو۔" منیرہ نے کہا۔ بچی منہ بنانے لگی۔ منیرہ نے اس کے لیے پورا مالٹا کاٹ کر پلیٹ میں رکھ دیا۔ دونوں بچیاں بہل گئیں۔

سردار اور منیرہ پھر انہی گھریلو بکھیڑوں کے تذکرے کرنے لگیں۔

"چائے یہیں لاؤں خالہ جان؟" ثوبیہ نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔ یہیں پی لیتے ہیں۔ دھوپ بڑی اچھی لگتی ہے۔ کمرے تو بڑے ٹھنڈے ہیں۔ کیوں سردار۔؟

"ٹھیک ہے۔"

"یہیں لے آؤ بیٹی ——؟"

"بہت اچھا۔"

"فیضی کے ہاتھ برتن بھجوا دو۔ اور سنا۔ ثوبیہ قریب آگئی۔ منیرہ نے اس کے کان میں چائے کے ساتھ بسکٹ اور سموسے منگوانے کو کہا۔

"اچھا" کہہ کر ثوبیہ چلی گئی۔

"بڑی سعادت مند بچی ہے۔" ثوبیہ کے جانے کے بعد حسبِ عادت منیرہ نے کہا۔ "کالج سے تھک کر آتی ہے لیکن پھر بھی میرا ہاتھ بٹانے لگتی ہے۔ ایسی شائستہ اور سُدھری ہوئی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

"منیرہ کے منہ سے ثوبیہ کی تعریف سردار کو کچھ ایسی اچھی نہ لگی۔ اسے تو اپنی آصفہ کا خیال تھا۔ منیرہ ثوبیہ پر لٹو ہو گئی۔ تو اس کی دال کہاں گلے گی۔" تعریف و توصیف کا سلسلہ شاید طوالت پکڑ جاتا لیکن آصف کی آمد سے رُک گیا۔ چمن میں کھیلتی بچیاں اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ آصف نے اک نظر اُن پر ڈالی۔ لیکن طبیعت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ بچیوں کے قریب سے گزرا۔ انہیں بلایا تک نہیں۔ ممانی کو اس نے دیکھا۔ کترا کر نکل جانا چاہا۔

"آصف!" منیرہ کی آواز پر اسے مڑنا پڑا۔ "ممانی آئی بیٹھی ہیں۔"

بے دلی سے سلام کر کے آصف چند لمحے کھڑا رہا۔ یوں بھی اسے سردار سے کیا دلچسپی تھی۔

"کیسے ہو۔ کہاں ہوتے ہو۔ کبھی آتے نہیں!" سردار نے اس کے خوبصورت سراپا کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ آصف کے چہرے پر الجھی سی مسکراہٹ پھیل کر سمٹ گئی۔

"بیٹھو نا؟" سردار نے کرسی سرکائی۔

"جی نہیں شکریہ۔ میں کپڑے بدل کر آؤں گا۔" وہ ڈرائنگ روم کے ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔

کمرہ خالی تھا۔ وہ جلدی سے کوریڈور میں آیا۔ ثوبیہ کے کمرے کے سامنے چند لمحے کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے پردہ ہٹایا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کوریڈور سے گزر کر پچھلے برآمدے میں آ گیا۔

فیضی یہ پیالیاں اس ٹرے میں رکھ کر لے جاؤ۔" ثوبیہ کہہ رہی تھی۔ ثوبیہ کی آواز سنتے ہی وہ باورچی خانے کی طرف لپکا۔ ثوبیہ نے وہی صبح والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور وہ جھک کر ٹرے میں پیالیاں سجا رہی تھی۔ "لو یہ لے جاؤ" — اس نے ٹرے فیضی کو تھما دی — آصف کو دیکھ کر وہ کچھ گھبرائی۔ لیکن جلد ہی یہ گھبراہٹ مسکراہٹ میں چھپا لی۔

"تم آج کالج نہیں گئیں —؟"

"گئی تھی۔"

"گئی تھیں —؟"

"ہاں"۔

"آئیں کب؟"

"جب چھٹی ہوئی۔"

"نہیں تو۔ تین بجے تو میں وہاں تھا۔"

"میں پچھلے دروازے سے آئی۔"

"کیوں؟"

"مجھے پتہ نہ تھا۔ آپ آئے ہوں گے۔"

"پتہ تھا تو پھر پچھلے دروازے سے آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آصف۔ میں۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پلکیں جھپکاتے جھپکاتے مسکرائی۔

اس نے ٹرے اٹھائی اور باورچی خانے سے نکلی۔ لیکن آصف جامد سا کھڑا تھا۔

ثوبیہ چند قدم بھی نہ گئی تھی۔ کہ وہ لپک کر پہنچا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اچھا خاصہ جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "تم نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا کیا نا —؟"

"واللہ! نہیں آصف۔" اس نے مر کر بیچارگی سے کہا لیکن آصف کچھ نہیں بولا۔ چند ثانیے اسے عجیب سی نظروں سے گھورتا رہا۔ ثوبیہ گھبرا گئی۔ اس نے اپنی صفائی کے لیے کچھ کہنے کو لب کھولے۔ لیکن آصف کچھ سنے بغیر پلٹا اور دھب دھب کرتا چوبی زینے کو طے کرتا اوپر پہنچ گیا۔

اس کے ناراض ہونے کا یقین تو ثوبیہ کو پہلے ہی تھا۔ لیکن جس قسم کی ناراضگی اس کے چہرے سے مترشح تھی اس کا اندازہ اسے نہ تھا۔ ثوبیہ کا دل ڈوبنے لگا۔ بے دلی سے چائے کی ٹرے لے کر وہ برآمدے کی طرف گئی۔ چائے بنائی۔

"فیضی جاؤ۔ آصف کو لے آؤ۔ چائے پی لے۔" منیرہ نے ملازم لڑکے سے کہا۔

ثوبیہ جانتی تھی آصف نہیں آئے گا لیکن اس نے سردار کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ "وہ نہیں آئے گا۔" فیضی دو منٹ کے بعد ہی آواز دہ ہوا۔

"چائے کی پیالی بنا دو ثوبیہ۔ اوپر ہی لے جائیے۔ وہ کچھ تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"

ثوبیہ نے چائے بنا دی لیکن اسے یقین تھا۔ کہ آصف چائے بھی نہیں پیئے گا۔ پیالی واپس ہی آ جائے گی۔ بچیاں بسکٹوں کی پلیٹ پر پل پڑیں۔ سردار نے انہیں منع کرنا چاہا تو منیرہ نے ٹوک دیا۔ اپنی اپنی پیالی لے کر سردار اور منیرہ پھر باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ ثوبیہ نے چائے کی پیالی اٹھائی۔ لیکن گھونٹ حلق میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔

چائے ابھی ختم بھی نہ ہوئی۔ کہ فیضی منہ لٹکائے آگیا۔ اس کے کپڑوں پر چائے گری ہوئی تھی۔

"کم بخت چائے گرادی۔ پیالی تو نہیں توڑ دیا۔؟" منیرہ نے جلدی سے کہا۔ اس کی آواز میں سرزنش بھی تھی، غصہ بھی۔"

"میں نے نہیں توڑی بیگم صاحبہ! وہ اپنا میلا کرتہ جھاڑتے بولا۔" صاحب نے پیالی لے کر زمین پر دے ماری۔ میں بچانے کو لپکا۔ میرا کرتہ گیلا ہوگیا۔ پیالی ٹوٹ گئی۔ میں اٹھانے لگا تو دھکا دے کر باہر نکال دیا۔"

"کیوں ——؟" سردار حیرت سے بولی۔

"پھر کوئی دورہ پڑا ہوگا۔" منیرہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ کم بخت نے نئے سیٹ کی پیالی کا بیڑہ غرق کردیا۔" وہ بڑبڑاتی رہی۔ سردار حیران سی ہو کر رہ گئی۔ اور ثوبیہ چائے کے گھونٹ نگلتے ہوئے سہمی سہمی سی نظر آنے لگی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ آصف اتنی سی بات کا اتنا اثر لے گا۔ منیرہ اب اپنے دکھڑے رونے لگی۔ سردار اس کی ہمدردی میں بے تکان بولنے لگی۔ ثوبیہ کا دل بیزار بیزار سا تھا۔ وہ چائے کے برتن وہیں چھوڑ اپنے کمرے میں آگئی۔ کرسی میں دھنسی وہ سنجیدگی سے آصف کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اس سرپھرے انسان سے ہمدردی جتاتے جتاتے یوں اپنا تن من لٹا بیٹھی تھی۔ ایسی بھی کیا حساس طبیعت جو اتنی سی بات پر یوں بگڑ جائے۔ اس کا جی چاہا کہ اس بات پر آصف سے قطع تعلق کرکے اپنا دامن چھڑا لے۔

لیکن ایسا سوچ لینا تو آسان تھا۔ اس سوچ پر عمل پیرا ہونا مشکل دل اور دل کی دھڑکنیں بھی تو کچھ تھیں۔ جن میں آصف آصف ہی کی پکار تھی۔

—— ٭ ——

بادلوں

کا گٹھ جوڑ تو دو تین دنوں سے ہی ہو رہا تھا۔ لیکن آج شب کی تاریکیاں ڈھلتے ہی وہ زور کی بارش ہوئی۔ کہ خدا کی پناہ۔ فیل مست اور سرمئی بادلوں نے جیسے دھاوا ہی بول دیا۔ ہواؤں نے بھی تندی دکھائی اور فروری کا نکھرا نکھرا موسم ایک بار پھر کپکپاہٹوں کی نذر ہوگیا۔

ثمینہ اور آمینہ بارش شروع ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد منیرہ مجید اور ثوبیہ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے تھے۔ عامر کی باتوں کے ساتھ آصف کا بھی ذکر ہو رہا تھا۔ مجید کے لہجے میں جہاں عامر کے ذکر پر پیار، محبت اور چاہ چھلک رہا تھا۔ وہاں آصف کے تذکرے سے طنز و استحقار بھی صاف ظاہر تھا۔

منیرہ دم بخود سی اس کی باتیں سنتے ہوئے آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا کرتی۔ کیا کہتی —— آصف نے بیزار کرنے کا وہی عمل پھر سے جو شروع کر رکھا تھا۔ مجید کے تو در پئے آزار ہی رہتا تھا۔ اس حقیقت سے تو وہ خود بھی روگردانی نہ کر سکتی تھی۔

رات کو ایک ڈیڑھ بجے واپس آنا پھر معمول بنا لیا تھا۔ کھانا بھی گھر پہ نہ کھاتا تھا۔ ناشتہ بھی واپس لوٹا دیتا تھا۔ بیچاری منیرہ نے محبت سے پوچھنے کی کوشش کی۔ تو پھر گیا۔ ہاں تھی اسے کیا کہتی۔ ہاں اس کی ان حرکات سے دل دکھتا ضرور تھا۔ پچھلے دنوں اسے خوش باش دیکھ کر وہ کتنی مطمئن و مسرور ہوگئی تھی۔

بارش کیا ہے، خاصہ طوفان ہے۔ مجید نے گفت گو کا رخ موسم کی طرف موڑ دیا۔

"واقعی — گرج چمک سے تو میرا دل دہل رہا ہے۔ ثوبیہ بولی۔

"کھانا کھلا دو۔ مجھے تو سردی محسوس ہو رہی ہے۔ تھک بھی گیا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں" مجید نے کہا۔ منیرہ اٹھی۔

"میں لے آتی ہوں خالہ جان۔ آپ کہاں جائیں گی" ثوبیہ اٹھی۔ وہ باورچی خانے کی طرف چل دی۔

"ثوبیہ کو تو میں نے بیٹی بنانے کا پورا ارادہ کر لیا ہے" مجید نے بڑے جوشیلے انداز میں سرگوشی کی۔ "کیا خیال ہے تمہارا۔؟ اتنی اچھی لڑکی تو ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا" منیرہ بولی۔

"اچھا۔ اچھا۔ وقت آنے پر دیکھیں گے۔" وہ خود ہی بولا۔ "آمینہ اور ثمینہ کو بھی ثوبیہ بڑی پسند تھی۔ پھر بھی عامر کے آنے پر دیکھیں گے۔"

بہت بڑی بات بڑے ہی معمولی طریق سے ہوئی اور ختم ہو گئی۔ ثوبیہ ٹرے میں کھانا لے کر آ گئی۔ فیضی دوسری ٹرے میں جگ گلاس اٹھائے آ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے درمیان کھانا کھا کر مجید اٹھ کھڑا ہوا۔ فیضی خالی برتن باورچی خانے میں لے گیا۔

"آپ بھی لیٹ جائیے جا کر" ثوبیہ نے منیرہ سے کہا۔

"اللہ جانے ایسے موسم میں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ منیرہ نے ثوبیہ کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

ثوبیہ نے ملول ہو کر سر جھکا لیا۔ اس کے سر کا یہ جھکاؤ مجرمانہ سا تھا۔

"آپ جا کر سو جائیں خالہ جان۔ میں ان کے لیے دروازہ کھول دوں گی" ثوبیہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"تم کب تک جاگتی رہو گی؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں روز جاگتی ہی ہوں۔ امتحان قریب آ رہے ہیں۔ پڑھتی رہتی ہوں۔"

اس نے منیرہ کو مطمئن کرنے کو کہا۔ منیرہ نے احسان مند نظروں سے اسے دیکھا۔ ایسی ہمدرد اور غمگسار بچی دل میں رکھنے کے قابل تھی۔ آصف کسی قابل ہوتا تو وہ اس انمول ہیرے کو اس کے لیے محفوظ کر لیتیں۔ لیکن — ایک لمبی سی آہ میں اس نے اپنے افکارِ پریشان کو تحلیل کرتے ہوئے ثوبیہ کی طرف دیکھا۔ اور چادر سنبھالتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

ثوبیہ الجھی الجھی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس دن کے معمولی سے واقعے پر آصف اس طرح بھڑک اٹھا تھا۔ آصف کا غصہ اس بلا کا تھا۔ ثوبیہ اس کے متعلق سوچنے لگی۔ دو ایک بار اس نے اسے منانے کی کوشش میں ہنس ہنس کر اس کی طرف دیکھا بھی تھا۔ کل شام دبے لفظوں میں دو ایک باتیں بھی کی تھیں۔ لیکن وہ اس کی طرف دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اسے اس پر غصہ آ گیا تھا۔ نہیں تو نہ سہی۔ کہہ کر وہ بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔

لیکن آج صبح ہی سے وہ اس کے لیے بے چین تھی اپنی زیادتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے پہلے دن ہی سے اسے منا لینا چاہیئے تھا۔ رو کر ہنس کر بہلا کر پھسلا کر جس طرح بھی بن پڑتا وہ اسے منا لیتی۔ تو وہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔

صبح تو اسے دیکھ کر اس کا دل ہول کھانے لگا تھا۔ کتنی ویرانیاں مسلط تھیں اس کے چہرے پر۔ نڈھال۔ پژمردہ اور دل گرفتہ سا آصف اس تھکے ہوئے مسافر کی طرح لگا تھا۔ جسے سستانے کو چند لمحے تو میسر آئے۔ لیکن جسے تھکن اُتارنے سے ہمیشہ ہی کسی نے کٹھن اور طویل سفر پر دھکیل دیا ہو۔ اور وہ بے دلی سے زندگی کا بوجھ گھسیٹتے تھکے قدموں سے شاہراہِ حیات پر چلنے کی تگ و دو کر رہا ہو۔

آج جس طرح بن پڑا وہ آصف کو منائے گی۔ اس کے چہرے کا کھنچا ہوا تبسم اور جھینپی ہوئی شگفتگی لوٹا دے گی۔ اسے شکوہ کی تنبیہہ بھول گئی۔ اسے اپنے نڈر پنے اور بے باکی کا احساس نہ رہا۔ آصف۔ آصف کے سوا اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔

ثوبیہ مجسم انتظار بنی ہوئی تھی۔ بارش کا زور کچھ ٹوٹ چکا تھا لیکن ہوا کی تیزی بدستور تھی۔ ہوا کی لہروں پر بارش کی بوچھاڑ برآمدے تک آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا شاید پانی پڑنے کا اندازہ کرنے والی تھی۔ تیز ہوا کا تلخ سا جھونکا آیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ لیکن عین اسی وقت بجلی چمکی۔ اور اس چمک میں اسے چمن کے پار گیٹ میں آصف نظر آیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کچھ گھبراہٹ سی بھی محسوس ہوئی لیکن اس نے جلد ہی اپنے حواس و جذبات پر قابو پا لیا۔

دروازے کا ایک پٹ کھول کر وہ چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ لیے اس کی راہ دیکھنے لگی۔ پانی میں شرابور۔ کیچڑ سے بوٹ اور پتلون کے پائنچے لت پت بھیگے بالوں کی لٹوں سے چپکی لٹیں۔ وہ سر جھکائے برآمدے میں آیا۔ بوٹ زور سے فرش پر کیچڑ چھڑانے کو مارے۔ دونوں ہاتھوں سے پتلون کے بھیگے اور کیچڑ آلود پائنچے اوپر کیے وہ آگے بڑھا۔

"اللہ۔ آپ تو بالکل بھیگ گئے ہیں۔" ثوبیہ نے یوں ظاہر کیا جیسے دونوں کے مابین کوئی شکر رنجی ہی نہیں۔

آصف نے اسے دیکھا۔ حسین، خاموش اور گہری گہری آنکھوں میں بلا کا طوفان لیے اسے دیکھا۔ ثوبیہ کنزا کر ایک طرف ہو گئی۔ آصف آگے بڑھا اور کیچڑ سے لت پت بوٹ قالین سے رگڑتا دوسرے دروازے کی طرف چل دیا۔

"آصف ——!" ثوبیہ نے بڑی محبت اور اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن آصف نے قطعی بے گانگی، اجنبیت اور لاتعلقی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ثوبیہ کچھ نادم سی ہو گئی۔ اور آصف تیز تیز قدم اٹھاتا اوپر چلا گیا۔

ثوبیہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ کئی لمحے وہ انگلی دانتوں میں دبائے سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر بتی گل کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

"ایسی بھی کیا خفگی۔ اتنا بھی کیا غصہ۔ اس نے بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے سوچا

آنکھیں بند کر کے ماحول اور اپنے ذہنی انتشار سے چھٹکارا اور فرار پانے کی کوشش کی۔

لیکن نیند آتی کیسے۔ اس نے تو آج آصف کے ہر طور منا لینے کا عزم کر رکھا تھا اس کی ذرا سی بیگانگی کے مظاہرے سے ہی ڈانواں ڈول کیوں ہو گئی تھی۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک دم رضائی ایک طرف ہٹا دی۔ سرہانے پڑی گرم شال اوڑھی۔ اسفنجی چپل پیروں میں ڈالے —— دروازے کو آہستگی سے کھول کر کوریڈور میں جھانکا۔

مجید اور منیرہ کے کمرے کی بتی بند تھی۔ خاموشی چھائی تھی۔ وہ دبے پاؤں کوریڈور میں نکلی۔ اور تیزی سے لیکن محتاط قدم اٹھاتی زینے پر چڑھ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن اس کا عزم راسخ تھا۔

بادلوں کی گرج چمک ابھی جاری تھی۔ لیکن پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ بھیگی ہواؤں سے پھوار ضرور رس رہی تھی۔ آصف کے کمرے کی بتی ابھی روشن تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہوا کے زور سے کواڑ بج رہے تھے۔

وہ تیزی سے صحن عبور کر کے کمرے میں آ گئی۔ آصف پلنگ پر چت لیٹا تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا جس سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ راکھ جم گئی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ سگریٹ ہاتھ ہی میں سلگ سلگ کر ختم ہو رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ساکت اور بے حس۔

وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اس کے انداز سے تو ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ہاں پھیلے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا سلگتا سگریٹ شاہد تھا۔ کہ وہ ابھی سویا نہیں۔

ثوبیہ چند لمحے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔ قدموں کی چاپ پر اس نے لیٹے لیٹے آنکھیں نیم وا کر کے دیکھا۔

ثوبیہ کے قدم بڑھتے رک گئے۔ لیکن آصف نے دوسرے لمحے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ یوں پڑا رہا جیسے اس کی آمد سے بالکل انجان ہو۔

چند ثانیئے وہ اس امید پہ کھڑی رہی کہ آصف اس کے یوں اور اچانک آ جانے سے چونکے گا اٹھ بیٹھے گا۔ لیکن وہ تو اس سے سنجیدگی سے ناراض تھا۔ پھر بھلا اس کی اچانک آمد کو کیوں وقعت دیتا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔

بادل ٹکرا کر گرجے اور بجلی ٹوٹ کر گری۔ کڑاکے سے کواڑ بج گئے۔ اور ثوبیہ ڈر اور گھبراہٹ سے بدحواس ہو کر دوڑی۔

پلنگ کی پٹی پہ جھکتے ہوئے اس نے آصف کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ آصف نے گوشۂ چشم سے اسے دیکھا۔ گھبراہٹ گھبرائی ثوبیہ اچھی بھی لگی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بھی چھلک جانے کو مچلی۔ لیکن وہ پھر بھی بے حس سا پڑا رہا۔

"آصف!" ثوبیہ نے اسے جھنجھلا کر جھنجھوڑا۔ اس کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا۔ وہ مٹی کے بے جان تودے کی طرح پڑا رہا۔

ثوبیہ نے جھک کر جلتا ہوا سگریٹ اٹھایا اور سرہانے رکھی ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

"آصف۔ بولتے کیوں نہیں۔ ایسی بھی کیا ناراضگی۔۔؟" وہ پٹی پہ بیٹھے ہوئے اس کا گریبان پکڑ کر بولی۔

لیکن مٹی کے بت میں حرارت پیدا نہ ہوئی۔ "آصف آپ اتنی سی بات پہ اس طرح خفا ہو گئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا!" وہ سٹ پٹا سی گئی۔ آصف نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا گھورنے کے انداز میں جیسے کہہ رہا ہو اس سے بڑی بات بھی کوئی ہو سکتی ہے۔

وہ الجھنے لگی۔ لیکن موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی۔

"آپ نہیں سمجھتے آصف۔ آئے دن کالج سے بھاگ جانا کتنی بری بات ہے۔" وہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر اپنے دونوں ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔

کسی کو پتہ چل گیا تو کتنی سبکی ہو گی۔ کسی نے دیکھ لیا تو کتنی بدنامی ہو گی۔ گھر میں ہم

ہر وقت ساتھ رہ سکتے ہیں۔ دن رات اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں رات رات بھر اسی طرح آپ کے پاس بیٹھی رہا کروں گی۔ میں روز اوپر آ جایا کروں گی۔ اس طرح نہ بدنامی کا ڈر ہے ــــ نہ سبکی کا خوف۔

وہ دیر تک اپنی صفائی پیش کر کے اسے مناتی رہی لیکن اللہ جانے وہ کیوں ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ بولتے بولتے وہ تھک گئی۔ اس پہ جھک کر اس کے سینے پہ بازو رکھ کر اس کے چہرے کو تھام تھام کر اس نے اسے منانے کی کتنی کوشش کی تھی۔

لیکن ایسی بے حسی اور بے مروتی بھی کیا۔ اسے آصف پہ غصہ آنے لگا۔ اس کے نسائی وقار کو ٹھیس جو پہنچی تھی۔

"نہیں بولیں گے؟" اس نے بالآخر غصے سے کہا اور پھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اک جھٹکے سے اس نے جانے کو قدم اٹھایا۔

لیکن دوسرے جھٹکے سے وہ آصف کے سینے پہ گرتے گرتے بچی۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ نظروں کا سکوت و جمود ٹوٹ چکا تھا۔ اور وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے مسکرائے جا رہا تھا۔

کتنی پرسکون تھی یہ مسکراہٹ۔ اس کے ہاتھ کی گرفت ثوبیہ کی کلائی پہ اور سخت ہو گئی۔ ثوبیہ کوشش کے باوجود اپنی کلائی نہ چھڑا سکی۔

آصف مان گیا تھا لیکن اب ثوبیہ روٹھ گئی تھی۔ اتنا ستایا جو تھا آصف نے اسے۔ پہلے ہی مان جاتا تو کیا تھا۔

آصف بڑے والہانہ انداز میں اسے منانے لگا۔

—ــــ—

سگریٹ کی ڈبیہ سے چمکتی ہوئی پنی نکال کر آصف نے گولی بنائی اور زینے میں کھڑے کھڑے ثوبیہ کو ماری جو باورچی خانے کے سامنے تخت کے قریب کھڑی چائے پی رہی تھی۔

پنی کی گولی پیالی میں گری۔ ثوبیہ کا ہاتھ لرز گیا۔ پیالی گرتے گرتے بچی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اس سمت دیکھا جدھر سے پنی آئی تھی۔

آصف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ثوبیہ نے نگاہ کے ترچھے زاویوں سے اسے گھورا۔ جواباً اس نے تین انگلیاں کھڑی کر دیں۔

ثوبیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ آصف نے آنکھیں دکھائیں۔ ثوبیہ مسکرا دی۔ اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

آصف پھر تین انگلیاں دکھاتے ہوئے زینہ اتر آیا۔ اس کے قریب سے یوں گزرا۔ جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔ وہ اپنا پیغام پہنچا چکا تھا اور ثوبیہ مان چکی تھی۔ اس لیے مطمئن ہو کر دفتر چل دیا تھا۔

ثوبیہ نے چائے کی پیالی ویسے ہی فیضی کو پکڑا دی۔ تخت سے کتابیں اٹھا کر وہ کوریڈور میں آ گئی۔ کالج جانے کا وقت ہو رہا تھا۔

آصف بھی چلا گیا۔ ثوبیہ بھی چل دی۔

لیکن باورچی خانے میں بیٹھی منیرہ نے سر تھام لیا۔ دونوں ہاتھوں سے تھامے وہ کئی لمحے بے حس سی بیٹھی رہی۔

باورچی خانے کی جالی دار کھڑکی کے سامنے ہی تو ثوبیہ کھڑی تھی۔ اور دائیں ہاتھ کے زینے کے آخری موڑ پر آصف بھی صاف نظر آیا تھا۔ نپی کی گولی۔ چائے کی پیالی۔ تین انگلیاں۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکراہٹ۔ آنکھیں دکھانا۔ اور پھر مسکرا کر سر اثبات میں ہلانا۔ اس نے جالی کی الماری سے سب کچھ یوں دیکھا تھا۔ جیسے کوئی کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہو۔

وہ دونوں تو چلے گئے تھے۔ لیکن منیرہ کو چکر سا آ گیا تھا۔ اس نے سر کو کئی بار جھٹکا۔ جیسے اس واقعے کی صداقت سے منحرف ہونا چاہتی ہو۔ لیکن فیضی نے چائے کی آدھی پیالی اس کے سامنے ہی رکھ دی تھی۔ جس میں نپی کی چمکتی گولی اب تک تیر رہی تھی۔

"یا اللہ! وہ گھبرا کر تیرتی ہوئی نپی کی گولی دیکھنے لگی ــــ "تو۔ کیا۔ کیا ــ کیا ــ؟"

اس کا ذہن ماؤف ہوتا محسوس ہوا ــــ دماغ کی رگیں ستسنانے لگیں۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پنی کی گولی۔ تین انگلیاں۔ مسکراہٹوں کے تبادلے۔ انکار۔ اقرار۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سر جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔

"اللہ جانے یہ کھیل کب سے کھیلا جا رہا ہے!" اس نے سوچا اس خیال سے ہی لرز گئی۔

پرائی جوان بیٹی کی ذمہ داری اس نے بڑے اعتماد سے اپنے ذمہ لی تھی۔ آصف جیسے کھرے اور لاپروا لڑکے سے اس نے کوئی خدشہ ہی محسوس نہ کیا تھا۔ جسے اپنا ہوش نہ تھا۔ اسے دوسروں کا کیا خیال۔ لیکن آج۔ آج اس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ اس کے خیال کی تردید ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اور اسے اپنی حماقت کا احساس شدت سے ہوا تھا۔ جو اس نے پرائی جوان بیٹی کو گھر میں جوان لڑکے کے ہوتے ہوئے رکھ کر کی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ سوچے جا رہی تھی۔ ماضی کا سینہ آئینے کی طرح کھل گیا تھا۔ اور کئی واقعے

اس کی نظروں میں نئے رنگ سے سامنے آ رہے تھے۔

رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے ثوبیہ کا آصف کے لیے دروازہ کھولنا اسے بُری طرح کھٹک رہا تھا۔ وہ تو گھوڑے بیچ کر بے خبر سو جایا کرتی تھی۔ اور وہ خدا جانے۔۔۔! اس نے پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر۔۔۔ اسے چند دن پہلے کا واقعہ یاد آیا۔ جب وہ باورچی خانے سے پانی کا گلاس لینے آئی تھی۔ رات کا شاید ایک بج چکا تھا۔ اس نے سیڑھیوں پر کسی کے دبے پاؤں کی آہٹ سنی تھی۔ جیسے کوئی نیچے آتے آتے ایک دم اوپر پلٹ گیا ہو۔ اس نے اس وقت اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن اب دل ہول کھا رہا تھا۔۔۔ تنہائیوں میں یک جائیاں کہیں کوئی گل ہی نہ کھلا چکی ہوں۔ جوانی اندھی ہوتی ہے۔ کیا نہیں ہوتا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو اس بستی میں جوانی کے دیوانے پن کا عبرت ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ فرزانہ کے اپریشن کا قصہ کسے معلوم نہیں تھا۔ تصور اسے بہت دور لے گیا۔ اور وہ روح فرسا تصور سے سہم کر کانپ اٹھی۔

اس کا دل ڈوبتا ہی گیا۔ دماغ چکرانے لگا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اور بدن کی نس نس سنسنانے لگی۔

لیکن اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ ثوبیہ یقیناً ایسی لڑکی نہ تھی۔ اور آصف بھی تو ایسا بدکردار نہ تھا۔ اس نے دل کو طرح طرح سے دلاسے دے کر اپنی طبیعت بحال کر لی۔

گھر کے کام کاج میں آج اس کا قطعاً جی نہ لگا۔ بھنگن کے سر پر کھڑے ہو کر معمول کے مطابق صفائی بھی نہ کروائی۔ کھانا بھی خود تیار نہ کر سکی۔ فیضی سے فقو کی ماں کو بلوا بھیجا۔ امی نے کھانا بنایا۔

اس کے خیالات گھوم پھر کر صبیح کے واقعے پر مرکوز ہو جاتے۔ تین انگلیاں۔۔۔ وہ اس اشارے کا مطلب نہ سمجھ سکی تھی۔ لیکن بات کوئی اہم ہی تھی۔ بار بار وسوسے

ذہن میں ڈنک مار رہے تھے۔

ہر دوسرے چوتھے روز ثوبیہ کا دیر سے گھر آنا بھی اب اسے مشکوک سا لگا۔ وہ جوں جوں سوچتی گئی اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔

وہ کس سے پوچھے۔ کس سے کہے اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ ثوبیہ سے سب کچھ کیوں کر پوچھ لیتی۔ اور آصف سے بھی کچھ کہنے سننے کا سوال ہی نہ تھا۔ سیدھی بات ٹھیک سے سننے کا روادار نہ تھا۔ یہ بات کیوں کر سن لے گا۔ اکھڑ اور خود سر تو تھا ہی منیزہ اس سے تو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ کر سکتی تھی۔

بیچاری عورت پریشان سے پریشان تر ہوتی گئی۔ چشم تصور گزرے واقعات کے چہروں سے پردے اٹھائے گی اور وہ گھبرائے سٹ پٹائے تماشائی کی طرح ان واقعات کو دیکھے گئی۔

آصف اور ثوبیہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ یہ تو منیزہ پر واضح ہو گیا تھا لیکن نئی پود کا نظریۂ محبت کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ عشق کے ان نئے روپ کی تان کہاں آ کر ٹوٹتی تھی۔ اس کا اسے بخوبی علم تھا۔

ثوبیہ اس کے گھر میں اس کی ذمہ داری پر مہمان بن کر نہ آئی ہوتی تو شاید وہ آصف کی محبت کا قصہ سن کر یوں پژمردہ اور نڈھال نہ ہوتی۔ لیکن اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ ثوبیہ مجید کی رشتہ دار تھی۔ آصف اور مجید کی ٹھنڈی بیزاری بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ اور اگلے دن مجید نے دبے دبے لفظوں میں ثوبیہ کا عامر کے لیے انتخاب کا ذکر بھی کیا تھا۔ کاش آصف ہی کسی اچھی جگہ پر نوکر ہوتا۔ تو وہ اس معاملے کو بدقت تو سہی لیکن سمیٹ تو لیتی۔ لیکن وہ ڈیڑھ سو روپے کی ان ونول کیا وقعت تھی۔ ثوبیہ ایک بڑے سرکاری افسر کی بیٹی تھی۔ پرائیویٹ فرم کے ایک معمولی کلرک کی ان کے ہاں کیا وقعت و اہمیت تھی۔

وہ سارا دن سوچوں میں غلطاں رہی۔ کبھی ایک ڈھنگ سے سوچتی کبھی دوسرے

سے۔ سوچیں الجھتی گئیں۔ الجھے دھاگوں کے اس گچھے کی طرح جس کا کوئی بھی سرا کھلنے کی بجائے ایک اور گرہ پڑ جاتی ہے اور بالآخر کھولنے کی مسلسل کوششیں کو ایک بڑی سی ۔۔۔ موٹی سی گرہ بنا کر رکھ دیتی ہیں۔

ثوبیہ آج بھی کالج سے چھٹی کے بعد گھر نہ آئی۔ منیزہ کے وسوسے الجھتے گئے پریشانی بڑھتی گئی۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر چمن میں ٹہل ٹہل کر وہ ثوبیہ کا انتظار کرتی وہ اپنے حافظے پر زور دے دے کر یاد کرتی رہی، لیکن اسے کوئی ایسا دن یاد نہ جب ثوبیہ دیر سے گھر لوٹی ہو اور اس کے لوٹنے سے پہلے آصف گھر میں آ گیا ہو۔

شام اتر رہی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں اور روپہلی عبائیں سمٹ کر گوشۂ مغرب میں ڈھیر ہو رہی تھیں۔ تپش ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ منیزہ نے خنکی کا احساس کیا۔ پھرتے تھک چکی تھی۔ دماغ بھی چور چور تھا۔ گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر اس نے آخری مضطر نگاہ دور سڑک پر ڈالی اور اندر جانے کو مڑی۔

لیکن پھر پلٹ کر دیکھا۔ اور دیکھتی رہی۔

دور سڑک پر۔ ناصر شاہ کی سفید کوٹھی کے دائیں ہاتھ ٹیکسی رکی تھی۔

وہ ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھوں پر رکھے غور و انہماک سے ادھر دیکھنے لگی۔ ٹیکسی سے کوئی مرد اترا۔ اس کے بعد اک لڑکی۔

لڑکی نزاکت سے ہاتھ ہلا کر الوداعی اشارہ کرتے مڑی۔ مرد نے بھی ہاتھ ادھر کیا۔ پھر ٹیکسی میں بیٹھا۔ اور ٹیکسی چل دی۔

منیزہ کا دل جیسے حلق میں آ کر اٹک گیا۔ دوری کے باوجود اسے آصف اور ثوبیہ کو پہچاننے میں دشواری نہ ہوئی تھی۔

وہ گھبرا کر اندر چلی گئی۔ دل بے طرح دھک دھک کیے جا رہا تھا۔ ایک ہی دن میں کئی باتیں، کتنی حقیقتیں بن کر سامنے آ گئی تھیں۔ وہ اب تک۔ خواب گراں میں ڈوبا

تھی۔ اتنی دیر پہلے اسے کیوں کسی بات کا علم نہ ہوا تھا۔ اتنی بچی بھی تو نہ تھی ایسی بھولی بھالی بھی نہیں تھی لیکن گھر میں اتنا بڑا وقوعہ ہو گیا اور وہ بے خبر ہی رہی۔

رات اس نے وانستہ ثوبیہ کو ٹٹولا۔ "بیٹی اتنی شام کو اکیلی تو نہیں آتیں؟"

"نہیں خالہ جان! عائلہ اور رفیعہ بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کیا کریں۔"

اس نے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔

اور

منیزہ اس سترہ سالہ لڑکی کی دیدہ دلیری پر دل ہی دل میں بل کھا کر رہ گئی۔

——+——

"نہیں ۔ نہیں ۔ شوخی سے مچلتے وہ چیخی، چند گز کے فاصلے پر کھڑا آ
اونچی نیچی زمین کو پھلانگتا اس کے قریب آیا لیکن وہ شوخ ہرنی
طرح کلیلیں کرتی دور بھاگ گئی۔

"ثوبیہ ــــ!" آصف نے رک کر تحکمانہ انداز میں کہا۔

"جی فرمائیے ۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھک گئی ۔ آج آصف کو ستانے
موڈ میں تھی۔

آصف آگے بڑھا ۔ وہ پھر دوڑی ۔

"ثوبیہ ۔ رک جاؤ ۔ بات تو سنو ــــ!" آصف درخت کی جھکی جھکی ٹہنیوں کو
سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"وہیں سے کہیئے" ثوبیہ اترا کر بولی "کل پھر یہاں آنے کی بات نہیں مانو
اور جو جی چاہیئے کہیئے ــــ"

"کیوں نہیں مانو گی ــــ؟" آصف کو تاؤ آگیا "تمہیں آنا ہوگا!"

"نہیں نہیں ۔ نہیں ــــ" وہ اس کا منہ چڑا کر بھاگی ۔

آصف اسے پکڑنے کو دوڑا ۔ وہ آگے پیچھے دوڑنے لگے ۔ کبھی درختوں کے
گھوم جاتے ۔ کبھی اونچی نیچی زمین پر گرنے سے بچنے کی کوشش میں تیز مگر محتاط
رکھتے ۔ کبھی ہری ہری مخملیں گھاس کو روندتے ۔ کبھی خودرو جھاڑیوں سے الجھ
ثوبیہ کئی مرتبہ آصف کے ہاتھوں بچی ۔ ایک بار اس کا دوپٹہ آصف نے پکڑ

لیکن دوپٹہ کھسکا کر وہ اس کے ہاتھ سے پھسلتی مچھلی کی طرح نکل گئی ۔ آصف نے دوپٹہ
پھینکا ۔ وہ درخت کی شاخوں میں الجھ گیا۔

دوڑی جا رہی تھی ۔ سانس پھول رہے تھے ۔ قہقہے ابل رہے تھے ۔ جب کبھی آصف
ثوبیہ کے انتہائی قریب آجاتا تو وہ ایک لمبی چیخ مار کر تگ و دو کرتی اور اس کے ہاتھوں
سے بچ جاتی ۔ ہانپتے ہوئے دوڑے جاتی۔

ویرانہ ان کی شوخ چھیڑ چھاڑ سے آباد نظر آنے لگا تھا ۔ ڈوبتا سورج چشم نیم وا
سے ان معصوم شوخیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ جھلمل کرتی پچھلے پہر کی دھوپ،
سبز سبز گھاس جھکے جھکے درختوں کی بوجھل شاخوں پر پھڑپھڑاتے پرندے، خودرو پھیلی
پھیلی بیلیں قدرت کے اس حسین منظر میں آصف اور ثوبیہ کی شوخ چھیڑ چھاڑ سے رنگ
سے بھر گئے تھے ۔

ثوبیہ ایک موٹے سے درخت کے گرد گھومی ۔ آصف اس کے پیچھے بھاگنے کی
بجائے رک کر سامنے سے لپکا ــــ ثوبیہ درخت کی اوٹ میں اسے دیکھ نہ سکی ۔ ہانپتی
ہوئی تیزی سے آ رہی تھی ــــ آصف نے پکڑنے کو ہاتھ بڑھائے ۔ وہ اپنی رفتار پر
قابو نہ پا سکی ــــ سیدھی آصف کے سینے سے جا ٹکرائی۔

ایک لمحہ کو دونوں سنبھل نہ پائے ۔

یہ لمحہ بڑا قیامت خیز تھا۔

ثوبیہ کا گال آصف کی سفید بے داغ قمیص کے کھلے گریبان سے جھانکتے سینے پر تھا ۔ آصف نے بے ساختہ اسے تھام لیا۔
سیاہ اور گھنے چھاتی کے بالوں سے چھو گیا تھا ۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہ پائی ۔ لیکن جب بار بار
کے لمس کے احساس کی رسائی ذہن تک ہوئی تو اسے یوں لگا جیسے کسی آتش گیر مادے
سے جا ٹکرائی ہو اور شعلوں کی تپش اس کے وجود میں برقی رو کی طرح اتر گئی ہو ۔ آصف
نے بھی اپنے حواس پر کچھ ایسی ہی سرور انگیز تپش محسوس کی لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا ۔

پیار کی مقدس امانت میں خیانت کا خیال بھی محال تھا۔ ثوبیہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ اس کا چہرہ انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی سرخی اتر آئی تھی۔ وہ مڑی۔

"کہاں؟" آصف نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ وہ سمجھا۔ شاید ثوبیہ ایک بار پھر اسے چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔

لیکن ثوبیہ میں تو قدم اٹھانے کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔

"چھوڑ دو میرے بال۔!" اس نے بال چھڑانے کی کوشش کی۔

"پہلے وعدہ کرو۔!" آصف معمول پر آچکا تھا۔

"کیسا وعدہ۔!" وہ جھلا کر بال چھڑانے لگی۔

"کل پھر آؤ گی یہاں۔؟" آصف نے جھنجھوڑ دیا۔

وہ چیخ اٹھی۔

"تم اپنے وعدے سے منحرف ہو گئی ہو۔ یاد ہے اس دن کیا وعدہ کیا تھا؟" آصف نے پھر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ ثوبیہ رو دینے کو تھی۔

"تم نے کہا تھا۔ میں جب بھی کہوں گا۔ تم میرے ساتھ آیا کرو گی۔ یاد ہے۔!" آصف نے اس کے بال پکڑے پکڑے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔

اور جونہی آنکھیں چھلک جانے کو تھیں۔ آنسو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے ایک دم اس کو چھوڑ دیا۔ متاسف ہو کر جلدی سے بولا۔ "معاف کر دو ثوبیہ۔"

وہ پشیمانی سے ہاتھ ملتے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کا موڈ ایک دم بدل گیا تھا۔ ثوبیہ نے اسے دیکھا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا وہ۔ گرے پتلون سفید قمیض کا کھلا گریبان۔ اس کا جی چاہا اسے دیکھتی چلی جائے۔ بال کھنچوانے کی اذیت بالکل بھول گئی۔

آنسو آنکھوں ہی میں خشک ہو گئے۔ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پشیمان، پشیمان۔ اور الجھا الجھا آصف کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دیکھتی رہی۔

اور جب آصف نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ثوبیہ! وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔ عجیب سا آدمی ہوں۔ تم بھی حیران ہوتی ہو گی۔"

"بالکل" ثوبیہ پہلے کی طرح چہکنے لگی۔ جذبات کا لمحاتی سکتہ ختم ہو چکا تھا۔ آتش گیر سے کی تپش ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

"ثوبیہ" وہ اس کے مسرور لہجے سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"عجیب ہی عادت ہے میری۔ ہر بات اپنی ہی منوانا چاہتا ہوں۔ اپنی ہی مرضی چلانے خواہش ہوتی ہے۔ شاید۔"

وہ چپ ہو گیا۔ ثوبیہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے ابروؤں کی کمان کھینچ کر ثوبیہ کو دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ شاید یہ میری زندگی بھر کی محرومیوں اور ناکامیوں کا ردعمل ہے۔"

اس کا انداز اتنا دل فگار تھا۔ کہ ثوبیہ بے چین ہو گئی۔

"تم نے میری باتیں مان لی تھیں اس لیے میں بہت سر چڑھ گیا اپنی مرضی تم پر مسلط کرنا بھی اپنا حق سمجھتا ہوں۔ اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"اس زبردستی میں میری خوشیاں مضمر ہیں آصف ۔!" ثوبیہ نے دھیمی دھیمی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کتنی اچھی ہو ثوبیہ۔" وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر آصف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ثوبیہ مسکرا دی اور پھر دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے اس درخت تک جا پہنچے۔ جس کی شاخوں میں ثوبیہ کا دوپٹہ الجھا ہوا تھا۔ آصف نے دوپٹہ اتار کر ثوبیہ کی طرف پھینکا۔ نادم سے تبسم سے ثوبیہ نے دوپٹے کو شانوں پر پھیلا دیا۔

دونوں باتیں کرتے آگے بڑھ گئے۔ آصف ثوبیہ کی شوخ باتوں کے باوجود ابھی تک

سنجیدہ تھا۔ شاید اپنی مرضی ثوبیہ پر زبردستی مسلط کرنے کے احساس سے ضمیر ملامت کر رہا تھا۔

"آصف۔۔؟" ثوبیہ ایک دو شاخہ درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہوں۔"

"آپ اتنے حساس کیوں ہیں۔ معمولی سی بات کا بھی اتنا اثر لیتے ہیں۔ درگزر کرنا بھی دیکھیں!"

"بہت کوشش کرتا ہوں ثوبی۔ لیکن جانے کیوں اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکتا شاید بچپن کے چرکوں سے ذہن اتنا نازک ہو چکا ہے کہ ذرا سی بات پر بھی برداشت نہیں ہوتی۔ سوچتا رہتا ہوں۔ کڑھتا رہتا ہوں۔"

"ماضی کو یوں ذہن سے لپٹائے رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ آصف ماضی تو ٹھنڈی راکھ ہے۔"

"میرا ماضی ٹھنڈی راکھ نہیں ثوبی۔ سلگتی آگ ہے۔ اس کی آنچ مستقبل تک پہنچ رہی ہے۔ اس کی لپٹیں حال کو جلا رہی ہیں اور یقین مانو ثوبیہ۔ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو جانے یہ آگ کتنی بھڑک اٹھتی۔ ہر چیز کو جلا کر خاک و خاکستر کر دیتی۔ تمہاری قربت ٹھنڈک کا احساس ہے۔"

"ٹھنڈک کا احساس ہوتا تو ماضی کی سلگتی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔ آپ نے شاید اپنی سوچ کا انداز بدلنے کی قسم کھا لی ہے۔ مانا کہ آپ کا بچپن، لڑکپن حتیٰ کہ جوانی خوشگوار نہیں گزری۔ لیکن اب ـــ اب تو آپ کو ان خطوط پر نہیں سوچنا چاہیئے۔ سب کچھ بھلا دیں آصف سب کچھ ـــ"

وہ درخت سے ٹیک لگا کر تنے پر نیم دراز سی ہو گئی۔ آصف درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کتنی ہمت بندھا رہی تھی ثوبیہ۔ وہ اس پر جھک کر عقیدت مند نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

ثوبیہ مسکرائی۔ "سب کچھ بھلا دیں آصف!"

پھر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بڑی نرم جوشی سے بولی۔ "بیتی باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ آصف ان کو بھلا کر صرف اتنا یاد رکھیں۔ کہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا ہے۔"

"ثوبیہ!" آصف نے اس نرم و گداز ہاتھ کو بڑی مقدس شے سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیا۔ "یہ ہاتھ میری غیر متوازن اور لڑکھڑاتی زندگی کے لیے ایک مضبوط سہارا ہے ثوبیہ۔" اس نے اس کے اپنی ہتھیلی پر رکھے گداز ہاتھ پر دوسرا ہاتھ ملائمت سے پھیرتے ہوئے سنگین و سنجیدہ آواز میں کہا ـــ "اگر یہ سہارا کبھی چھوٹ گیا ـــ تو ـــ میں نہیں جانتا ـــ کیا ـــ ہو گا ـــ"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا آصف۔" ثوبیہ نے بڑے جذباتی انداز میں اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ـــ آصف نے عقیدت و محبت کے بھرپور جذبوں سے مغلوب ہو کر ان ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

—— ❊ ——

عمر بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے عہد و پیمان ہو رہے تھے۔ اور

ادھر

ادھر منیرہ بیچاری کی جان جیسے لبوں پر اٹکی تھی۔

ثوبیہ کے ابو چار بجے کے آئے بیٹھے تھے۔ وہ گجرات دورے پر جاتے ہوئے راستے میں بیٹی سے ملنے ٹھہر گئے۔ سرکاری جیپ ساتھ تھی۔ اردلی بھی تھا ڈرائیور بھی۔ زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ خیال تھا۔ ایک آدھ گھنٹہ رک کر ثوبیہ سے مل لیں گے۔ اس کی امی کا پیار اور بہن بھائیوں کا دعا سلام پہنچا کر آگے چل دیں گے۔

لیکن چائے پینے کے بعد بھی انتظار کرتے تقریباً پورا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ گو منیرہ نے انہیں پریکٹیکل کا کہہ کر مطمئن تو کر دیا تھا لیکن جوں جوں شام ہو رہی تھی۔ ان کی فکر بڑھ رہی تھی۔

"ہر روز اسی وقت لوٹتی ہے۔" انہوں نے کئی بار متفکرانہ پوچھا۔

"ہر روز نہیں، تیسرے چوتھے دن۔ شاید ہفتے میں دو دفعہ پریکٹیکل ہوتے ہیں۔" منیرہ نے ہر بار انہیں مطمئن انداز میں جواب دیا تھا۔ لیکن خود اس کا دل! غم و فکر سے جیسے ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کئی بار وہ بہانے بہانے گیٹ تک ہو آئی تھی۔ فیضی کو دو تین دفعہ سڑک پر دیکھنے کو بھی بھیج چکی تھی۔

"اکیلی تو نہیں آتی نا؟" باپ کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔

"اے ہے۔ حمید بھائی۔ یہ کوئی سماں ہے۔ اکیلے آنے جانے کا۔ اسی کالونی کی تین چار لڑکیاں اس کے ساتھ پڑھتی ہیں۔ اکٹھی آتی جاتی ہیں۔ فکر کی بات نہیں

آدھے پونے گھنٹے تک آ جائے گی۔" بیٹھے دل اور سوکھتے لبوں کے باوجود منیرہ نے مطمئن طریق سے کہا۔

"اتنی دیر کس قسم کا پریکٹیکل ہوتا ہے۔" حمید نے سوچتے ہوئے کہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں۔ پڑھی لکھی تو ہوں نہیں۔ پتہ نہیں۔ کیا گٹ مٹ کرتی تھی۔" منیرہ کا دل حمید کے استفسار پر اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ لیکن بظاہر ہنس کر بات ٹالی۔ حمید مسکرا دیا۔ منیرہ کو سکھ کا سانس آیا۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں خود ہی اسے کالج جا کر مل آتا ہوں۔ جیپ تو پاس ہے ہی۔"

تو منیرہ سر تا پا لرز گئی۔ چند ثانیے تو اسے کچھ سوجھ بوجھ ہی نہ آئی — اور اگر۔ عین اس وقت مجید عامر کا خط لیے آ نہ جاتا۔ تو حمید منیرہ کے کسی بہانہ کا اختراع کرنے سے پہلے ہی بیٹی سے ملنے کالج چل دیتا۔ مجید بڑے تپاک سے حمید سے ملا۔

"کہاں جا رہے ہو۔؟" مجید نے عامر کا خط جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

"گجرات جانا ہے۔ ثوبیہ سے ملنے ٹھہر گیا تھا۔" حمید سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"ہاں بھئی! بیٹی کی کشش ہی کھینچ سکتی تھی۔ ورنہ ہمیں ملنے آتے اس کا سوال ہی نہ تھا۔" مجید نے ہنس کر کہا۔

"نہیں بھئی — ملنا تو سب ہی سے تھا۔" حمید شاید کھسیانہ سا ہو گیا تھا۔

"بیٹھو — بیٹھو —" مجید نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ثوبیہ کے کالج جا رہا ہوں۔"

"کیوں —؟"

"ابھی تک آئی نہیں۔"

"آئی نہیں۔؟" مجید نے حیران ہو کر کہا۔

"اجی۔" اس کا پریکٹیکل ہوتا ہے۔ ہفتے میں دو دفعہ چھ سوا چھ گھر آتی ہے۔" منیرہ نے جلدی سے کہا۔

"پھر آتی ہی ہوگی۔ تم کہاں چل دیے۔ بیٹھو!"

"بھائی صاحب! مجھے گجرات بھی جانا ہے۔"

"صبح چلے جانا۔"

"رات نہیں رک سکتا۔"

"کیوں!"

"بھئی ساتھ ڈرائیور بھی ہے اردلی بھی۔ کہاں آپ لوگوں کو تکلیف دوں گا۔"

"تو کیا ہوا۔ جگہ بہت۔ اور بھئی بات تو دل کی ہوتی ہے۔ دل ہمارا بہت بڑا ہے۔"

حمید بیٹھ گیا۔ دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ مجید نے عامر کا خط جیب میں ڈال لیا۔ منیرہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آئی۔ دل ہی دل میں ثوبیہ اور آصف کو کوس رہی تھی۔ سر پر آتا رجھولی پھیلا کر خدائے قدوس سے عزت رکھ لینے کی کتنی دفعہ دعا مانگ چکی تھی بیچاری۔

باہر گیٹ تک جا کر وہ پھر برآمدے سے ہوتی ہوئی کمرے میں لوٹ آئی۔ مجید اور حمید عامر کی باتیں کر رہے تھے۔ انہیں گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ کر منیرہ کو تسلی ہوئی۔

"کتنا عرصہ باقی ہے عامر کا۔؟" حمید نے سگریٹ ش لے کر پوچھا۔

"بس کوئی پونے دو سال اور ہیں۔ بڑے شاندار نمبروں پر امتحان پاس کیا ہے پچھلا۔"

"کون سا مضمون ہے اس کا؟"

"انجینئرنگ۔ ایگزکنڈیشنگ۔ مجید نے بڑے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔ "اسے بچپن ہی سے انجینئر بننے کا شوق تھا۔ یہاں تو داخلہ ہی نہ مل سکا۔ ہم نے بھی سوچا۔ آخر یہ کس لیے ہے۔ کیوں نہ بچے کی خواہش پوری کر دیں۔"

"بڑی عقلمندی کی باہر کی ڈگری کی شان یوں بھی کم نہیں ہوتی۔ بڑی مانگ ہے یہاں۔"

دونوں بڑے انہماک سے باتیں کر رہے تھے۔ منیرہ بھی باتوں کو طول دینے کے لیے بولے جا رہی تھی۔ سوا چھ بجے کے قریب برآمدے میں قدموں کی آواز آئی۔

"آ گئی ثوبیہ۔" منیرہ کے دل و دماغ سے جیسے سارا بوجھ اتر گیا۔

وہ واقعی آ گئی تھی۔ گیٹ کے باہر کھڑی جیپ دیکھ کر اسے ابو کی آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ قدرے گھبرا بھی گئی تھی۔ لیکن ابو کو مطمئن کرنے کا بہانہ بھی وضع کر لیا تھا۔ وہ سیدھی کمرے میں آئی۔ اور "ابو!" کہہ کر باپ سے لپٹ گئی۔

"اتنی دیر بیٹا۔؟" باپ نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"امی کیسی ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے آتے ابو۔ شاہینہ، صائمہ کا کیا حال ہے۔ شازی کیسا ہے؟ ایک ہی ... گھر کے ہر فرد کا بیتابی سے حال پوچھے گئی۔ سوالوں کی ایسی بوچھاڑ ہوئی۔ کہ ابو کو دیر سے آنے کی کے متعلق کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ ملا۔ "تمہاری امی تم سے بڑی اداس ہو گئی ہیں۔"

"انہیں بھی ساتھ لیتے آتے ابو!"

"پگلی۔ میں سرکاری کام جا رہا ہوں۔ اسے کہاں اٹھائے پھرتا۔" حمید ہنس کر بولا۔

"دل تو میرا بھی اداس ہو گیا ہے۔ دو مہینے ہو چکے ہیں آئے ہوئے۔"

"یوں کرو۔ دو چار دن کی چھٹی لے لو۔ گجرات سے واپسی پر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں چلی جانا۔" منیرہ نے ثوبیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی کہا۔ "دو تین چھٹیاں لے لینا۔ دل تو آخر اداس ہوتا ہی ہے نا۔"

"ابو! آپ کی ٹرانسفر کا کیا بنا؟" ثوبیہ نے منیرہ کی بات سننے کے بعد باپ سے پوچھا۔

"بس اب ہو ہی جائے گی۔"

"کب ــــ ؟"

"ہو سکتا ہے اسی مہینے ہو جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ دو چار ماہ اور لگ جائیں کوشش تو بہت کر رہا ہوں۔ تمہاری امّی جو دن رات پیچھے لگی رہتی ہے۔ اس کا بس چلے تو مجھے وہیں چھوڑ چھاڑ لاہور آن بسے۔"

"بہت پسند ہے انہیں لاہور؟" مجید نے پوچھا۔

"پسند خیر کیا۔ ثوبیہ کے لیے جلد از جلد لاہور آنا چاہتی ہیں۔" حمید نے کہا۔

"ماں جو ہوئیں۔ ٹھیک ہی سوچتی ہیں۔" منیرہ نے کہا۔

"کیوں ــــ ؟" مجید مسکرایا۔ "بھابی کو ہم پر اعتبار نہیں کیا؟"

"مجید بھئی! ہم نے تو ثوبیہ کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔"

"آپ ہی کی بیٹی ہے بھابی صاحب۔ اسی لیے تو بے فکر ہو کر یہاں چھوڑ گئے تھے ہم۔" حمید نے جواب دیا۔

"بھابی سے کہہ دینا۔ اب ہم بیٹی واپس نہیں دیں گے۔" مجید نے کہا اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اس کی ہنسی معنی خیز تھی۔ عامر کا لفافہ پھر جیب سے نکال لیا تھا۔

حمید بھی مسکرایا۔ منیرہ بھی۔ ثوبیہ جانے کیا سوچ کر، کیا سمجھ کر محجوب سی ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔ حمید رات وہیں رک گیا۔ رات دیر تک محفل جمی رہی۔ آصف بھی شریکِ محفل تھا۔ حالاتِ حاضرہ پر دیر تک تبصرہ ہوتا رہا۔

صبح حمید گجرات چلا گیا۔ تین دن کے بعد اسے واپس آنا تھا۔ واپسی پر ثوبیہ کو ساتھ لے جانے کا پروگرام بھی طے ہو گیا تھا۔ ثوبیہ ملتان جانے کے لیے رضامند تھی یا نہیں۔ ہاں منیرہ نے باتوں باتوں میں اسے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ماں کی محبت اور بہن بھائیوں کے پیار کا احساس اس طریق سے دلایا۔ کہ اس نے بھی تین دن کی رخصت لے کر ابو کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ اتوار کی تو چھٹی تھی ہی۔ چار دن کا پروگرام طے ہو گیا۔

کیا گئی۔ ستاروں میں روشنی نہ رہی والی بات ہو گئی۔ آصف کو یوں لگا۔

ثوبیہ جیسے زندگی کی جگمگاتی راہیں اچانک اندھیروں لپیٹ میں آ کر سنسان و ویران ہو گئی ہوں۔

جیسے گاتی مسکراتی بہاریں یک دم خزاؤں کا روپ دھار گئی ہوں۔ جیسے صبحوں کے اجالوں کا نور چھن گیا ہو۔ رات کی تاریکیوں کا پُراسرار حُسن زائل ہو گیا ہو۔

جیسے شب و روز کی گردش بے معنی ہو گئی ہو اور وقت کے تال پر لمحوں کا رقص بے مقصد ہو گیا ہو۔ زندگی بے کیف روکھی پھیکی اور خشک محسوس ہونے لگی۔ جیسے جل تھل ندیا کی طرح جو چشمِ زدن میں سوکھ کر دھرتی کا پیاسا ہونٹ بن گئی ہو۔

نڈھال، بے چین اور بے قرار آصف کو اب احساس ہوا۔ کہ ثوبیہ کس طرح اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو چکی ہے۔ اس کی روح پر اسی کی کتنی مضبوط گرفت ہے اپنے پیار کی گہرائی اور گیرائی کا اسے علم تو تھا۔ لیکن اس کی شدت سے شاید آگہی نہ تھی اور اب ثوبیہ سے جدا ہو کر ہی اسے پتہ چلا۔ کہ جدائی ہی وہ آلہ ہے جس سے عشق کے جذبوں کی شدت، نوعیت اور تاثر کا پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اور اب اسے بخوبی اندازہ ہو گیا۔ کہ اس کی زندگی اور زندگی کی حرارت ثوبیہ ہی ہے۔ اس کے بغیر وہ مٹی کا جیتا جاگتا ڈھیر ہے۔ زندگی کی چلتی پھرتی نعش ہے۔ ثوبیہ اس کے لیے ایک عام لڑکی نہیں تھی۔

وہ تو اس کی عمر بھر کی جستجو تھی۔ برسوں کی تلاش تھی۔ جنوں کی کھوج تھی۔ اسے

پاکر اس نے زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھا تھا۔

ناکامیوں سے نپٹنے کا گر اپنایا تھا۔ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی
کو بیدار کیا تھا۔ ذہن میں جمی ہوئی نفرت اور بیزاری کو کھرچنے کی سعی کی تھی۔ س
کے ڈھنگ بدلے تھے۔

ثوبیہ کچھ عرصہ پہلے بھی ملتان چلی گئی تھی۔ اس کی یاد میں بے چینی اس نے تب
بھی محسوس کی تھی۔ سراپا انتظار بن کر بھی پھرتا رہا تھا لیکن ــــ جب ــ اور ــ اب
میں کتنا فرق تھا ــــ اسے تو یوں لگتا تھا۔ جیسے ثوبیہ چار دنوں کے لیے نہیں۔ ب
صدیوں کے طویل عرصے کے لیے اس سے بچھڑ گئی ہو اور اس کے بغیر کوئی کام
درکنار سانس لینا بھی دشوار ہو گیا ہو۔

دفتر جانے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ گھر میں بیٹھنے سے طبیعت گھبرا جاتی۔ اور
اور عمران کے ہاں بھی دو منٹ ٹھہرنے کو دل نہ مانتا۔ پارے کی طرح مضطرب
بے قرار وہ صبح سے شام اور شام سے صبح ہونے کے بیزار کن عمل کو دیکھتا رہا۔

منیرہ ماں تھی۔ اس کی محبت کا بھی اسے علم تھا۔ گو اس محبت کی نوعیت سے
آگاہ نہ تھی۔ محبت جلتی ہوئی جذباتی قربتوں کے سوا اس کے نزدیک اور کیا تھی۔
وہ آصف سے اس بارے میں کھل کر بات کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے ثوبیہ کو دو روز
مجبور ہو کر اس نے باپ کے ساتھ بھیج دیا تھا۔

جب سے اسے گھر میں کھیلے جانے والے اس کھیل کا علم ہوا تھا۔ اس کی جا
پر بنی ہوئی تھی۔ مجید سے ڈر لگتا تھا۔ وہ کوئی بات منظر عام پر آنے سے پہلے ہی اسے
دبا دینا چاہتی تھی۔ آصف ڈرانے دھمکانے سے تو کچھ سمجھنے کا نہیں۔ منت
سماجت کر کے وہ اسے ثوبیہ کے خیال سے باز رکھنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔
لیکن اسے سمجھ نہ آتی تھی۔ کہ آصف سے کیا کہتے، کیوں کر کہنے، کچھ کہنے کی کوشش

سے پہلے ہی اس کا اپنا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ پریشان ہو کر چپ کی چپ رہ جاتی۔

اس دن پچھلے صحن میں بچھی ننگی چارپائی پر آصف اوندھا لیٹا تھا۔ ایک بازو چارپائی
کی پٹی پر تھا۔ جس پر ٹھوڑی ٹکائے تھا۔ دوسرا نیچے لٹک رہا تھا۔ فرش پر انگلی سے
لکیریں کھینچتے ہوتے وہ "سوچ میں ڈوبا تھا۔

منیرہ نے صحن کے دو چکر لگائے۔ لیکن آصف کو مخاطب نہ کر سکی۔ ہار کر باورچی خانے
کے سامنے بچھے تخت پر جا بیٹھی۔ فیضی چائے بنا کر لے آیا۔

"ایک پیالی اور لاؤ۔" منیرہ نے ٹرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جی۔" فیضی لپک کر باورچی خانے سے چینی کی خوبصورت پیالی اٹھا لایا۔

"آصف!" منیرہ نے گردن گھما کر اسے آواز دی۔ وہ اسی انداز میں چارپائی پر پڑا۔
زمین پر انگلی سے لکیریں بنا بنا کر مٹا رہا تھا۔

"آصف چائے پی لو۔" منیرہ نے پھر آواز دی۔

آصف نے ذرا سا سر موڑا اور پھر اپنے مشغلے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"فیضی جاؤ آصف سے کہو۔ "امی چائے کے لیے بلا رہی ہیں۔" منیرہ نے چائے دانی
سے سرخ پھول دار ساٹن کی ٹی کوزی اٹھاتے ہوئے کہا۔

فیضی دوڑا گیا۔ چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر منیرہ کا پیغام اسے ایک بار نہیں
تین چار بار دہرا کر سنایا۔ اکتا کر وہ اٹھ بیٹھا۔

"بڑی بیگم صاحبہ چائے کے لیے بلا رہی ہیں۔" فیضی نے منیرہ کی طرف اشارہ کیا۔
آصف سے وہ بے طرح ڈرتا تھا۔ آصف نے الجھے بالوں میں انگلیاں الجھا کر انہیں
درست کیا۔ پاؤں میں سلیپر پہنے اور ماں کے پاس تخت پر آ بیٹھا۔

ماں نے چائے بنا کر پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ پیالی ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔
گرم گرم چائے سے بھاپ اٹھتی رہی۔ وہ غیر محسوس سے دھوئیں کو نظریں جمائے

دیکھتا رہا۔

"آصف؟" ماں نے پکارا۔ وہ اپنی چائے کی پیالی ختم کر چکی تھی۔

"جی" وہ بے دھیانی سے بولا۔

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کس سوچ میں ہو۔؟"

آصف نے جواب دینے کی بجائے چائے کے وہ چار گھونٹ حلق سے اتار پیالی خالی کر دی۔ ٹرے میں پیالی رکھ کر وہ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگا۔

"کن چکروں میں پڑے ہو۔؟" منیرہ نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"جی۔؟" وہ چونک گیا۔ منیرہ معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

"کیا بات ہے بیٹا۔؟" وہ چائے بناتے ہوئے معنی خیز انداز میں پھر مسکرائی۔

"کن جنجالوں میں پڑ گئے۔؟" وہ پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"کسی میں بھی نہیں۔" وہ پیالی لیتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

"مجھ سے کیا چھپاتے ہو۔" میں سب کچھ جانتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

آصف اس کا منہ دیکھنے لگا۔ "ثوبیہ کے جانے سے پریشان ہو نا۔؟"

ماں نے اس کے من کا چور پکڑ لیا تھا۔ وہ کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا۔

"بیٹا۔" ماں بدستور سنجیدہ تھی۔

وہ کن انکھیوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے اس کی بات سننے کا منتظر رہا۔ ماں شاید بات کرنے کو الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔ چپکے چپکے چائے کے گھونٹ حلق سے اتار کر اس نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی۔

"بات یہیں رک جائے تو اچھا ہے۔" وہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

آصف نے بے چین ہو کر ماں کو گھورا۔

"وہ اس گھر میں مہمان بن کر آئی ہے۔ اس کے والدین نے ہم پر بھروسہ اور اعتماد

کر کے اسے یہاں رکھا ہے۔" ماں چپ ہو گئی۔

"ان کے اعتماد اور بھروسے کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔" قدرے توقف کے بعد آصف نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"لیکن ——؟" ماں نے بے تابی سے کہا۔

"محبت جرم ہے نہ گناہ۔" اس نے بڑی سنجیدگی اور بے باکی سے اعتراف کیا۔

"ثوبیہ میری زندگی ہے ماں۔" میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

ماں نے غور سے آصف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ صداقت کی لو میں کانپ رہی تھیں اس کی نظروں میں۔ لیکن اس کے ذہن میں محبت کا جو مفہوم تھا۔ ان کانپتی لوؤں سے مٹ نہ سکا۔

"جوانی میں یونہی لگتا ہے۔" ماں نے کہا۔ لیکن آصف کچھ سننے سے پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اسے چوبی زینے پر تیزی سے جاتے دیکھتی رہ گئی۔

ذہن کا جو بوجھ تھا۔ وہ اٹھ نہ سکا۔ منیرہ کا جی چاہا۔ کہ اس کے پیچھے اوپر چلی جائے اور آج ہی اسی وقت ثوبیہ کے متعلق اس سے کوئی دو ٹوک فیصلہ کرے۔

لیکن وہ اوپر جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ ہاں بات کرنے کے موقع کی منتظر ضرور رہی۔ دوسری شام اسے کھل کر بات کرنے کا موقعہ مل گیا۔ آصف بھی جان بوجھ کر ماں اس کی محبت کے راز سے واقف ہو چکی ہے۔ اس لیے اس شام ماں بیٹے میں خوب ہی باتیں ہوئیں۔

ماں کا انداز ناصحانہ تھا۔ اس نے آصف سے صاف صاف باتیں کیں۔ زمانے کے نشیب و فراز سمجھائے۔ آجکل کی پڑھی لکھی فیشن زدہ لڑکیوں کے خیالات کا ذکر کیا۔ ثوبیہ کے والدین کی حیثیت کا ذکر کیا۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ مجید کی ثوبیہ کے لیے خواہش کا بھی تذکرہ کیا۔

لیکن آصف کچھ سمجھنے کی بجائے بپھر گیا۔ ثوبیہ اس کا مقدس پیار تھی۔ اس سے دست برداری کا ذکر سننا بھی محال تھا۔ اس سے کسی بے اعتنائی کی توقع کا تذکرہ بھی سماعت پر گراں تھا۔

ماں اس کے صادق جذبوں کے سامنے کچھ جھک سی گئی۔

"تو پھر اپنے آپ کو اس کے قابل بناؤ۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ نہ سمجھا۔

"اپنے لیے کوئی باعزت و باوقار سا روزگار تلاش کرو۔ اسے اپنانا ہے۔ تو اپنے آپ کو اس قابل بھی تو بناؤ۔ بچوں کا کھیل ہی تو کھیلتے نہیں رہو گے۔ اس کھیل کو کسی انجام پر بھی تو پہنچانا ہو گا۔"

آصف چپ ہو گیا شاید اس نہایت اہم پہلو پر اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

—— ❖ ——

کے سامنے تو وہ برہم ہوا تھا لیکن جب رات بستر پر لیٹا تو حقیقتوں

ماں

کے چہرے صاف صاف نظر آنے لگے۔ ماں نے جس طرف توجہ دلائی تھی۔ اس نے تو کبھی ان خطوط پر سوچا ہی نہیں تھا۔ ثوبیہ سے شادی کی خواہش اس کے جوان دل میں ابھری ضرور تھی لیکن وہ تو عشق و محبت کی رنگین وادیوں میں کچھ اس طرح جذب و سرشار ہو کر کھو گیا تھا۔ کہ مستقبل کے اس اہم اور ضروری پہلو پر کچھ سوچنے کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اس کے من میں تو صرف ثوبیہ بسی تھی۔

ثوبیہ اور بس ثوبیہ۔ مادی دنیا سے جیسے اس ثوبیہ کو کوئی تعلق واسطہ ہی نہ تھا۔ لیکن آج منیرہ کے بظاہر سادہ سے جملے نے اس کی حسین و رنگین دنیا کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

ثوبیہ اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ اس سے دست بردار ہونے کا ذکر سننا بھی محال تھا۔ وہ کسی اور کی ہو جائے ایسا لرزا دینے والا تصور اس کے ذہن میں کبھی آیا تھا۔

لیکن آج ماں کے کہے ہوئے جملے "مجید بھی ثوبیہ کی خواہش رکھتا ہے ——" اس کے دل و دماغ کو جھلسا دینے کو کافی تھے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی تھی کہ محبت صرف کھیل ہی نہیں۔ اس کھیل کو واقعی کسی انجام کو بھی پہنچنا چاہیئے۔

انجام کو پہنچنے کے متعلق جب اس نے سوچا تو اس کا دل بے طرح گھبرانے لگا۔ ہر راہ مسدود پائی۔ ہر راستہ بند پایا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس ڈسنے لگا۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے ذہن میں طوفان سے اٹھنے لگے کاش وہ انجینئر بن گیا ہوتا۔

انجینئر کے لفظ کے ساتھ ہی اسے عامر کا خیال آ گیا۔ اور پھر خیالات کا تار ٹوٹ کہیں سے کہیں لے گیا۔ عامر انجینئر۔ مجید کی ثوبیہ کے لیے خواہش — اپنا پیار — ثوبیہ کا وجود سب آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ وہ بستر سے نکل کر بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ اس کے خیالات میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ رات خواب آور گولیاں کھانے کے باوجود اسے ٹھیک طرح سے نیند نہ آئی۔ صبح دفتر بھی نہ گیا۔ سارا دن پریشان و مضطرب رہا۔ شام وہ عمران کے ہاں گیا۔ عمران اس کا مخلص دوست تھا۔ اس سے اس نے اپنا کوئی راز کبھی نہیں چھپایا تھا۔ ماں سے جو طویل گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا مختصراً ذکر اس نے عمران سے بھی کر دیا۔

شاید عمران بھی آصف کے جذبے کی گہرائی سے ناواقف تھا۔ اس لیے لاپروائی سے بولا۔ اس میں فکر کی کیا بات ہے میرے دوست۔ چند دنوں کی بات ہے۔ اس کے ابو کی تبدیلی ہونے کی دیر ہے۔ وہ اس راہ گئی۔ اور تم اس راہ۔ وہ تمہیں بھول جائیگی تم اسے — اللہ اللہ خیر سلا۔"

عمران نے کچھ مضحکہ خیز طریق سے کہا۔ کہ آصف کے پریشان چہرے پر بھی ہنسی کے واضح آثار نظر آنے لگے۔

"یہ سب یک جائی کا نتیجہ ہے۔ وقتی لگاؤ ہے میاں مجنوں۔ اسے اتنا سنجیدہ نہ بناؤ۔"

"بات مذاق میں نہ اڑاؤ۔ یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"تو پھر خارجہان والی بات پر عمل کرو۔ اچھا باوقار روزگار راہ پر تو پڑا نہیں جو حاصل کر لوں —" تو پھر اس کا خیال چھوڑ دو۔"

"عمران! وہ زور سے چیخا۔ میری جان پر بنی ہے اور تم مذاق میں اڑا رہے ہو۔" عمران نے غور سے دیکھا تو آصف واقعی بڑا سنجیدہ تھا۔

"آصف!" وہ قریب آ کر اس کے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک گیا۔

آصف چپ ہو رہا۔ "تم تو واقعی بڑی سنجیدگی سے عشق فرما رہے ہو۔" اس نے پھر ٹالنا چاہا۔ آصف نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

عمران نے بھی منیرہ بی کا مذکورہ اختیار کرتے ہوئے اسے محبت کے اس باب کو یہیں ختم کر دینے کا مشورہ دیا۔ آصف برہم ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

عمران نے آجکل کے دور پر اچھا خاصہ لیکچر دے ڈالا۔ آجکل کی پڑھی لکھی لڑکیوں کا نظریہ اس کے گوش گزار کیا۔

"آجکل کی لڑکیاں بڑی سمجھ دار ہیں میرے دوست۔ وہ دن گئے جب عشق ایک جذبہ ہوا کرتا تھا۔ آجکل عشق ایک پیشہ ہے۔ اس کے لیے دل نہیں دماغ سے کام لیا جاتا ہے۔ تعلیمی مدارج کے ساتھ ساتھ آجکل کی لڑکیوں کا اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق نظریہ بھی ترقی کرتا جاتا ہے۔ اعلیٰ سرکاری افسر یا بھاری بنک بیلنس والا بزنس مین جو سوسائٹی میں چلنے پھرنے کے اصولوں سے بھی نابلد نہ ہو۔ آئیڈیل بن کر ان کے حواس پر چھایا رہتا ہے۔"

آصف سر ہاتھوں پر گرائے اس کی تقریر سنتا رہا۔ ثوبیہ کے والد اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔ وہ خود ہوم اکنامکس کالج کی طالبہ ہے۔ کوئی وجہ نہیں۔ کہ اس کے ذہن میں بھی کوئی ایسا آئیڈیل نہ آیا ہو۔"

آصف نے ہونٹ کاٹتے غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ عمران کی باتوں کو سختی سے جھٹلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عمران بولا۔

"ثوبیہ بھی تمہاری طرح جذبات کی رو میں بہہ گئی ہے۔ اس نے اس اہم حقیقت کے متعلق یقیناً تمہاری طرح کبھی سوچا ہی نہیں ہوگا۔ لیکن آصف اس حقیقت سے تم چاہو بھی تو فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں اس کا سامنا کرنا ہی ہے۔"

آصف نے سر پھر ہاتھوں پر گرا لیا۔ عمران پھر چپ ہو گیا۔ آصف کی حالت دیکھ

اسے بے طرح پر رحم آنے لگا۔ وہ آصف کے حالات سے باخبر تھا۔ اپنے ازلی مدنصیب دوست کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرنے کی تمنا اسے گدگدانے لگی۔ آصف کے انداز بتا رہے تھے۔ کہ ثوبیہ کے بارے میں وہ کس قدر سنجیدہ ہے۔

شانو دو پیالیوں میں چائے لے آئی۔ لیکن آج آصف نے حسبِ عادت اس کی موٹی سی چٹیا پکڑ کر جھنجھوڑا نہیں۔ کہ چائے لانے میں دیر کیوں لگادی۔ وہ بھی دونوں کو اس قدر سنجیدہ اور کھویا کھویا سا دیکھ کر چپکے سے کمرے سے نکل گئی۔

چائے کی دونوں پیالیاں میز پر پڑی رہیں۔ بھاپ اٹھتی رہی۔ چائے ٹھنڈی ہوتی رہی پیالی کی سطح پر نظریں جمائے آصف سوچ میں کھویا رہا۔ عمران بھی آنکھیں جھپکاتے سر کھجلاتے، شاید کسی منصوبے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ چائے یونہی پڑی رہی۔ دونوں کو جیسے میز پر ان پڑی پیالیوں کا ہوش ہی نہ تھا۔

آصف کی سنجیدگی اور پریشانی سے عمران بڑا متاثر ہوا لیکن اس نے جس رخ سے بھی اس کے متعلق سوچا۔ اس کی ناؤ کنارے لگتی نظر نہ آئی۔ دو اڑھائی سو روپے کے پرائیویٹ ملازم کی کیا وقعت جبکہ اس کے مقابل بیرونی یونیورسٹی کا کامیاب انجینئر اپنے باپ کی ساری دولت سمیت موجود تھا۔ ثوبیہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر سوچنے والی ہو بھی۔ جب بھی اس کے والدین موجود تھے۔ جو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے بیدار ذہن سے سوچ سکتے تھے۔

اس نے دل ہی دل میں کئی سکیمیں بنائیں۔ کئی منصوبے تیار کیے لیکن پلان ایک بھی ایسا نہ تھا جو قابلِ عمل ہوتا۔ وہ کرسی پر گر گیا۔ پشت پر سر ٹکا کر چھت کو دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں بجانے لگا۔ اچانک اسے کوئی امید افزا خیال آگیا۔

"آصف!"

"ہوں۔۔۔"

"تمہاری عمر کیا ہوگی۔۔۔؟"

"تیئیس سال۔"

وہ فرطِ مسرت سے کرسی سے جیسے اچھل پڑا۔ "ہاتھ دو استاد!" اس نے ہاتھ آصف کی طرف بڑھایا۔

"فوج میں کمیشن کے لیے درخواست دے دو!"

"وہ کیسے۔۔۔؟"

"ٹھہرو۔ میں نے ابھی تین چار دن ہوئے گریجویٹ کورس کا اشتہار دیکھا تھا حکومت نے درخواستیں طلب کی ہیں۔ عمر میرا خیال ہے چوبیس سال ہے۔"

وہ کرسی سے اٹھا اور پلنگ کے سرہانے بغیر پٹ کے الماری میں اوپر نیچے رکھی انگریزی اردو کے گڈمڈ اخباروں سے اپنا مطلوبہ اخبار نکالنے لگا۔

آصف کو بھی جیسے اندھیرے راستوں میں روشنی کی کرن نظر آگئی۔ فوج میں کمیشن مل جائے۔ بس پھر اور کیا چاہیئے تھا۔ آخر مطلوبہ اخبار مل ہی گیا۔ دونوں دوست اخبار میز پر پھیلا کر بے تابی سے اس پر جھک گئے۔ گریجویٹ کورس کے لیے عمر چوبیس سال ہی تھی۔ "کمیشن لینے کے لیے جان کی بازی لگا دو دوست۔ کوئی کام ناممکن نہیں رہتا۔ عزمِ صمیم ہونا چاہیئے۔"

اخبار کا وہ صفحہ تہہ کر کے آصف نے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے مسرت آشنا ہونٹوں پر بڑا دل آویز تبسم مچل گیا۔

"کل تو اتوار ہے۔" عمران بولا۔ "پیر کو ضرور فارم کا پتہ کرنا۔"

"پتہ کیا کروں گا۔ فارم ہی لے آؤں گا۔۔۔" آصف بولا۔

"درخواستوں کی آخری تاریخ کیا ہے۔۔۔؟" عمران نے پوچھا۔

آصف نے جیب سے اخبار کا تہہ شدہ کاغذ نکالا۔ کھول کر تاریخ دیکھی۔

"چہلم میں ہے — اوہ ابھی بہت دن ہیں۔"

"تم دونوں کا انتظار نہ کرو۔ پرسوں ہی سارا کام ختم کرنا۔"

"ضرور۔"

دونوں کے موڈ کچھ خوش گوار سے ہو گئے تھے — کافی دیر تک دونوں، میں مشغول رہے۔

— ٭ —

"امّی —!"

"امّی گھر پہ نہیں ہیں۔"

"کہاں گئیں۔"؟

"اپنے بڑے بھائی کے گھر — شاید ان کا بھتیجا بیمار ہے۔"

آصف باورچی خانے ہی میں آ گیا۔ جہاں ثوبیہ کچھ پکانے میں مصروف تھی۔

"کب آئیں گی امّی —؟"

"کچھ کہہ نہیں گئیں۔ غالباً شام ہی کو لوٹیں گی۔"

"تم کیا کر رہی ہو —؟"

"کھیر بنا رہی ہوں۔"

"نتھو کی ماں بنا لیتی۔ تم کیوں بے کار وقت ضائع کر رہی ہو!"

"خالہ جان مجھے کہہ گئیں — ویسے بھی مجید چچا کو میرے ہاتھ کی بنی کھیر بہت پسند ہے۔"

ثوبیہ اٹھلا کر بولی۔

لیکن آصف کے چہرے پر ناگواری کے آثار مترشح ہونے لگے۔ جب سے یہاں آیا ہے۔ مجید چچا روز ہی کھیر کی فرمائش کرتے ہیں۔ انہیں ٹھنڈی ٹھنڈی کھیر بڑی مرغوب ہے۔ مجھے تو وقت نہیں ملتا تھا۔ ایک دفعہ پہلے بنائی۔ آج فارغ تھی۔ خالہ جان نے بھی کہا — میں بنانے لگی۔"

ثوبیہ نے کھیر کی دیگچی چولھے پر سے اتارتے ہوئے کہا۔

آصف باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ طبیعت آج موزون تھی۔ لیکن ثوبیہ کو مجید کے لیے کھیر پکاتے دیکھ کر حسب عادت مزاج بگڑنے لگا۔

ثوبیہ نے اس کے ذہنی اتار چڑھاؤ سے بے خبر کھیر چینی کے پیالے میں انڈیلی۔ اور پلیٹ میں رکھنے کے لیے باورچی خانے سے جانے لگی۔

"ثوبیہ!" آصف اس کے قریب آ کر بولا۔

"ہوں۔"

"میں نے تمہیں اس دن بھی منع کیا تھا!"

"کس بات سے ——؟"

"یاد کرو ——!"

ثوبیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "توبہ! توبہ —— بیچارے مجید چچا!" آصف ہنسا۔ نہیں مسکرایا بھی نہیں۔ بلکہ پہلے سے کچھ اور سنجیدہ ہو کر اسے گھورنے لگا۔

جب سے منیرہ نے اسے بتایا تھا۔ کہ مجید بھی عامر کے لیے ثوبیہ کی خواہش رکھتا ہے۔ آصف مجید سے زیادہ ہی متنفر نظر آنے لگا تھا۔ چند دن پہلے اس نے ثوبیہ کو بطور خاص تنبیہہ کی تھی۔ کہ وہ مجید کا کوئی کام نہ کیا کرے۔

ثوبیہ اس کے پاگل پنے پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اور آج جب آصف نے اس بات کی یاد دہانی کرائی۔ تو وہ پھر ہنس کر پیالہ میں رکھنے کھانے کے کمرے کی طرف چل دی۔ پیالہ رکھ کر واپس آئی تو آصف اسی انداز میں وہیں کھڑا تھا۔

"چائے پئیں گے ——؟"

"ہوں ——"

"آپ اندر چلیئے۔ میں دو منٹ میں چائے لے کر آتی ہوں۔" وہ آصف کی سنجیدگی پہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

وہ اندر چلا گیا اور ثوبیہ چائے بنانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے اٹھائے اندر چلی دی۔ آصف اس کے کمرے میں تھا۔ وہ ٹرے وہیں لے آئی۔ کرسی آصف کی طرف بڑھا کر اس نے میز پر ٹرے رکھی۔ دو چار کتابیں میز پر پڑی تھیں۔ اس نے اٹھا کر پلنگ کے سرہانے رکھ دیں۔ اور خود میز پلنگ کے قریب کھینچ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

آصف کرسی پر بیٹھنے کی بجائے دائیں طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھنے لگا۔

ثوبیہ نے چائے بنائی۔ چمچ سے پیالی بجا کر آصف کو مخاطب کرنا چاہا۔ لیکن وہ وہیں کھڑا جانے کیا سوچتا رہا۔

"چائے ——!" ثوبیہ نے متبسم لہجے میں کہا۔

آصف نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ثوبیہ مسکرا دی۔ آصف پھر باہر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا نظر آ رہا تھا۔ چہرے کی ساری شگفتگی مٹ چکی تھی۔

ثوبیہ پیالی اٹھائے اس کے قریب آئی۔

"چائے پی لیں۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" اس نے پیالی کھڑکی میں رکھتے ہوئے کہا۔

آصف خاموشی سے چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

"آصف ——" ثوبیہ اس کی خاموشی سے اپنا دم گھٹتا محسوس کر رہی تھی۔ "آپ اتنی جلدی خفا ہو جاتے ہیں۔ منیرہ خالہ کہہ گئی تھیں۔ میں کیا کہتی۔ کھیر بنانا پڑی۔ مجید چچا کے لیے خاص تھوڑا ہی بنائی ہے۔"

"مجید چچا کے لیے خاص نہیں بنائی۔ لیکن مجید چچا خوش ہوں گے۔ داد دیں گے۔ سگھڑاپے اور سلیقہ شعاری بیٹی کے لیے بڑی بڑی جانفزا امیدیں باندھ بیٹھیں گے ——" آصف اسے پیار سے گھورتے ہوئے جیسے پھٹ پڑا۔

ثوبیہ ۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"چائے پی لیں پہلے ۔ پھر لڑائی کر لیں گے ۔" ثوبیہ اس کی پیالی ہاتھ میں لیکر مڑی

"یہاں بیٹھئے صاحب ۔۔۔ اطمینان سے چائے نوش کیجئے ۔" پیالی میز پر رکھ کر اس نے کرسی آصف کی طرف بڑھائی ۔ آصف کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پیش از مرگ واویلا ۔" ثوبیہ نے پیالی ہونٹوں سے لگاتے کن انکھیوں سے آصف کو دیکھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا "یہ بھی کوئی بات ہے بھلا ۔"

"ثوبیہ جو بات میری برداشت سے باہر ہو ۔ تم وہ کر رہی کیوں ۔۔۔ ؟" آصف نے محبت بھرے شاکی لہجے میں کہا۔

ثوبیہ نے غور سے آصف کو دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولی ۔" آصف آپ کو واقعی مجید چچا سے اتنی شدید نفرت ہے ۔۔۔ ؟"

"میں نے تمہارے ایماء پر اپنے ذہن میں جمی اس نفرت کو کئی بار کھرچنے کی کوشش کی ثوبیہ لیکن نفرت کا زہر کچھ اس طرح گھل چکا ہے کہ اب اسے نکال پھینکنے کی کوئی امید نہیں رہی ۔ صرف مجید سے نہیں ۔ باپ بیٹے سے مجھے نفرت ہے ۔ نفرت ۔ میرے پاس الفاظ نہیں ۔ جن سے میں اپنے اس جذبے کی تشریح کر سکوں ۔" آصف نفرت سے ناک سکیڑے ماتھے پر شکنیں لیے بیزار سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

ثوبیہ ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی ۔ اس کے اندر وہ ناک ماضی کے متعلق اس نے بہت کچھ سنا تھا ۔ آصف نے خود بھی کئی واقعات اسے سنائے تھے ۔ لیکن آصف کے ذہن میں جمی نفرت کا اسے پوری طرح احساس نہ تھا۔

"باپ بیٹے نے ہمیشہ میرے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے ۔ اب تک میں سب کچھ جانے کیسے برداشت کرتا آیا ہوں ۔ لیکن اب دونوں کی ذرہ بھر زیادتی ان طوفانوں کو دعوت ہو گی جو برسوں کے تار و ریشے سے میرے شعور و لاشعور میں سلگ رہے ہیں ۔"

آصف کے جوش بھرے الفاظ سے ثوبیہ ڈر گئی ۔ سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ ماضی کو بھلا دیں ۔" وہ خوف زدہ سے لہجے میں صرف یہی کہہ سکی ۔ "نفرت کا احساس بھی کم ہو جائے گا ۔"

"ہونہہ ۔۔۔!" آصف نے ثوبیہ کی طرف دیکھے بغیر جیسے اپنے آپ سے کہا ۔" اس نفرت کی جڑیں بہت دور ہیں ۔ میری دسترس سے باہر ۔ میری پہنچ سے دور ۔ شاید اس کی جڑیں بچپن کی ان حدود سے پھوٹی ہیں ۔ جب مجید نے امی سے نکاح کیا تھا ۔ اور مجھے اکیلا تھیال میں چھوڑ کر امی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا ۔ یا ہو سکتا ہے ۔ اس جذبے نے جنم اس رات لیا ہو ۔ جب امی گھر پر نہیں تھی ۔۔۔ میں اور عامر اپنے کمرے میں سوئے تھے ۔ برق و باراں کا طوفان تھا ۔ کھڑکیاں کواڑ پھٹ پھٹا رہے تھے ۔ ڈر کر ہم دونوں چیخے ۔ مجید سا تھ والے کمرے سے اٹھ کر آیا ۔ ایک دم بتی جلائی ۔ اور عامر کی طرف لپکا ۔ اسے چھاتی سے لپٹا کر پیار کرتے ہوئے چپ کرانے لگا ۔ میں بھی ڈر سے کانپ رہا تھا ۔ چھلانگ لگا کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا ۔ لیکن ثوبیہ نے ایک بار بھی میرے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں پھیرا ۔ بلکہ غصے سے جھڑکا اور بولا :

"اتنے بڑے ہو گئے ہو ۔ ڈر کس بات کا ۔۔۔ دفع ہو جاؤ اپنے بستر میں ۔ وہ خود عامر کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا ۔ اور میں رات بھر ڈرتا ۔۔۔ وحشت زدہ ۔ برق و باراں کے طوفان سے ہول کھاتا رہا ۔ بجلی کہیں کڑک کر گرتی ۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ۔ میرا حالانکہ وجود سردی کے باوجود پسینہ پسینہ ہو جاتا ۔ اس رات میں نے نفرت کا جو طوفان اپنے دل و دماغ میں اٹھتا محسوس کیا تھا ۔ وہ اب تک قائم ہے ۔ کوشش کے باوجود اس میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی ۔"

ثوبیہ بڑی متاثر نظر آ رہی تھی ۔ وہ چشم تصور سے اس رات کا اندازہ کر رہی تھی شاید کتنا ترس آ رہا تھا اسے آصف پر ۔ سات آٹھ سال کا منا منا سا معصوم بچہ ۔ پیار و شفقت

سے کس بے رحمی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ سوائے نفرت کے اس بات کا ردِ عمل اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔

وہ بڑی دردمندی سے آصف کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اس کی باتیں سنتی رہی۔ بچپن کے کئی واقعات وہ اسے سنا رہا تھا۔ مجید اور عامر کی زیادتی کے واقعات اپنی حق تلفی کے واقعات۔

"گرمیوں کی وہ شام بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آمینہ اور ثمینہ آپا آئی ہوئی تھیں۔ ہم پرانے والے گھر میں رہتے تھے۔ شام سب چھت پر بیٹھے تھے۔ آموں کا ٹوکرہ آیا ہوا تھا۔ سب بالٹی میں برف ڈالے آم ٹھنڈے کر کے کھا رہے تھے۔ عامر باپ کی گود میں بیٹھا تھا۔ کبھی باپ اور کبھی بہنیں، اس کے منہ میں آم ٹھونس رہے تھے۔ میرا جی بھی چاہتا تھا۔ مجھے بھی کوئی یونہی گود میں بٹھا کر اسی طرح ناز برداری کر کے آم کھلائے۔ میں کبھی مجید کے گھٹنے سے چمٹتا — کبھی آمینہ کے، کبھی امّی کے تو کبھی ثمینہ کے۔ لیکن مجھے درخورِ اعتنا کون سمجھتا —"

"امّی بھی نہیں —؟" ثوبیہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"وہ تو سب کی خاطر داریوں میں لگی تھیں۔ میرے وجود سے تو بے خبر ہی رہتی تھیں۔"

ثوبیہ نے گہری سانس لے کر بڑا پیار اور ہمدردی سے آصف کو دیکھا۔

"اچانک آمینہ آپا کی نادرہ جو اُن دنوں ڈیڑھ سال کی ہوگی۔ رونے لگی۔ شاید ماں کے چُپ کرانے پر بھی نہ چپ تھی۔ مجید نے میری طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ جاؤ اسے نیچے لے جاؤ۔ چُپ کرا کے لاؤ — آمینہ آپا نے ایک آم میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور نادرہ میرے کولھے پر چڑھا دی۔ میں نیچے چلا آیا۔ سب اوپر ہنستے باتیں کرتے رہے۔ میری خواہش دب گئی۔ لیکن نفرت کا طوفان بن کر ابھری۔ ایسا طوفان جس پر میں آج تک قابو نہیں پا سکا۔"

وہ باتیں کرتے کرتے پھر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ کہنیاں ٹکا کر اس نے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ ثوبیہ متاثر سی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے کتنی قابلِ رحم تھی آصف کی ذات۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ بچپن تو پھولوں کی مہکتی پھلواری ہوتا ہے۔ انہی پھولوں کی مہک تو زندگی کے ہر گام پر انسان کو تر و تازہ اور شگفتہ رکھتی ہے۔ لیکن آصف بیچارے کا بچپن سلگتی آگ تھا جس کی لپٹیں اب تک اسے جھلس رہی تھیں۔

"میں ایک ٹھنڈی آگ میں جل رہا تھا ثوبیہ —" آصف نے اسی طرح کھڑے کھڑے کہا۔ "یہ آگ تمہاری قربت سے اب اتنی اذیت دہ نہیں رہی۔ میں سوچتا ہوں اگر تم مجھے نہ ملتیں۔ تو میرا کیا حشر ہوتا۔"

ثوبیہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"ثوبیہ مجھے مجید سے نفرت ہے — عامر سے نفرت ہے ایسی نفرت جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔ تمہیں میں اپنا سمجھتا ہوں۔ اس لیے تم سے بھی یہی امید رکھتا ہوں جیسے سنا ہے مجید عامر کے لیے تمہاری خواہش رکھتا ہے۔ اس نفرت میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ بیان نہیں کر سکتا۔ میری توقع بے جا ہی — میری خواہش فضول ہی۔ لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں ثوبیہ میری طرح تم بھی مجید سے نفرت کرو۔ عامر سے نفرت کرو۔ ایسی نفرت جو ان دونوں کو بھسم کر ڈالے۔"

وہ جلدی سے پلٹا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ وہ بڑے عجیب طریق سے اسے جھنجھوڑ کر عامر اور مجید سے نفرت کرنے کا وعدہ لے رہا تھا۔

ثوبیہ ڈر گئی۔ کتنے طوفان مچل رہے تھے آصف کی آنکھوں میں — کبھی کبھی اس پر جنون کا ایسا دورہ آیا کرتا تھا۔

ثوبیہ نے سہم کر سر ہلا دیا۔ آصف کے چہرے پر تسکین و طمانیت کے آثار نظر

آنے لگے۔

"تم کتنی اچھی ہو ثوبیہ — کتنی اچھی —" وہ اپنے دونوں ہاتھ وفورِ جذبات سے مسلتے ہوئے بولا:

"تم نے اسی طرح مجھے سہارا تو شاید کسی وقت — میں اپنے ذہن میں جمی ہوئی اس نفرت کو کھرچ ہی ڈالوں۔ تم میرا سہارا بنی ہو گی۔ تو شاید یہ ناممکن بات بھی کسی وقت ممکن بن جائے —"

ثوبیہ مسکرا دی۔ پل بھر پہلے کا آصف اب بالکل بدل چکا تھا۔ وہی حسین حسین گہری گہری آنکھوں میں پیار کے امنڈتے جذبے — وہی خوبصورت چہرے پر شگفتہ سی مسکان۔

ثوبیہ بظاہر مسکرا رہی تھی لیکن دل ہی دل میں اس کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔ پل پل بدلتے موڈ کا بھی خیال آ رہا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ بھی اسے معلوم تھی۔ پھر بھی اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

— ۵ —

سے خواہ مخواہ نفرت کا غیر فطری فیصلہ ثوبیہ کو بے حد عجیب لگا۔ آصف مجید کی غیر متوازن شخصیت سے وہ بد دل سی ہو گئی۔ مجید رشتے کا سہی۔ آخر اس کا چچا تھا۔ وہ اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ اور جس خلوص، پیار اور محبت سے مجید ہمیشہ اس کے ساتھ پیش آتا تھا — ثوبیہ کے لیے اس کی حکم عدولی ممکن نہ تھی۔ نہ ہی یہ بات زیب دیتی تھی اور نہ ہی اس کی عادت و خصلت میں یہ بات داخل تھی۔ بلاوجہ نفرت کی بھی کوئی تک تھی بھلا۔

آصف کے اصرار کے سامنے اس دن اس نے ڈرتے ڈرتے سر تو جھکا دیا تھا۔ لیکن اس کے فیصلے پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں تھا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یوں اچانک اپنا رویہ تبدیل کر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن آصف کے دل میں جو خدشہ تھا۔ اس کے پیشِ نظر وہ اس معاملے میں ثوبیہ کے ساتھ سختی برتنے پر بھی اتر آیا۔

مجید ثوبیہ کو پیار سے بلاتا۔ آصف کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتیں۔ وہ اس سے کسی بات میں مشورہ لیتا۔ تو آصف کے تیور بدلنے لگتے۔ ان دنوں تو اسے ایک ہی دھن کھائے جا رہی تھی۔ اسی لیے وہ ثوبیہ کو مجید سے اپنا آپ دور دور رکھنے کی تلقین کرتا۔

اس کی تلقین ثوبیہ کو گراں گزرتی۔ اسے تو صرف وہ آصف اچھا لگتا تھا۔ جو اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ اس کا والہانہ شیدا تھا۔ اسے ویران تنہا [illegible]

عشق و محبت کے راگ سنایا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیے راوی کے ریتیلے کنار
پر اس کی محبت میں عشق و محبت کے راگ سنایا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیے را
کے ریتیلے کناروں پر اس کی محبت میں جذب و سرشار گھوما کرتا تھا۔ کبھی کبھی شیرا
پلانے لے جایا کرتا تھا۔ فلمیں دکھایا کرتا تھا۔

اس دن چھٹی تھی — ثوبیہ پچھلے صحن میں منیرہ کی چارپائی کے قریب ایک کر
بیٹھی تھی۔ منیرہ نے ساٹن کا ایک ٹکڑا نکال کر ثوبیہ کو ٹی کوزی بنانے کو دیا تھا۔ اس
ثوبیہ اس ٹی کوزی پر رنگ برنگے دھاگوں سے پھول بنا رہی تھی۔

کچھ فاصلے پر ان دونوں کی جانب کمر کیے آصف کرسی پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھ
انٹرویو کے لیے بلاوے کا انتظار تھا۔ کمیشن لینے کی سنجیدگی سے تیاری کر رہا تھا۔ ر
باقاعدگی سے اخبار دیکھنا معمول میں شامل ہو گیا تھا۔ ورنہ کہاں آصف اور کہاں اخب
کا اس باقاعدگی سے مطالعہ۔

منیرہ اور ثوبیہ باتیں بھی کر رہی تھیں۔ منیرہ کہہ رہی تھی۔ تمہارے چچا کو تو کڑھائی
کے پھول بے حد پسند ہیں۔ جب تک میری نظر کام کرتی تھی۔ میں تکیوں چادروں
پھول کاڑھا کرتی تھی۔ اب تو سوئی میں دھاگہ ہی نہیں ڈالا جاتا۔ اتنی اتنی چوڑی بیلیں
بنایا کرتی تھی۔ لٹھے کی چادروں پر —!" منیرہ نے اپنی بالشت دکھاتے ہوئے کہا
"آجکل تو ان کا رواج ہی نہیں رہا۔ میری امی کے پاس بھی دو تین پرانی چادریں
پڑی ہیں۔ ثوبیہ اتنی محبت۔"

"انگلیوں کی پوریں چھلنی ہو جاتی تھیں سوئی لگ لگ کر۔"

"آجکل تو یہ ہلکا پھلکا کام ہوتا ہے۔ دیکھیں خالہ جان کتنا نفیس دکھائی دیتا ہے
اس نے فریم میں لگا پھول منیرہ کو دکھایا۔

"واقعی۔" منیرہ نے داد کے طور پر کہا۔

ثوبیہ پھر انہماک سے پھول بنانے لگی۔ رنگوں کا حسین امتزاج اور پھول کی نازک
اوٹ۔ واقعی دلفریب نظر آ رہی تھی ٹی کوزی۔

شامتِ اعمال کہیں کمرے سے مجید بھی نکل کر ادھر ہی آ گیا۔

"کیا بنا رہی ہیں ہماری بٹیا۔" وہ چارپائی پر ثوبیہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

آصف نے اخبار نیچے کر کے کرون موڑ کر سب کی طرف دیکھا۔

"ٹی کوزی بنوائی ہے۔" منیرہ بولی۔ ثوبیہ تو آصف کے ڈر سے کچھ جواب ہی نہ دے سکی۔

"کیا خوبصورت کڑھائی ہے۔" مجید نے ثوبیہ کے ہاتھ سے فریم لے لیا۔ "واہ! ا
ہماری بیٹی تو ہر فن مولا ہے۔ کیوں منیرہ؟"

اور کیا۔" وہ چہکی۔

"ثوبیہ بیٹی۔" مجید نے کہا۔

"جی" — ثوبیہ آہستگی سے بولی۔

"ایک ایسا ہی پھول ہمارے تکیے پر بنا دو۔" مجید نے پھول پسندیدگی کی نظروں
سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ اچھا جی۔" اس نے حامی بھرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھ
رہا تھا۔ آصف گردن موڑے تیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بالکل ایسا بھی پھول ہو۔ دیکھو تو۔ یوں لگ رہا ہے۔ جیسے ابھی کسی نے شاخ سے
توڑ کر کپڑے پر سجا دیا ہو۔ ہاں تو میں کل ہی دکان سے کپڑا بھجوا دوں گا۔ بنا دو گی نا؟ مجید
نے فریم اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔

"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ آصف اب اخبار دیکھ رہا تھا۔

"لٹھے پر بنا دو گی۔ یا ریشمی کپڑا لاؤں؟" مجید نے پوچھا۔

"جو آپ کو پسند ہو۔" وہ بولی۔

"اچھا! میں کل دکان سے بھیج دوں گا۔ سفید ساٹن پر بنواؤں گا۔ کیوں منیرہ۔ اچھا لگے گا نا؟" مجید بولا۔

"سفید ساٹن پر تو خوب اٹھے گا۔" منیرہ نے جواب دیا۔

آصف بظاہر اخبار پر نظریں جمائے تھا لیکن اس کے کان ان کی گفت گو پر لگے تھے۔ ثوبیہ نے مجید کے تکیہ پر پھول بنانے کی حامی بھر لی تھی۔ گو اس نے آہستگی سے کہا تھا۔ لیکن آصف باتوں سے اس کی رضامندی جان گیا تھا۔ اس کے تیور بدلنے لگے۔

مجید اور منیرہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ثوبیہ خاموشی سے پھول بناتی رہی۔ ایک بار اس نے ذرا سا چہرہ گھما کر آصف کی طرف دیکھا تھا اسے اخبار دیکھنے میں محو پا کر وہ قدرے مطمئن ہو گئی۔

"آج کھیر ثوبیہ بنائے گی نا؟" مجید اٹھتے اٹھتے ہنس کر بولا۔

"ثوبیہ۔ آپ بھی خوب ہیں۔ ثوبیہ نے تو جیسے آپ کے ہر کام کا ٹھیکہ ہی لے لیا ہے۔"

"ہماری بیٹی جو ہوئی۔ اس کے ہاتھ کی کھیر میں جو لذت ہے۔ تمہاری بنائی ہوئی کھیر میں کبھی نہیں ہوئی۔"

"کیا کہنے ——؟" منیرہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "ساری عمر تو میرے ہاتھ کی کھاتے رہے۔ اب اس میں لذت ہی نہیں رہی۔ ثوبیہ ہی کے ہاتھ کی بنی کھایا کریں۔"

آصف جھنجھلا کر اٹھا۔ کرسی پلٹ کر گری۔ اسے اٹھائے بغیر اخبار پرے پھینک کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا صحن سے برآمدے کی طرف چلا گیا۔ مجید کی ہنسی اسے معنی خیز لگی تھی۔ ثوبیہ کو یہ جاننے میں دقت نہ ہوئی۔ کہ آج پھر مجید کے التفات سے وہ بھڑک گیا ہے۔

"ثوبیہ اپنے گھر چلی گئی۔ تو پھر کس کے ہاتھ کی بنی کھیر کھائیں گے؟" منیرہ نے مجید سے کہا۔

مجید نے اس بات کا اللہ جانے کیا جواب دیا۔ ثوبیہ کا دھیان آصف کی طرف تھا۔ دونوں کی باتوں میں دلچسپی لیے بغیر بیٹھی رہی۔ اس کے کڑھائی میں مشغول ہاتھوں کی رفتار

بھی سست پڑ گئی۔

مجید اٹھ کر اندر چلا گیا۔ منیرہ بھی نتھو کی ماں کو دوپہر کے کھانے میں مدد دینے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔ نتھو کی ماں کو اب اس نے اپنے ہاں کھانا پکانے کے لیے ملازم رکھ لیا تھا۔ اسے خاصی سہولت ہو گئی تھی۔

دونوں کے جاتے ہی ثوبیہ نے دھاگوں کی رنگ برنگی گچھیاں ٹی کوزی ہی میں لپیٹ دیں چھوٹی سی قینچی اٹھائی۔ اور دو تین چیزیں لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج اسے اپنے کپڑوں کا بکس بھی ٹھیک کرنا تھا۔ دو تین قمیضوں کی فلنگ بھی درست کرنا تھی۔ دو دوپٹے دھونا بھی تھے لیکن آصف کے یوں اٹھ کر چلے جانے سے اس کی طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔ کچھ بھی تو کرنے کو جی نہ چاہا۔ ٹی کوزی اور قینچی میز پر بے دلی سے پھینک کر وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ اسے آصف پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ یہ بھی کوئی بات تھی بھلا —— الٹا ہی مطالبہ تھا اس کا —— وہ جوں جوں اس پہلو پر سوچتی گئی۔ اسے آصف کی زیادتی پر غصہ آتا گیا۔ وہ روٹھ گیا ہے۔ تو وہ بھی اسے کبھی نہیں منائے گی؟ اس نے پکا عہد کر لیا۔ لیکن اس عہد پر کاربند رہنا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

آصف سارا دن گھر پر ہی رہا۔ منہ پھلائے۔ تیوری چڑھائے پھرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ شام چائے بھی نہیں پی۔ ثوبیہ کہاں تک دیکھے جاتی۔ رات منیرہ اور مجید آبلہ کے ہاں گئے۔ اسے موقع مل گیا۔ وہ اس کے کمرے میں گئی۔ اسے بہلایا پھسلایا۔ ہنس ہنس کر منایا۔ رو رو کر منایا۔ آخر آصف آخر مان ہی گیا۔

"ایک غلط مفروضے کو یوں حقیقت بنا کر آپ خواہ مخواہ زندگی تلخ بنا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے خالہ جان نے محض آپ کو اکسانے کے لیے یہ بات کہی ہو۔ خود ہی سوچیے اگر خالہ جان آپ کو ایسے نہ کہتیں۔ تو کیا آپ کسی اچھے روزگار کے لیے یوں دوڑ دھوپ کرتے ——؟ آپ کو کبھی کمیشن لینے کا خیال آتا ——؟ کبھی بھی نہیں؟

اس نے لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ اس کے دلائل سے آصف کچھ مرعوب سا ہو گیا مجید سے تعلقات خوش گوار ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ ہاں ثوبیہ کی باتوں سے ذہن پر چھایا ہوا خدشہ کسی حد تک کم ضرور ہو گیا۔ اور جب ثوبیہ زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ کر چکی تھی۔ تو یہ وہم فضول ہی تو تھا۔

یوں بھی ثوبیہ نے اس کے بعد پیار اور چاہت کا کچھ اتنا دلنواز مظاہرہ کیا کہ آصف اسی کی ذات میں کھو کر رہ گیا۔ اس لازوال پیار کے سامنے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہو کر رہ گئی۔ مجید کی ساری دولت اور عامر کی بیرونی یونیورسٹی کی انجینئرنگ کی ڈگری اس کے مقابل کچھ بھی نہ رہی۔

—— ❊ ——

کے بعد مختلف ٹیسٹوں میں کامیاب ہو کر آصف کمیشن کے انٹرویو لیے منتخب ہو گیا۔ تربیتی کورس کے لیے اسے کاکول جانا تھا اور جس دن اسے کاکول پہنچنے کا بلاوہ آیا۔ اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مستقبل کے گوشے گوشے میں مسرتوں کے چراغ جل اٹھے۔ تاریکیاں مٹ گئیں اور روشنیوں کے سنہرے غبارہ آنے والے حسین دور کی جگمگاہٹ دیکھ کر مسرور و شاداں ہو گیا۔

سب سے پہلے یہ خوش خبری اس نے عمران کو سنائی۔ وہ خوشی سے اس کے ساتھ لپٹ گیا۔

"مجھے پورا یقین تھا۔ کہ تم منتخب ہو جاؤ گے۔ عزم راسخ ہو تو انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"اب دعا کرو ٹریننگ کا عرصہ بھی بخیریت گزر جائے۔ سنا ہے ٹریننگ بڑی سخت ہوتی ہے۔ ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ہے۔"

زندگی بھی تو بن جاتی ہے نا میرے دوست۔ کاکس ون کوئی معمولی شے تو نہیں۔ کمیشنڈ آفیسر کو دیکھ کر ہی لوگوں کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ یوں رشتہ ملتا ہے، یوں ——! عمران نے چٹکی بجا کر کہا۔ آصف ہنسنے لگا۔

"اس رشتے کے چکر نے ہی تو یہ پاپڑ بیلنے پر مجبور کیا ورنہ کہاں خیال آیا تھا کبھی کمیشن لینے کا ——"

"چلو ایک پنتھ دو کاج۔ زندگی بھی بن گئی اور رشتہ بھی مرضی کا مل جائے گا۔"

"اب خیال آتا ہے۔ ایف ایس سی کے بعد ہی کمیشن کے لیے دوڑ دھوپ کر لیتا۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔ پرماننٹ کمیشن مل جاتی۔ اب تک کیپٹن بھی ہو چکا ہوتا۔"

"کمیشن مل جاتی۔ کیپٹن بن جاتے۔ لیکن یہ بات تو نہ ہوتی جو اب ہے۔"

"کیا بات ——؟"

"بھئی نوکری کے چکر میں جانے کس کس جگہ گھومتے پھرتے۔ ثوبیہ کے ساتھ یوں رہنے کا موقع تھوڑا ہی ملتا۔ اب تو عیش ہی عیش ہوئی۔" عمران نے ہنس کر کہا۔

آصف نے بھی ہنستے ہنستے ہاتھ میں پکڑا ہوا لمبا سا نافہ اس کے کندھے پر مارا۔ وہ کتنا مسرور تھا۔ اس کے انگ انگ سے جیسے خوشیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

"چائے یہیں پیو گے؟" عمران نے پوچھا۔ آصف اٹھ کر جانے کو تیار ہو رہا تھا۔

"نہیں مجھے گھر جا کر امی کو بھی تو یہ خوش خبری سنانا ہے۔" آصف بولا۔

اور ثوبیہ کو بھی۔ ہاں بھئی ضرور۔" ضرور سناؤ اسے خوش خبری۔" عمران نے شوخی سے کہا۔

"اس کے لیے یہ خوش خبری کہاں ——؟" آصف مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"کیوں ——؟" عمران حیران ہو کر بولا۔

"پگلی ——!" آصف کی گہری گہری حسین آنکھوں میں پیار کا سمندر چھلکنے لگا۔ اسے تو ذرہ بھر خوشی نہیں۔ اسے تو پریشانی ہی پریشانی ہے۔"

"وہ کیوں ——؟" عمران جھلا کر بولا۔ کھل کر بات کرو!"

آصف نے اس کی طرف دیکھا۔ محجوب تبسم سے بولا۔ میرے چلے جانے کا غم ہے اسے ——"

"اوہو —— اعمران خوش دلی سے ہنسا۔" تو معاملہ واقعی سنجیدہ ہے۔!"

"تو اور کیا کھیل ہے ——؟" آصف نے اسے ٹھوکا دیا۔

دونوں باتیں کرتے کرتے باہر نکل آئے۔ شانو اور امی دونوں گھر پر نہیں تھیں ان سے پھر ملنے آنے کا وعدہ کر کے آصف عمران سے رخصت ہو کر گھر کی جانب چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے امی کو خوش خبری سنائی۔ ماں کی آنکھوں میں فرط مسرت سے آنسو آ گئے۔ کتنا ارمان تھا اسے آصف کو کامیاب و کامران دیکھنے کا۔ کتنی حسرت تھی اسے زندگی میں باوقار منصب پر دیکھنے کی۔ دیر سہی لیکن خدا نے اس کی سن لی تھی۔ بیٹے کو سینے سے لگا کر اس نے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہیئے" والی بات تھی۔ آصف بھولے بھٹکنے کے باوجود کمیشنڈ افسر بن جائے گا۔ ماں کے لیے یہ خیال مسحور کن تھا۔

شام ثوبیہ کو بھی اس نے یہ نوید سنائی۔ حسب سابق وہ بجھ سی گئی۔ اور جب آصف نے اسے بتایا۔ کہ اس ہفتے وہ کاکول چلا جائے گا تو بے اختیار اس کی آنکھیں جھلملا گئیں اس نے آنسو چھپانے کو منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن جھلملاتی آنکھیں آصف نے دیکھ ہی لیں۔

"پگلی۔" اس نے اس کا چہرہ زبردستی اپنی طرف کر لیا۔ ثوبیہ نے دوپٹے میں اپنا منہ چھپا لیا۔

"ثوبی۔ پاگل نہ بنو۔" آصف نے بمشکل اس کے دونوں ہاتھ ہٹائے۔

ثوبیہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ جیسے برستے بادلوں میں دھوپ چمک رہی ہو۔

تیاری کا وقفہ مختصر تھا۔ آصف دوڑ دھوپ کر کے اپنی مطلوبہ چیزیں جمع کرنے لگا۔ ماں نے بستر نکال کر دیا۔ اور بھی جس جس چیز کی ضرورت تھی منگوا کر دی۔ وہ زندگی میں پہلی بار جدا ہو رہا تھا۔ اکھڑ، وحشی اور جنگلی بن کر ہمیشہ ماں کو تنگ کیا کرتا تھا۔

لیکن اب اس کے چلے جانے کے خیال سے وہ بھی مغموم تھی۔

آصف کو کمیشن کی خوشی سے زیادہ اس اہمیت سے خوشی ہو رہی تھی۔ جو ان دنوں اس کی ذات کو احتی سے مل رہی تھی۔ سکون اور اطمینان سے وہ سرشار سا نظر آتا تھا۔ زندگی میں یہ وقت بھی آسکتا ہے۔ اس کا کبھی اسے خیال بھی نہ آیا تھا۔

تیاری مکمل ہو گئی۔ جانے کا دن آپہنچا۔

صبح نو بجے کی ٹرین سے اسے روانہ ہونا تھا۔ اب تک وہ ثوبیہ کو سہانی تسلیاں دیتا رہا تھا۔ اپنی کامیابی کی خوشی جدائی کے جذبوں پر مسلط رکھی تھی۔ لیکن آج رات آخری رات وہ بھی پژمردہ اور مضمحل ہو گیا۔

رات تیزی سے بیت رہی تھی۔ ثوبیہ اس کے کندھے سے لگی سسک رہی تھی۔ اس کا دل کٹا جا رہا تھا۔ بچھڑنا واقعی کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب تک وہ ثوبیہ کو تسلیاں نہیں فریب دیئے جا رہا تھا۔

پچھلی رات کا آدھا چاند گھنے درخت کے پیچھے سے طلوع ہو کر اوپر آگیا تھا۔ پھیکی پھیکی چاندنی اور گہرے گہرے اندھیرے آپس میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ آج چاندنی میں بھی تکھا نہیں تھا۔ آج اندھیروں میں بھی حسن نہیں تھا۔ ساری فضا سوگوار سی نظر آرہی تھی۔ اسی بالکنی میں آصف اور ثوبیہ کی جوان قربتوں نے چاندنی کا نکھرتا حسن دیکھا تھا۔ پُراسرار اندھیروں کی دلکشی جانچی تھی۔ فضاؤں کے مترنم گیت سنے تھے۔

لیکن آج سب کچھ بدلا بدلا نظر آرہا تھا۔ دونوں جدائی کے جان گسل احساس سے کچھلے کچھلے بالکنی میں اترنے والی لمبی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ بالکنی کے کھلے دروں سے نیند میں ڈوبی بستی نظر آرہی تھی۔ دور سڑک پر نیند سے بوجھل آنکھ کی طرح مندتی بتیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاموشی زبان بن گئی تھی۔ کانپتے احساس جذبات کے ترجمان تھے۔

سامنے والی کوٹھی کا محافظ کتا کسی متوقع خدشے سے مغلوب ہو کر زور زور سے بھونکنے

لگا۔ مسلسل بھونکنے سے گھر کا مالک جاگ اٹھا۔ صحن کی بتی کی لرزاں روشنی بالکنی پر پڑی۔

آصف اور ثوبیہ چونک کر جیسے خواب غفلت سے بیدار ہو گئے۔ آصف نے بازو روشنی کی زد میں لا کر گھڑی دیکھی۔

"جانتی ہو ثوبیہ کیا بجا ہے؟" اس نے اپنے گھٹنے پر جھکی ثوبیہ سے قدرے جھک کر کہا۔

ثوبیہ وقت کے احساس سے بیزار سی نظر آئی۔

"دو بج گئے۔ چلو اٹھو۔ کافی رات گزر گئی۔" اس نے ملامت سے ثوبیہ کا ہاتھ پکڑا۔

"آصف ——؟" اس نے اپنی بھیگی آنکھیں آصف کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"پگلی۔" وہ درویلی ہنسی ہنسا۔ "یوں تو وقت گزرنے سے رہا۔ کچھ ہمت سے کام لو —— نرماہ کا تو کورس ہے۔"

"کتنا لمبا عرصہ ہے آصف۔ کون جانے کیا ہو جائے!" وہ بے چین ہو کر بولی۔

"مایوس نہ ہو ثوبیہ۔ یہ عرصہ بے شک طویل ہے۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ اس طویل عرصے کی طوالت ہماری محبت کو اور مضبوط اور مستحکم کر دے گی اور پھر اس عرصے میں جانے میں کتنے پاپڑ لاہور کے لگاؤں گا۔"

"اس سے کیا ہو گا۔"

"کیوں ——؟"

"میں یہاں تھوڑا ہی ہوؤں گی۔"

"تو —— تو —— کہاں ہو گی تم ——؟"

"ابو کی ٹرانسفر ہونے ہی والی ہے آصف —— وہ یہاں آگئے تو ظاہر ہے —— میں چلی جاؤں گی ——"

"تو کیا ہوا —— رہو گی تو لاہور ہی میں —— میں تمہیں ملنے ——"

"آصف!" وہ بے چارگی سے ہنسی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بھیگ رہی تھیں ——

"آپ کتنے بھولے ہیں۔"

"کیوں؟"

"میں اپنے گھر چلی گئی۔ تو پھر ملنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوگا؟ میرے امی ابو آپ نہیں جانتے انہیں۔ اور پھر ——"

"پھر ——؟"

دونوں چپ ہو گئے۔ ثوبیہ کی بات درست تھی —— ملنے ملانے کا سلسلہ تو ختم ہی ہونا تھا۔ ماں باپ کے پاس رہتے ہوئے ثوبیہ اتنی بڑی جرأت کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی —— غم تو اسے یہی تھا۔ آصف بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

اور جب آصف نے دھیمی اور ٹوٹتی آواز میں پوچھا "خط لکھا کرو گی ——؟"

تو ثوبیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "ایسا ممکن نہیں آصف —— میرے والدین کو علم ہو گیا تو مجھے شوٹ کر دیں گے۔"

"سچ ——؟" آصف نے چونک کر کہا۔ "خط بھی نہیں لکھو گی؟"

"اور رونا کس بات کا ہے آصف۔" وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر خاموش ہو گئی۔

آصف کچھ دیر خاموش رہا۔ سوچ میں ڈوبا اس کی پشت پر ملامت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔

ثوبیہ سسک رہی تھی۔ شاید اسے تسلی دینے کو اسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

کئی جان گسل لمحے گزر گئے۔ پھر آصف نے ثوبیہ کا چہرہ اونچا کیا۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں اس کا بھیگا بھیگا چہرہ ویران سا نظر آ رہا تھا۔

"ثوبیہ ——!" آصف نے اداس لیکن مضبوط آواز میں کہا "وقت کے فاصلے! دیرپا کی سہی —— لیکن یقین محکم انہیں پاٹ کے رکھ دے گا —— یہ جدائی عارضی ہے۔ اور ہمارے ابدی ملاپ کی مسرت کے سامنے یہ اذیت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی —— ہم وقت کا انتظار کریں گے ثوبیہ۔ اس وقت کا جب ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔

ایک سال نکلے یا دس سال۔ ہمارا انتظار وہم نہیں توڑے گا۔"

ثوبیہ نے لجا کر سر جھکا لیا۔ آصف کی سنجیدگی کچھ اور سنگین ہو گئی۔ کافی دیر وہیں بیٹھے رہنے کے بعد آصف اٹھا۔ ثوبیہ کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اٹھایا۔ رات کافی گزر گئی تھی۔ صبح اسے سفر پہ جانا تھا۔ نیند تو خیر کیسے آنا تھی۔ پھر بھی کچھ دیر آرام کرنا ضروری تھا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ڈوبتے دل کو سہارا دے کر اس نے ثوبیہ کو خدا حافظ کہا۔

آصف بے تاب ہو کر ثوبیہ اس کی طرف بڑھی۔

اور آصف نے پہلی بار شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر والہانہ اسے سینے سے لگایا۔

آنکھوں میں عقیدت کی نمی اور ہونٹوں پہ محبت کی گرمی لیے وہ جھکا۔

اور

اپنے لب ثوبیہ کے بالوں پر رکھ دیے۔

—— ❁ ——

اور اداس راتوں کی کوکھ سے بے کیف اور بے نور صبحوں نے جنم

بے چینی

لیا۔ اک اک لمحہ مچلا ہوا اضطراب بن گیا۔ آصف کیا گیا — رونقِ حیات گئی۔ ثوبیہ کی ہنستی مسکراتی الھڑ سی دنیا ویران ہو کر رہ گئی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا۔ بات بات پر رونے کو دل چاہتا۔

دل و دماغ پر آصف ہی آصف چھایا تھا۔ اس کی باہنوں کا لمس، اس کی باتوں کی ملائمت اس کے سانسوں کی گرمی تصور کے لہراتے آنچلوں پر منعکس ہوتی رہتی۔ دل میں ایک درد بس گیا تھا۔ اس درد کی لذت و کسک ہی زندگی بن گئی۔ اس گھر میں اب اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ ماں، بہنوں، باپ اور بھائیوں کی یاد کبھی اس شدت سے نہ آئی تھی۔ اب تو اس کا جی چاہتا پر لگا کر اڑ جائے۔ اپنے گھر پہنچ جائے۔ جہاں کی کہا گہی میں وہ آصف کی یادوں کی صدائیں گم کر دے۔

ثوبیہ نے اپنا سارا دھیان پڑھائی کی طرف لگا دیا۔ لیکن ہر لفظ آصف بن کر ابھرا۔ کتاب سامنے رکھے بیٹھی رہتی۔ نہ کچھ سمجھ میں آتا۔ نہ پڑھ سکتی۔ سٹ پٹا کر کتاب پھینک دیتی اور بستر میں گھس کر کسی پیتے ہوئے سہانے لمحوں کی یاد میں آنکھیں بند کیے سوچتی رہتی۔

دن گزرتے گئے۔ یادوں کا انبار چھٹنے لگا۔ وقت پہلے ہی کافی ضائع ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ پوری تندہی سے امتحان کی تیاری کرنے لگی۔ آصف کی یاد ستاتی ضرور۔ لیکن طوفانی دور گزر چکا تھا۔

یوں بھی وقت جذبات کی طغیانی کو غیر محسوس طریق سے اعتدال پر لے آتا ہے۔ وقت میں کرشمہ سازی کی یہ قوت نہ ہوتی تو دنیا محشرستان بنی ہوتی۔ ہر سینہ فگار ہوتا ہر دل شکستہ انسان ناکامیوں کے گلے لپٹ کر روتے ہی عمر گزار دیتا۔ یہ وقت ہی کا کمال ہے۔ کہ انسان غم، مصیبت اور پریشانی کا بڑے سے بڑا وار سہہ کر بھی راہِ زندگی پر گامزن رہتا ہے۔ غم کی آغوش سے خوشیوں کے سوتے نکال لیتا ہے۔

ثوبیہ بھی انسان تھی — ایک جذباتی سی لڑکی۔ ایک نوجوان کی قربت میں پیار پگھلا اور چاہت کے جذبے جاگ اٹھے تھے۔ یہ ایک جذباتی طوفان تھا جس کی محرک آصف کی ذات تھی۔ آصف چلا گیا۔ تحریک نہ رہی۔ طوفان آہستہ آہستہ کناروں میں بہنے لگا۔

منیرہ گھر میں تھی۔ ثوبیہ کے اس جذباتی طوفان کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر رہی تھی چڑھاؤ بھی دیکھا تھا۔ اب اُتار بھی دیکھ رہی تھی۔ دو ماہ کے اندر کافی تغیر آ چکا تھا۔ وہ جانتی تھی وقت ابھی اور اپنے کرشمے دکھائے گا اور یہ یک جائی کی محبت اپنی موت آپ مر جائیگی آصف کے متعلق وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ لیکن زمانے کے رنگ دیکھے تھے۔ یہی حال آصف کا بھی ہوگا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ بھول جائے گا۔

ان دنوں اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ ورنہ جب سے اسے آصف اور ثوبیہ کی محبت کا علم ہوا تھا۔ اس کا سانس الجھا ہی رہتا تھا۔ اب وہ مطمئن ہو گئی تھی مستقبل کے متعلق اس نے سنجیدگی سے سوچا تھا نہ سوچنے کی ضرورت سمجھی تھی۔ وقتی سانحہ تھا جو گزر چکا تھا۔ وہ تو اس بات سے خوش تھی۔ کہ اس کا علم کسی اور کو نہیں ہوا۔ عزت رہ گئی۔ یہی کیا کم تھا۔

ثوبیہ امتحان کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ کہ اس کے ابو لاہور تبدیل ہو کر آ گئے ترقی بھی ہو گئی تھی۔ اس لیے اہلِ خانہ کے لیے دوہری خوشیاں تھیں۔ بڑا سا بنگلہ بھی مل گیا۔ ثوبیہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔

منیرہ اور مجید کو گھر سُونا لگنے لگا۔ آصف اور ثوبیہ دونوں کے چلے جانے سے واقعی بے رونقی سی ہو گئی تھی۔ منیرہ کبھی آمینہ کی بیٹی کو بلا بھیجتی۔ کبھی ثمینہ کو۔ لیکن کون گھر چھوڑ کر ان کے ہاں ہمیشہ کے لیے آن رہتا۔

"بہو کا وجود ضروری ہو گیا ہے بیگم!" — اس دن مجید نے ہنس کر منیرہ سے کہا۔

"بیٹے کسی قابل تو ہو جائیں۔" منیرہ نے جواب دیا۔ "پیشگی بہو تو آنے سے رہی۔"

"آئی تو تھی۔ تم نے خواہ مخواہ واپس بھیج دی۔ مجید نے مذاق سے کہا۔

"لو اور سنو۔ آپ خواہ مخواہ منہ سے بات نہ نکالیں جس وقت آئے گا دیکھیں گے۔"

"بھئی میں کون سا کسی سے کہہ رہا ہوں۔ تم سے ہی تو کہا ہے صرف۔ ویسے لڑکی بڑی اچھی ہے۔ مجھے بے حد پسند ہے۔"

"اچھی بُری کا تو سوال ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں وقت سے پہلے کوئی بات منہ سے نکلان نہیں چاہیئے۔ اللہ جانے حالات کیا سے کیا ہوں۔ بات منہ سے نکلی پرائی ہوئی۔"

"اچھا اچھا تمہارا خیال ہے عامر میاں کہیں میم ویم ساتھ نہ لے آئیں؟" وہ بڑے فخر سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" منیرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اپنا بیٹا ایسا نہیں منیرہ۔ دیکھ لینا۔ جیسا گیا ویسا ہی واپس آئے گا۔ اس کی شرافت پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔"

"میں کب کہتی ہوں۔ اس کی شرافت پر بھروسہ نہ کریں لیکن اس کی پسند کا آپ کیا کہہ سکتے ہیں۔ ثوبیہ اچھی لڑکی ہے۔ آپ کو پسند ہے۔ کیا خبر اسے پسند نہ آئے۔"

"لو اور دیکھو — ایسی پیاری بچی ہے۔ خصلت بھی اچھی۔ آمینہ ثمینہ تو مفتوں ہیں۔ چراغ لے کر ڈھونڈھیں تو ایسی لڑکی نہ ملے۔ وہ تو عامر کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ ان کا بس تو ابھی سے رشتہ طے کر دیں۔"

"دیکھا نا — میں نہ کہتی تھی۔ بات منہ سے نکلی پرائی ہوئی۔ آمینہ ثمینہ تک بھی بات پہنچ چکی ہے۔ ان کی سسرال میں بھی ذکر ہو گیا ہو گا۔ توبہ خدایا۔ کل کو بات نہ بنی تو کیا۔!"

بات سوچنے کی تھی۔ مجید بھی سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن حسبِ عادت بات ہنسی میں اڑا دی۔

منیرہ کو ثوبیہ پسند تھی۔ اور جب تک اسے آصف اور ثوبیہ کے معاشقے کا علم نہ ہوا تھا۔ اکثر دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی تھی۔ کہ کاش! آصف کسی قابل ہوتا۔ تو وہ ثوبیہ کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیتی۔

لیکن جب اس نے گھر میں کھیلی جانے والی رنگین آنکھ مچولی دیکھی تو اس کے دل میں ثوبیہ کی وہ وقعت اور عزت نہ رہی جو پہلے تھی۔ اب تو عام قسم کی چھچھوری اور نڈر سی لڑکی نظر آتی۔ اس لیے جب مجید نے عامر کے لیے اس کا ذکر کیا۔ تو اس نے ایک بار بھی آصف کا نام نہ لیا۔ اشارۃً بھی مجید کو نہ جتلایا۔ کہ ثوبیہ میں آصف بھی دلچسپی لیتا ہے۔ اس نے آصف کا رشتہ ثوبیہ سے کرنا تھوڑا ہی تھا۔ اس کے ذہن تو اب کچھ اور ہی خیال جاگزین ہو گیا تھا۔ جب سے صدرالدین کے فالج گرا تھا۔ اسے اس کی پانچ جوان اور بن بیاہی بیٹیوں کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ بڑی دونوں کی تو خیر عمر زیادہ تھی۔ منجھلی شکل صورت کی بھی پیاری تھی۔ عمر کے لحاظ سے بھی موزوں تھی۔ معذور بھائی کا دکھ درد بانٹ لینا اک درد مند بہن کا فرض تھا۔ یوں بھی ان لڑکیوں کو ابھی زمانے کی ہوا نہ لگی تھی۔ سیدھی سادھی بھولی بھالی لڑکیاں تھیں۔ نڈر تھیں نہ بے باک خدمت گزار اور سلیقہ شعار بچیاں تھیں۔ صدرالدین کی مالی حالت کبھی اچھی نہ رہی تھی۔ گیارہ بچوں کا بوجھ اٹھاتے ہی عمر بیت گئی تھی۔ اب تین لڑکے کمانے کے لائق ہوئے تو خود فالج نے آلیا۔ لڑکوں کی تو اسے فکر نہ تھی۔ جوان بیٹیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔

اور جب سے منیرہ نے بھائی کی بیماری میں زیادہ آنا جانا شروع کیا تھا۔ بچیوں کی مظلومیت معصومیت سے کچھ زیادہ ہی دل دکھنے لگا تھا۔ اپنے ملنے ملانے والوں سے اس نے بڑی دونوں لڑکیوں کے رشتے کے بارے میں کہہ دیا تھا۔ اور تیسری فوزیہ۔ اس نے دل ہی دل میں اسے آصف کی دلہن بنانے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔

کا دھارا بہتا رہا۔ اور اپنے بہاؤ میں آنے والی ہر شے کو بہا تا لے گیا۔ ثوبیہ

وقت اپنے گھر آکر پہلے پہل بڑی اداس اداس رہی۔ اپنا گھر اجنبی سا لگا بہن بھائیوں کی چھیڑ چھاڑ سے چڑ گئی۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بستر میں اوندھے منہ پڑی رہتیں کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا نہ کسی کام کرنے کو۔ آصف ہی کا تصور اسے تسکین دیتا۔ اس کی باتیں یاد کر کے پہروں دل بہلاتی رہتی۔ کالج بھی جانا بند ہو گیا۔ بیکار پڑے وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ ہر پھر کر خیال آصف ہی کی طرف کھنچ جاتا۔

"ثوبیہ بیٹی! ذرا بہن کی قمیض تو سی دو۔"

"ثوبیہ ذرا باورچی خانے میں جانا۔ گوشت زیادہ نہ گل جائے۔"

"ثوبیہ بیٹی! ذرا میرے کپڑوں پر استری تو پھیر دو۔"

ماں وقتاً فوقتاً کام کہتی رہتی۔ ثوبیہ اچھا امی کہہ تو دیتی لیکن کبھی کام کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اسے یاد ہی نہ رہتا۔ کہ ماں نے کوئی کام کہا ہے۔ یادوں میں آصف بسا تھا۔ اور کچھ یاد بھی کیسے رہتا۔"

امی چند یوم تو اس کا منہ دیکھتی رہیں۔ آخر ایک دن پوچھ ہی بیٹھیں ــــ "تمہیں کیا ہو گیا ہے ثوبیہ ــــ؟ بیگانوں کی طرح گھر میں رہتی ہو۔ مجید بھائی کا تو منہ تعریفیں کرتے نہیں تھکتا۔ اتنے کام کرتی ہے ثوبیہ اتنے کام۔ اور تمہارا یہ حال ہے کہ ہاتھ ہلانا ہی نہیں آتا۔"

ثوبیہ مسکرا کر ماں کا منہ دیکھنے لگی۔ "مجید چچا کوئی خواہ مخواہ تعریفیں تھوڑا ہی کرتے

ہیں۔ میں ان کے یہاں خوب کام کیا کرتی تھی۔"

"اب کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں امی!"

"سارا دن بیکار پڑے اور بیٹھے تمہارا جی بھی نہیں اکتاتا۔ سوچوں میں ہی ڈوبی رہتی ہو۔"

"امتحانوں کی تھکن اتار رہی ہوں امی ــــ سوچ کس بات کی۔"

"کیا خوب یہ اچھا طریقہ ہے تھکن اتارنے کا۔"

وہ جواباً مسکرا دی۔ ماں اپنے کام میں لگ گئی۔ ثوبیہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ امی کی باز پرس سے وہ کچھ سہم سی گئی تھی۔ اپنے دل میں چور رکھتا۔ ورنہ ماں جنے تو سرسری سی بات کی تھی۔ کسی شک کسی شبہے کا اظہار تو نہیں کیا تھا۔

اس دن سے ثوبیہ کچھ محتاط ہو گئی۔ گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی بہن بھائیوں کے مشاغل میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ دھیان بٹنے لگا۔ دل کی کسک اتنی اذیت دہ نہ رہی۔ آصف کا خیال اب بھی آتا تھا۔ لیکن اس خیال میں اب وہ تندہی نہ رہی۔ رات سونے سے قبل وہ ضرور اس کی یاد میں کھو جاتی۔ لیکن دن کا بیشتر حصہ اب اس نے مشغولیت کی نذر کر دیا۔

یوں بھی وقت کے فاصلے یادوں پہ دھول کی تہیں جمانے کو کافی تھے۔ اس پر ہمہ وقت مصروفیت۔ دن گزرتے گئے۔ یادوں کے چہرے دھندلاتے گئے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں مری جانے کا پروگرام بن گیا۔ ثوبیہ کے ابو نے بھی پندرہ دن کی چھٹی لے لی۔ کارٹ روڈ پہ ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا گیا۔ خوب گہما گہمی رہی۔ مری کا حسین موسم، چہل پہل اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگ، رنگا رنگی مخلوق ثوبیہ کا دل خوب بہلا۔ شام وہ اپنی بہنوں اور چھوٹے بھائی کو لے کر سیر کے لیے نکل پڑتی ــــ کبھی سینما کا پروگرام بن جاتا۔

کبھی ہوٹل میں چائے کا اور کبھی مال پر گھومنے کا۔

خوب ہنسی خوشی وقت گزر جاتا — پیدل چلنے سے خوب تھکن ہوتی۔ رات کھانا کھاتے ہی وہ بستر میں گھس جاتی۔ سارے دن کی تھکن ہوتی۔ بستر میں پڑتے ہی آنکھیں منانے لگتیں۔ کسی خیال کے نیند پر قابض ہونے سے پہلے ہی وہ سو جاتی۔ ویسے بھی وقت بڑا مصروفیت میں گزرنے لگا تھا۔ ساتھ والے فلیٹ میں کراچی سے آئی ہوئی دو لڑکیاں دوست بن گئی تھیں۔ اوپر کے فلیٹ میں رہنے والی پٹھان لڑکی سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ سب کام کاج سے فارغ ہو کر اکٹھی مل جاتیں — اپنے اپنے ولیس کی باتیں کرتیں لچھے قصے ہوتے وقت گزرتے پتہ بھی نہ چلتا۔

دو ماہ کی چھٹیاں سردی میں گزار کر وہ واپس آئی — تو آصف کی یاد کافی حد تک مٹ چکی تھی۔ اب نہ سونے سے پہلے وہ گھنٹوں اس کے تصور میں کھوئی رہتی۔ نہ دن کو بستر میں اوندھے منہ پڑی رہتی۔

ہاں جس دن منیرہ یا آمینہ اور ثمینہ آجاتیں — تو اس کے ذہن میں کئی یادیں کلبلانے لگتیں — بے اختیار اس کا جی چاہتا وقت پیچھے کو لوٹ جائے۔ وہی شب و روز پھر جسم لے لیں جو ماضی کے بند سینے میں دفن ہو چکے ہیں۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا گیا۔ دھول کی تہہ دبیز ہوتی گئی۔ ثوبیہ نے تھرڈ ائیر میں داخلہ لے لیا۔ کالج جانے لگی — گھریلو مصروفیتیں ختم ہوئیں۔ باہر کی شروع ہو گئیں — پڑھائی کا چکر پھر سے شروع ہو گیا۔ کالج سے واپسی پر گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے اکثر آصف کا خیال آجاتا۔ فٹ پاتھ پر نگاہیں چند ثانیوں کے لیے ضرور پڑتیں لیکن یہ خیال لمحاتی ہوتا۔ رکھشے میں بیٹھتے ہی اس کے خیالات کسی اور جانب مڑ چکے ہوتے۔

دھیان بٹتا گیا۔ یادیں دھندلاتی گئیں۔ انہی دنوں پچھلی گلی میں رہنے والی

۱۵ سال لڑکی اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ ایک طوفان اٹھا۔ اس طوفان سے ثوبیہ کی امی سب سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ جب سے انہوں نے یہ روح فرسا واقعہ سنا تھا۔ دل ہول کھانے لگا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے توبہ توبہ کرتیں — "اللہ تعالیٰ ایسی بیٹیوں کو موت دے دے جو ماں، باپ اور خاندان کی عزت سے یوں کھیلتی ہیں۔ پیدا ہوتے ہی رجائیں تو اچھا ہے۔ خداوند تعالیٰ میری آل اولاد کو بچائے۔ عزت پردہ ہی رکھے۔"

سیدھی سادی عورت تھی۔ ضروریات سے زیادہ ہی اثر لیا تھا۔ ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن اس نے تو جیسے یہ واقعہ ذہن سے چپکا ہی لیا تھا۔ دن میں کئی بار اس کا ذکر کر کے ایسی لڑکیوں کو کوستی۔

ثوبیہ جب بھی ماں کی زبانی ایسے کلمات سنتی تو اس کی حالت عجیب سی ہو جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے ماں اس بھاگنے والی لڑکی کو نہیں، خود اسے کوس رہی ہے۔ ضمیر بے طرح ملامت کرنے لگتا۔ اس لڑکی کا موازنہ اپنی ذات سے کرتی — دونوں ایک ہی صف میں کھڑی تھیں۔ اس لڑکی کا قدم آگے اٹھ گیا تھا۔ راستہ تو اس کا بھی وہی تھا۔ اس کی روح لرز اٹھتی۔ کس خطرناک روش پر چل رہی تھی وہ —

اس واقعے نے اس پر اتنا اثر کیا۔ کہ اسے اپنے آپ سے کراہت سی محسوس ہونے لگی — ماضی کا چہرہ بھیانک سا نظر آنے لگا۔ آصف سے وابستگی مٹ گئی۔ اس کے خیال کے ساتھ ہی خوف کی کپکپی حواس پر چھانے لگی۔ پشیمانی اور ندامت نے کسک و اذیت کی جگہ لے لی۔

اس دن منیرہ اس کی بہن کی عیادت کے لیے آئی۔ خلافِ معمول آدھ گھنٹے بعد ہی واپس جانے کے لیے اٹھ بیٹھی۔

"ابھی سے خالہ جان —!" ثوبیہ نے کہا۔ ثوبیہ کی امی نے بھی روکا۔

"آصف آیا ہے۔ اس کے لیے جا رہی ہوں۔ اچھی طرح ملی بھی نہیں۔ ابھی

منیرہ نے خاص طور پر اس کی طرف دیکھا۔ ثوبیہ کے ماتھے پر گھبراہٹ سے پسینہ آگیا۔ لیکن چند ثانیوں میں ندامت کی جگہ بیزاری نے لے لی۔

"کہاں ہوتا ہے آج آصف؟" اس کی امی نے پوچھا۔

"کاکول۔ ٹریننگ لے رہا ہے!" منیرہ بولی۔

ثوبیہ نے چہرے کے تاثرات سے یوں ظاہر کیا۔ جیسے اس کے ذکر سے اسے گھن آرہی ہو۔ منیرہ قدرے حیران بھی ہوئی۔

کب کمیشن ملے گی؟" ثوبیہ کی امی نے پوچھا۔

لیکن منیرہ کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

آصف سے اب وہ کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔ اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ قطعی اور آخری تھا۔

اس رات وہ چپکے چپکے کتنی ہی دیر روتی رہی۔ اپنے فیصلے سے تکلیف پہنچی تھی۔ یا پچھلے گناہوں کی سیاہی کو دھونا مقصود تھا۔ جو کچھ بھی تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

برق و باد

ثوبیہ اپنے بستر میں لیٹی تو اسے سردیوں کی اس طوفانی رات کی ایسی ہی وہ رات یاد آگئی۔ جب وہ منیرہ کے ہاں رہتی تھی۔ کتنی طوفانی بارش تھی۔ بجلی لہرا لہرا کر شیشوں کی راہ کمرے میں آرہی تھی۔ گرج سے دل ہلا جاتا تھا۔ ہواؤں کے شور سے بند دروازوں کے کھڑکیاں کواڑ بھی بج رہے تھے۔ شاید بارہ کا عمل تھا۔ منیرہ اور مجید خواب غفلت کے مزے لے رہے تھے۔ وہ اپنے بستر سے نکلی تھی۔ چوروں کی طرح دبے قدم رکھتے کوریڈور سے چوبی زینے تک آئی تھی۔ اسے سردی کا خیال تھا۔ نہ موسم کی ہیبت ــــ ننگے پاؤں چوبی زینہ عبور کر کے اوپر پہنچی تھی۔ صحن بھاگ کر عبور کرنے کے باوجود اس کی شال بھیگ گئی تھی۔ وہ سیدھی آصف کے کمرے میں پہنچی تھی۔

آصف اس کے انتظار ہی میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپک کر آیا تھا اور بڑی ہی بے تکلفی سے اس کی بھیگی شال پھینک دی تھی پھر سہارا دے کر اپنے پلنگ تک لے گیا تھا۔ وہ سردی سے کپکپا رہی تھی۔ آصف نے اسے بستر میں زبردستی لٹا کر رضائی سے لپیٹ دیا تھا۔

کتنی دیر وہ اس کے بستر میں بیٹھی رہی تھی۔ اس کے کتنا قریب آصف اس پر جھکا بیٹھا محبت بھری باتیں کر رہا تھا۔ جذبات کے کتنے طوفان اٹھے تھے ــــ وہ کس کس طرح نڈھال ہو گئی تھی۔ وہ تو آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی تھی۔ ذرا سی لغزش کتنی قیامت خیز تباہی لا سکتی تھی۔

"اُف توبہ! آثو یہ سرتا پا لرز گئی۔

اس نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے ــــ اپنی اس جرأت کا خیال کر کے سردی کے باوجود پسینے میں نہا سی گئی۔ اگر امّی کو پتہ چل جائے تو ــــ ابّو کو معلوم ہو جائے تو۔ تو ــــ! ــــ تو ــــ! ــــ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ رضائی کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر اس نے دھیان کسی دوسری طرف ہٹانے کی کوشش کی۔

لیکن خیالات کا تلازم اسے ماضی کے گزرے لمحوں کی یاد دلا لے گیا۔ گھنٹوں آصف کے ساتھ تنہائیوں میں گھومتے پھرتے رہنا کسی ڈرامے کے خواب کی طرح لگا۔ اپنے ندامت اور بے باکی کے خیال سے ہی اس پر ندامت کا دورہ پڑا۔ امّی ابّو کا خوف مسلسل اعصاب پر طاری رہا۔

پھر اسے رات کے ایک ایک بجے تک جاگ کر آصف کا انتظار کرنے کا خیال آیا۔ دروازہ کھولنے کے لیے پڑھائی کا بہانہ بنانے کے خیال پر تو وہ اپنی نظروں میں آپ ہی گر گئی۔ اپنی مکاری اور اس صفائی سے جھوٹ بولنے پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔

یکے بعد دیگرے کئی واقعے لوحِ ذہن پہ بکھرتے گئے۔ آج ان واقعات سے اسے کوئی لذت، کوئی سُرور نہ ملا۔ بلکہ ان واقعات سے اسے اپنے بیتے دنوں سے گھن سی آنے لگی۔ وہ کیا کرتی رہی تھی ــــ؟ اس سوال کا جواب سوائے شرمندگی کے کچھ بن نہ پڑا۔

اس رات کا تصور کر کے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب آصف کو کمیشن کے لیے منتخب ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ کتنی دیر وہ اس کے سینے پر سر رکھے آنسو بہاتی رہی تھی۔ آصف اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے میٹھی میٹھی باتوں سے اسے بہلاتا رہا تھا۔ بے حیائی کی حد ہو گئی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر اپنے دل میں کہا۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ کہ یہ جذباتی سی لڑکی تو وہ ہی تھی۔

رات گئے تک وہ اپنے اعمال نامے کے اوراق پلٹتی رہی۔ کتنے گھناؤنے تھے یہ دن ندامت اور ڈر سے اس کا وجود پانی پانی ہوتا رہا۔ اسے نیند نہ آئی۔ جاگتی رہی ڈرتی ــــ روتی رہی۔

پریشان تو ضرور ہوتی۔ لیکن اس پریشانی نے اس کی زندگی کی راہیں متعین کرنے میں مدد دی۔ بے حیائی اور بے باکی کی راہیں بڑی پُرخطر تھیں۔ اس بات کا اس کو بخوبی احساس ہو گیا۔ وہ سنبھل گئی۔ شب و روز کا چکر چلتا رہا۔

اب اسے آصف کا خیال آتا۔ تو وہ سختی سے اسے ذہن سے جھٹک دیتی۔ کبھی دل اس سے ملنے کی آرزو میں مچلتا۔ تو وہ اس آرزو کا گلا بے دردی سے گھونٹ دیتی۔ اپنے آپ کو اتنا ملامت کرتی۔ اس طرح کوستی۔ کہ دنوں چھوڑ مہینوں آصف کا خیال نہ آتا۔ سوچنے کا انداز بدل گیا تھا نا ــــ وقت گزرتا گیا۔

احساس کے آبلے بھی کند ہوتے گئے۔ فاصلوں کا کرشمہ تھا یا توبہ کا شعور ہی پختہ ہو گیا تھا۔ وہ آصف سے بالکل بیگانہ ہو گئی۔ یادیں اب بھی آتی۔ لیکن ان میں درد و کسک ہوتی نہ شرم و ندامت۔ محض بچپن اور الہڑ پنے کی حماقتیں لگتیں اب تو ــــ حماقتیں ہی تو تھیں۔ وہ اکثر سوچتی۔

آصف کا سر دکھنے لگا ہے۔ وہ سر دبائے جا رہی ہے ــــ آنکھوں سے چھم چھم آنسو گر رہے ہیں۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا تھی۔ بھلا سر درد کرنے پر رونا کس بات کا۔ سر تھی اپنا نہیں آصف کا! ہونہہ بے معنی بے مقصد۔

آصف کسی بات پر روٹھ گیا ہے۔ تو اس نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں کھانا نہیں کھایا۔ کپڑے نہیں بدلے۔ جی اچاٹ۔ دل بیزار یہ بھی تو حماقت ہی تھی۔ بیوقوفی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

اس طرح کی کئی چھوٹی چھوٹی حماقتیں اسے اکثر یاد آ جاتیں۔ جب کبھی وہ مجید چچا

کے ہاں جاتی۔ یا ان لوگوں میں سے کوئی آتا۔ تو ان حماقتوں کو یاد کرنے کا موقعہ نکل آتا لیکن پھر ایسا وقت بھی آیا۔ جب اسے یہ حماقتیں بھی یاد نہ رہیں۔ احساس کے آلے اتنے کُند ہوئے کہ بیتتے ہوئے دنوں کا کوئی بھی لمحہ جذبات میں ہلچل مچانے کے قابل نہ رہا۔

وہ تھرڈ ایئر سے فورتھ ایئر میں آگئی۔ تعلیمی مدارج کے ساتھ عمر بڑھی اور عمر کے ساتھ نظریے بھی بدلتے گئے۔ سوچ کے زاویئے بھی بدل گئے۔ اب تو آصف کے ساتھ بیتتے دنوں سورمیں مضحکہ خیز لگنے لگا۔ اب اس کے خیالوں کی اونچان بہت بلند ہو گئی تھی۔ شکوہ کی منگنی ایف۔ آر۔ سی ڈاکٹر سے ہوئی۔ تو اس کے ذہن میں بھی عام کے ہیولے کانپنے لگے۔ آمینہ ثمینہ بھی ان دنوں ضرورت سے زیادہ ہی آنے جانے لگی تھی کھلے کھلے اشاروں سے اپنا مطلب واضح کر جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ثمینہ اسے "منی سو بھابی" بھی کہہ دیتی تھی۔ جب تک آصف کی محبت کی کوئی رمق باقی تھی۔ اسے ان کی باتیں اچھی نہ لگتی تھیں۔ لیکن اب وہ ان باتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے لگی تھی۔

وہ اکثر اپنے مستقبل کے متعلق سوچتی۔ عامر کا ہیولیٰ ہر سوچ سے پیوست ہوتا انجینئر عامر۔ باپ کے وسیع کاروبار کا اکیلا مالک عامر۔ کوٹھی اور بے شمار پیسے کا واحد مالک عامر اس کے خیال کے ساتھ اس کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔

بچی نہ تھی۔ ماں باپ کے رجحان سے بھی واقف تھی۔ وہ بھی تو عامر کے متعلق اکثر ایک خاص نظریے کے ماتحت بات کیا کرتے تھے۔ جب رضامندی دونوں جانب سے تھی تو اسے اپنے خیالات پر قدغن لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

سہانے اور درخشندہ مستقبل سے کون کافر منہ موڑ سکتا ہے۔ شکر ہے اس نے آصف کی سنگت میں کوئی بہکا ہوا قدم نہیں اٹھا لیا تھا۔ اس سے کوئی گھناؤنی لغزش سرزد نہیں ہو گئی تھی۔ آصف اور عامر کا مقابلہ ہی کیا تھا بھلا۔

کہاں وہ پانچ سو روپے پانے والا لیفٹیننٹ اور کہاں انجینئر عامر جس کی تنخواہ علاوہ باپ کی کمائی ہوئی سنساری دولت بھی اسی کے تصرف میں ہو گی۔ سپرٹ کے نانے کی آمدنی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ عیش کی زندگی اچھی نہیں لگتی۔

اور — پھر — ثریہ کہ — جو جذباتی سی لڑکی تھی۔ اور آصف سے جس کی ت بالکل سطحی تھی۔ اس کا دل دریا کی تہہ میں جمی ہوئی وہ ریت تھا۔ جس پر نقش جلدی ہو جاتے ہیں۔ لیکن پانی کا معمولی سا بہاؤ بھی ان نقشوں کو یوں مٹا دیتا ہے کہ گمان ک نہیں رہتا۔ نقش کبھی بنے بھی تھے یا نہیں — +

— + —

آصف کا دل وہ پتھریلی چٹان تھا جس پر نقش اوّل تو بنتے ہی نہیں لیکن ایک بار بن جائیں تو پھر مٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوری اور جدائی کے اوزاروں سے یہ نقوش دن بدن گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

آصف ٹریننگ کے دوران صرف تین بار لاہور آسکا۔ جب وہ لاہور آیا تو ثوبیہ امتحان دینے کے بعد اپنے گھر جا چکی تھی۔ وہ اسے ملنے کی آس پر چلا تھا۔ گھر ایک دم سنسان و ویران لگا۔ وہ ثوبیہ کے کمرے میں گیا۔ وہاں کائنات ہی بدلی ہوئی تھی۔ نہ وہاں پلنگ تھا نہ الماری — منیرہ نے شاید اسے بھی گودام بنا لیا تھا۔ کمرے میں مکبس بھرے پڑے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر اس کمرے میں کھڑا رہا تھا۔ شاید گزرے ہوئے دنوں کی نامعلوم سی مہک سے مسحور ہو گیا تھا۔ گھر میں ایک ہفتے کا قیام صدیوں پر بھاری محسوس ہوا تھا۔ ماں سے اس نے دو ایک بار ثوبیہ کے بارے میں بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ماں کو ایسے ہی وقت کوئی نہ کوئی بھولا بسرا کام یاد آ گیا۔ بات دل ہی دل میں رہ گئی۔ زیادہ وقت وہ عمران ہی کے ساتھ گزار کر واپس چلا گیا۔

دوسری دفعہ تین دن کے لیے گھر آیا۔ آنے کو جی تو نہ چاہتا تھا۔ لیکن کیڈٹ ساتھی کہیں نہ کہیں گئے تھے۔ وہ بھی بادلِ نخواستہ چلا آیا۔ گھر میں کون تھا جس کی کشش دامن کھینچتی۔ ایک ماں کا دم تھا۔ سو وہ بھی بے حسی کے ڈھیروں تلے دبا ہوا اسے کوئی یاد کرتا تھا۔ نہ اسے کسی کی یاد آتی تھی۔ ثوبیہ زندگی کا محور تھی۔ اسی مرکز کے گرد اس کی ہر سوچ اور ہر احساس گھوم پھر رہا تھا۔ ثوبیہ اب اپنے گھر چلی گئی تھی۔ ملنے کا امکان و سوال نہ رہا تھا اس لیے وہ کاکول ہو لیا

معاملہ ایک ہی تھا۔ یادوں پر پہرہ نہیں تھا۔ جہاں بھی ہوتا دل کی دھڑکن یاد بنی رہتی۔

ن دوسری دفعہ لاہور آنا کچھ امید و مسرت کا پیغامبر بن گیا۔ ثوبیہ کی چھوٹی بہن کا یر بھیوں سے گرنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ منیرہ مجید کے ساتھ اسے دیکھنے گئی تھی۔ ر ثلیثہ کے ہمراہ دوبارہ گئی تھی۔ چونکہ ان لوگوں نے عامر کے لیے ثوبیہ پر آس لگا رکھی ں لیے ہمدردی کا مظاہرہ ضرورت سے زیادہ ہی کر رہے تھے۔

بس دن آصف لاہور پہنچا۔ اسی شام منیرہ مجید کے کہنے پر اسے دیکھنے جا رہی تھی۔ ان پر کام کی وجہ سے نہ آسکا۔ اس نے پیغام بھیج دیا تھا۔ کہ منیرہ فیضی کو ساتھ لے ے دیکھنے چلی جائے۔

شام منیرہ تیار ہوئی۔ تو اس نے کمال شوق سے کہا۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں امّی؟

تم — ؟ ماں نے بڑی حیرت سے کہا "تم کیا کرو گے وہاں جا کر۔ کیا ضرورت ہے۔ جوان ں والا گھر ہے تمہارا وہاں کیا کام۔"

اس نے مسکرا کر اپنے مطلب کی وضاحت تو کی تھی۔ لیکن ماں نے ملامت سے سمجھایا جیسے اس کا مطلب سمجھی ہی نہیں۔ اور واپسی پر اس نے جب ماں سے پوچھا "ثوبیہ اخلہ لے لیا ہے — ؟"

تو ماں نے بڑے کھردرے لہجے میں کہا "لے لیا ہوگا" دوسرے دن وہ ایک موہوم اُمید کے سہارے کالج پہنچا تھا لیکن ثوبیہ شاید آئی نہیں تھی۔ یا لڑکیوں کے غول میں کہیں ر پڑی تھی۔ اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

تیسری دفعہ لاہور آنا بھی بیکار رہی گیا۔ وہ خود بھی شاید کچھ محجوب سا ہو گیا تھا۔ ماں سے لے بہانے ثوبیہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ ہاں ماں اسے زبردستی دو بڑے ماموں کے ہاں ان کی بیمار پرسی کے لیے لے گئی۔ وہ ابھی اسی پرانے گھر میں بتے تھے۔ اوپر نیچے اب اسی خاندان کا تسلط تھا۔ گھر کی حالت کچھ بدل گئی تھی۔ کچھ

صاف ستھرا بھی تھا۔ بیٹھک میں کرسیاں بھی کرم خوردہ نہ تھیں — اور ریگتے رینگتے میلے کچیلے بچے بھی اب پل بڑھ کر جوان ہو گئے تھے۔

ماں بار بار فوزیہ کو بلا رہی تھی۔ لیکن آصف کا دم تو ان چھتوں تلے اسی طرح گھٹ رہا تھا جس طرح بچپن میں گھٹا کرتا تھا۔ ٹریننگ ختم ہوتے ہی آصف کی پوسٹنگ کوئٹہ ہو گئی۔ کوئٹہ جاتے ہوئے وہ لاہور ٹھہرا۔ خاکی بے داغ یونیفارم میں جب وہ ماں سے ملنے آیا۔ تو ماں اس کو چند ثانیے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے صحت مند اور وجیہہ پیکر پر خاکی وردی کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ماں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔ پھر ڈھیروں دعائیں دیتے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

جانے یہ اظہارِ تشکر کے آنسو تھے۔ یا کوئی بھولی بسری پرانی یاد سُلگ اٹھی تھی۔ وہ آنچل سے اپنی آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگی۔ آصف نے زمین پر اپنے بھاری بوٹ والے پاؤں ٹھک سے مار کر خالص فوجی انداز میں ماں کو سلوٹ کیا۔ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔

آصف نے اپنا بازو ماں کی گردن میں ڈال کر پیار سے پوچھا "وردی میں کیسا لگتا ہوں؟"

"خدا نظرِ بد سے بچائے۔" ماں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

شام آصف نے ماں سے ثوبیہ کے متعلق پوچھا۔ اس کے استفسار میں شوق کی فراوانی تھی۔ وہ اسے اب تک نہیں بھولا تھا۔ ماں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب تو میں نے باوقار سا روزگار ڈھونڈ لیا ہے ماں — اب کیا خیال ہے؟"

ماں نے بات ٹال دی۔ ابھی نوکری کر تو لو۔ دیکھا جائے گا۔ البیلی بھی کیا جلدی۔"

"جلدی تو کچھ نہیں۔" وہ کچھ جھینپ کر بولا — "شادی تو چھبیس سال کی عمر سے پہلے میں کر بھی نہیں سکتا۔"

"وہ کیوں —؟"

"چھبیس سال سے پہلے شادی کرنے کے لیے خاص اجازت لینا پڑتی ہے۔ اور یہ

دوسری سہولتیں بھی نہیں ملتیں۔ جو چھبیس سال کے بعد شادی کرنے کی صورت میں بیوی سے ملتی ہیں۔ آصف تفصیل سے ماں کو سمجھانے لگا۔

ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ہمیں بھی کون سی ایسی جلدی ہے۔ دو سال پلک جھپکتے ہی گزر جائیں گے۔"

"لیکن —!"

"کیا —؟"

"بات تو پکی ہو جانی چاہیئے ماں —!" وہ جھجک کر کہہ ہی گیا۔ "ثوبیہ —"

"لڑکیوں کی کمی نہیں آصف بیٹے۔ تم فکر نہ کرو۔ چار پیسے جمع کر لو — شادی بھی ہو جائے گی۔"

"ثوبیہ کے سوا کسی لڑکی کا سوال نہیں —!" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

کھل کر بات تو نہ ہو سکی لیکن آصف نے اپنا عندیہ ماں پر پوری طرح واضح کیا۔ ماں کے ارادے کی اسے خبر نہ تھی۔

کوئٹہ پہنچ کر آصف کی زندگی ایک خاص ڈھب سے رواں دواں ہو گئی۔ روم میٹ سیکنڈ لیفٹیننٹ اصغر سے خاصے تعلقات ہو گئے۔ دونوں اکثر اکٹھے ہی نظر آتے۔ میس میں اکٹھے — بازار میں اکٹھے — دونوں ہم مذاق تھے۔ جلد ہی گہرے دوست بن گئے — اسی کی وساطت سے آصف کی کیپٹن فرخ اور اس کی الہڑ مٹیار بیگم حسنہ سے ملاقات ہوئی۔ حسنہ میں آصف کو ثوبیہ کی جھلک نظر آئی۔ وہی بالوں کا سٹائل، وہی لمبے لمبے ناخنوں والے نرم و گداز ہاتھ، وہی باتیں کرتے کرتے آنکھوں کو حسین گردشیں دینے کا انداز۔ ہونٹوں کو سکیڑنے اور ٹیڑھا میڑھا کر کے ہنسنے کی عادت۔ بے باک قہقہے۔ ناک نقشے میں فرق تھا۔ باقی سبھی کچھ ثوبیہ ہی کی طرح تھا۔ آصف اک انجانی کشش سے ان کی جانب کھنچنے لگا — وہ جتنا وقت اس کی صحبت میں گزارتا۔ مسرور و شاداں

رہتا — اپنائیت کا احساس بڑا جانفزا ہوتا۔

اصغر نے اس کا دالہانہ پن کسی اور ہی بات سے تعبیر کیا۔ اور اس شام جب دونوں بازار جانے کو تیار ہوئے۔ تو آصف نے اپنا ارادہ بدلتے ہوئے کہا۔

"پہلے فرخ صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔"

اصغر نے ہنس کر اس کی کمر میں ٹھوکا لگایا "یہ سودا مہنگا پڑیگا۔ میاں افرخ کو صرف ہنس مکھ اور آؤ بھگت کرنے والا آدمی نہ سمجھو۔ سخت جاہ بھی ہے۔ اسے پتہ چل گیا۔ کہ میاں صاحب زادے! ان کی بیگم کے دیوانے ہیں۔ تو —"

"لاحول ولا قوۃ —" آصف نے ایک دم اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "کیا بیہودہ بکتے ہو —"

"یہ عشق و شق کا چکر دھرا رہ جائے گا۔ نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

اصغر بڑبڑاتا رہ گیا۔

لیکن جب آصف نے سنجیدگی سے بات کی۔ اپنی دلچسپی کی وجہ بتائی۔ تو اصغر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ اس حد تک ذہنی وابستگی کا قائل ہی نہیں تھا۔

آصف نے اس دن کے بعد کیپٹن فرخ کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھار سرِ راہ ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ آنکھیں جھکاتے سلام کر کے کترا کر نکل جاتا۔

اپنی ساری توجہ اس نے اپنے کام کی طرف مبذول کر دی۔ گھر سے کبھی کبھار ماں کا خط آتا۔ جس کا جواب بیکار رہنے کے باوجود کئی کئی ہفتے نہ دے پاتا۔

اصغر کا تبادلہ پشاور ہو گیا۔ اس کی جگہ لیفٹننٹ سعید نہ آ گیا۔ چند دنوں کی غیریت کے بعد دونوں آپس میں گھل مل گئے۔ اچھے ساتھی کا اثر قبول کر لینا آصف کی سرشت ہی میں تھا۔ سعید کی رفاقت میں بھی اچھا وقت گزرنے لگا۔ سعید ٹینس کا بہترین کھلاڑی تھا۔ آصف بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھار میس میں کسی فنکشن کے موقع پر پی بھی

لیا کرتا تھا۔ آصف نے بھی اس تقلید میں مضائقہ نہ سمجھا۔

سعید اچھی صورتوں کو پرستارانہ نظروں سے دیکھنے میں کوئی عیب نہ سمجھتا تھا۔ کلب میں کئی عورتوں سے اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ آصف پہلے پہل تو جھجکا۔ ٹھٹکا۔ لیکن سعید کی وساطت سے وہ بھی اس طرف کھنچا چلا آیا۔ دوستی میں مضائقہ بھی کیا تھا۔ میجر افضال کی بیگم سے اس کی ملاقات بھی سعید کی وساطت سے ہو گئی۔ وہ آصف پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہو گئی۔ گھر بلایا۔ اور پھر یہ بلانا بڑھتا ہی گیا۔ دو جوان بہنیں اپنے پاس ہی تھیں۔ ان کے رشتہ کے لیے وہ اکثر نئے نئے کمیشنڈ افسروں کی تاک میں رہتی تھی۔ گو کامیابی ایک کے لیے بھی نہ ہوئی تھی۔ تاہم کوشش جاری تھی۔ آصف کو گھر بلا کر بہنوں سے ملنے کی کھلی چھٹی دے کر وہ موقع کی تاک میں رہتی۔ آصف ان کے ارادے سے بے خبر شفقت اور پیار اور اپنا پن بے تکلفی سے ان سے راہ و رسم بڑھاتا گیا۔ دونوں لڑکیوں سے زیادہ وہ بیگم افضال اشیدا تھا۔ وہی تو محبت و شفقت اور پیار کا سرچشمہ تھی۔ آصف کی روح کی ازلی تشنگی ملنے لگتی تھی۔

وقت کا بوڑھا ہاتھ کتابِ زندگی کے اوراق الٹتا گیا۔ آصف بھی اپنی اس نئی زندگی اور اس زندگی کے آداب سے واقف ہوتا گیا۔ حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ مردوں سے زیادہ اس نے عورتوں کا دامن وسیع پایا۔ اس کی دوستی کے دائرے میں کئی ادھیڑ عمر، جوان اور کم عمر لڑکیاں آ گئیں۔ آصف سب سے بے تکلف ہوا لیکن یہ بے تکلفی کسی جنسی جذبے کی آسودگی سے یک سر پاک تھی۔ اس نے کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھا تھا نہ اس خیال سے کبھی اس کے متعلق سوچا تھا۔ وہ تو اپنی دھن میں مست تھا۔ عشق کے سارے منازل ثریہ کے ساتھ طے کر لیے تھے۔ اب اس مقام پر کسی کو لانے کے متعلق اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دوستی دوستی ہی کی حد تک تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے وجیہہ پیکر، حسین آنکھوں اور کمیشن یافتہ افسری پر اس کی دوست لڑکیاں مفتون تھیں۔

—٥—

عامر بن کر واپس لوٹ رہا تھا۔ چار سال کے طویل عرصے کے بعد کامیاب انجینئر

تین تاریخ کراچی پہنچ رہا تھا۔ چار سال کے طویل عرصے کے بعد کامیاب انجینئر عامر بن کر واپس لوٹ رہا تھا۔ باپ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ بہنیں بھی اشتیاق سے اس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

مجید نے اس کے استقبال کی تیاریاں ابھی سے شروع کروادی تھیں۔ گھر کی صفائی، رنگ روغن، سفیدی از سر نو کروا رہا تھا۔

"صوفوں کا کپڑا بھی بدلوا لینا چاہیئے۔"

"یہ کپڑا بدلا تو پردے بھی بدلنا پڑیں گے۔"

"کیا ہرج ہے۔؟"

"بدلوا دیں پھر۔؟"

"بیٹا ولایت سے آرہا ہے۔ اس کے شایانِ شان ہر چیز ہونی چاہیئے۔"

"سب کچھ اسی کا ہے۔"

جس دن سے عامر کے آنے کی اطلاع ملی تھی۔ آمینہ، ثمینہ تقریباً ہر روز ہی آجاتیں۔ گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں منیرہ کی مدد کرتیں۔ باپ سے صلاح مشورے ہوتے۔ عامر کے آنے کی خوشی میں دعوت دینے کی تجویز پر غور ہوتا۔

مجید خوشی خوشی ہر تجویز سنتا۔ ایک ہی ایک بیٹا تھا۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ کارخانہ لگ جانے سے تو آمدنی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ پیسے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس خوشی سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ منیرہ بھی اس کی خوشیوں میں شریک

"میں اور تمہاری ماں کو کراچی لینے جا رہے ہیں عامر بیٹے کو۔" مجید نے آمینہ سے کہا۔

"وہ تو ہوائی جہاز سے آرہا ہے! لاہور تک ہوائی جہاز ہی میں آئیگا۔" ثمینہ بولی۔

"کیا ہوا، ہم بھی ہوائی جہاز سے جائیں آئیں گے۔ عامر کے طفیل ہم بھی ہوائی سفر کرلیں گے۔"

"نہ بابا — میں تو ریل سے جاؤں گی۔" منیرہ نے ہنس کر کہا۔

"پگلی ہے — !" مجید اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے بھلا؟ عامر بھی تو ہے — ؟ جو اتنا لمبا ہوائی سفر کرکے آرہا ہے —" مجید کے لہجے میں شان اور فخر کا نمایاں رنگ تھا۔ آمینہ اور ثمینہ نے بھی باپ کی تائید کی۔ مجبوراً منیرہ نے حامی بھر لی۔

یونہی دن رات پروگرام بنتے رہے۔ کبھی عامر کے آنے پر شاندار دعوت زیر بحث ہوتی — کبھی اس کی شادی کا معاملہ زیر غور ہوتا۔

"میرا بس چلے تو اس کے گھر پہنچتے ہی بیاہ رچا دوں۔" ثمینہ نے ارمان بھرے لہجے میں کہا۔

"دیر کاہے کو کریں گے — ؟" آمینہ بولی — "اس کی شادی کی حسرت میں تو ہماری عمریں بیت گئیں۔"

لڑکی تو ڈھونڈھ لو پہلے —" مجید نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

"وہ تو کب کی ڈھونڈھ لی۔" ثمینہ بھی پُر معنی انداز میں مسکرائی۔

"بالکل — بالکل۔" آمینہ نے بھی ہنستے ہوئے بہن کی تائید کی۔

"دیکھ لو منیرہ — بہنوں نے تو بھائی کے لیے رشتہ بھی تلاش کرلیا۔" مجید بھی ان کا عندیہ سمجھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

لیکن منیرہ کچھ سنجیدہ سی ہوگئی۔ مجید نے سمجھا۔ شاید اس دن کی طرح وہ آج پھر تلقین کرے گی۔ کہ پیش از وقت کوئی بات منہ سے نکالنا نہیں چاہیئے۔ لیکن آج یہ بات نہیں تھی۔ منیرہ کو تو آصف کے اس خط کا خیال آرہا تھا۔ جو پچھلے ہفتے آیا تھا۔ جس میں اس نے اپنی شادی کا ذکر کھل کر کیا تھا۔ ثوبیہ کے والدین سے رشتہ طلب کرنے کا

لکھا تھا۔ وہ اگلے چھ ماہ کے اندر اندر شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا خواہشمند تھا۔ ثوبیہ کی اس کے ذہن پر گرفت اسی طرح ہی تھی۔ خط کی تحریر سے یہ بات صاف عیاں تھی۔ آصف نٹ کھٹ اور ضدی سا آدمی تھا۔ اگر اپنی بات پر اڑ گیا تو کیا ہوگا؟ منیرہ کو یہی سوچ پریشان کر رہی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ عامر کے استقبال کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ گھر دلہن کی طرح آراستہ ہو گیا۔ ثوبیہ والا کمرہ عامر کی نشست گاہ بنا دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ والا بڑا کمرہ اس کی خواب گاہ کے لیے مخصوص ہو گیا۔ نیا قالین، نئے پردے اور فوم ربڑ کے گدیلے والا سبز رنگ دار پلنگ ڈال دینے سے کمرے کی جیسے ہیئت ہی بدل گئی۔

کراچی جانے سے پہلے ایک رات جب آمینہ اور ثمینہ عامر کی شادی کے پروگرام بنا کر سو جانے کو اوپر چلی گئیں۔ تو منیرہ نے دبی زبان سے آصف کی پسند کا ذکر بھی کر ہی دیا۔

"آصف بڑا ہے۔ اس لیے پہلا حق اسی کا بنتا ہے ——" منیرہ نے سنبھل کر کہا۔

"ثوبیہ اسے بے حد پسند ہے ——"

مجید نے یوں منہ بنایا۔ جیسے کوئی لذیذ سی شے کھاتے کھاتے اچانک کڑوا ہو گیا ہو۔

"ثوبیہ میری بھتیجی ہے منیرہ؟" اس نے اپنا حق جتلانے کے انداز میں کہا۔ "خیر عامر کے آنے پر دیکھا جائے گا؟"

بات اس سے آگے بڑھی نہیں۔ منیرہ نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ آصف کی دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔ وہ خود بھی کونسا خواہش مند تھی۔ بات ذرا اس کے اکھڑ پنے اور ضد کی تھی۔

عامر آ گیا —— گھر بھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ باپ تصدق ہو ہو جاتا تھا۔ بہنیں بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔ چار سال کا طویل عرصہ کچھ کم بھی نہ تھا۔ عامر کھلنڈرا سا لڑکا گیا تھا۔ اب بھرے بھرے جسم اونچے لانبے قد والا جوان آدمی بن کر لوٹا تھا۔ عادات و اطوار سلجھے ہوئے تھے۔ شائستگی اور تہذیب کے اصولوں کو اچھی طرح اپنا لیا تھا جس سے

کی شخصیت بڑی پیاری ہو گئی تھی۔

کئی دن گھر میں گہما گہمی رہی۔ رشتہ دار، دوست، احباب ملنے کو آتے جاتے رہے۔ ثمینہ مع بچوں کے وہیں تھیں۔ رات گئے تک محفل جمتی۔ عامر وہاں کے قصے سناتا۔ نہیں مجید جیسے از بر کر لیتا۔ اور پھر ملنے ملانے والوں کو یوں لہک لہک کر سناتا جیسے عامر نہیں وہ خود چار سال ولایت رہ کر آیا ہو۔ اس کے لہجے میں فخر کی جھلک بیحد نمایاں ہوتی۔ مہمانوں کی ریل پیل ذرا کم ہوئی۔ تو دونوں بہنیں عامر کے گرد ہو گئیں۔ دعوت کے روز انہوں نے ثوبیہ اسے دکھا دی تھی۔ کچھ دیر وہ اس سے باتیں بھی کرتا رہا تھا۔

دعوت کے تیسرے دن عامر کو ساتھ لے کر وہ ثوبیہ کے ہاں بھی ہو آئی تھیں۔ اس دن بھی کافی دیر سب اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ عامر کے انداز بتاتے تھے کہ ثوبیہ اسے پسند آ گئی ہے۔ دونوں بہنیں بڑی خوش تھیں۔

"کیا خیال ہے عامی ——؟" ثمینہ نے اس دن ہنس کر کہا۔

"کیسا خیال۔" وہ مطلب سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔

"جیسے جانتے نہیں؟" آمینہ نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"واللہ! بالکل نہیں جانتا۔ آپ تو معموں میں باتیں کر رہی ہیں۔" وہ شوخ تبسم سے بولا۔

"سچ سچ بتاؤ —— زیادہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ ثوبیہ پسند ہے نا تمہیں؟" ثمینہ نے پیار سے گھور کر کہا۔

"پسند نہ بھی ہو —— تو آپ کی پسند کا احترام ضرور کروں گا۔" وہ پھول کی طرح کھل کر بولا۔

"چالاک کہیں کے ——"

"سچ کہتا ہوں باجی۔ اب ولایت میں تھوڑا ہی بیٹھا ہوں جو اپنی مرضی سے جس کا ہاتھ چاہوں تھام لوں گا۔"

"اور جب جی بھر گیا۔ چھوڑ دوں گا۔" ثمینہ نے نقل اتارتے ہوئے کہا۔

آمینہ ہنسنے لگی۔ عامر بھی مسکراتے ہوئے بولا۔ "ویسے عقل مند ہیں وہ لوگ۔ جوڑ بھ کے لیے پابندی مول نہیں لیتے۔ یہاں تو یوں باندھ دیا جاتا ہے کہ ہلنے کی سکت ہی نہیں رہتی۔"

"تمہیں پسند ہے وہاں کی تہذیب؟" آمینہ نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

"پسند ہوتی تو ایک عدد بھابی آپ کے لیے ضرور لے آتا۔" عامر ہنس کر بولا۔ ثمینہ اور آمینہ بھائی کو داد بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

عامر وہاں کی نئی پود کی بے راہ روی کے حیاسوز قصے سنانے لگا۔ دونوں بہنیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر سنتی رہیں۔ اللہ کی شکر گزار تھیں جو ان کا اکلوتا بھائی وہاں بہکنے کی بجائے زندگی کے بڑے سبق آموز گر سیکھ آیا تھا۔

عامر نے بہنوں کی پسند کے سامنے واقعی سر تسلیم خم کر دیا۔ ثوبیہ دیکھنے میں بھی پرکشش سی لڑکی تھی۔ باتیں کرنے کا انداز بھی دلکش تھا۔ ٹھہری ٹھہری سلجھی سلجھی گفت گو عامر کو من بھائی تھی۔

عامر کی پسند کا علم ہوتے ہی دونوں بہنیں ثوبیہ کے ہاں زیادہ ہی جانے آنے لگیں۔ پیار اور چاہت کا مظاہرہ بھی زیادہ ہونے لگا۔

ثوبیہ کے والدین بچے نہیں تھے۔ جو اس چاہت کے پس پردہ مضمر خواہش کو نہ پرکھ سکتے۔ انہیں اور کیا چاہیئے تھا۔ اس دور میں گھر بیٹھے بٹھائے ایسا موزوں رشتہ ملنا ان کی بیٹی کی خوش بختی ہی تو تھی۔ اس سے جبکہ متوسط طبقے کی لڑکیوں کے لیے موزوں رشتوں کا قحط تھا۔ درمیانے طبقے کے لائق لڑکوں کو امیر طبقہ بھاری جہیز کے عوض خرید لینے کی تاک میں رہتا تھا۔ عامر جیسا سلجھا ہوا لڑکا — جس کے پاس انجینئرنگ کی ڈگری کے علاوہ باپ کی کمائی ہوئی کافی دولت بھی تھی۔ بڑے بڑے دولت مندوں کی نظر میں تھا۔ ابھی پڑھائی سے فارغ ہو کر لوٹا بھی نہیں تھا۔ کہ کئی خواہش مند مجید کو رشتے کے لیے کہلوا

چکے تھے۔ موٹریں اور تک جہیز کی صورت میں دینے کا لالچ دیتے تھے۔ لیکن مجید کو ثوبیہ جیسی بھائی۔ کہ دولت کی اتنی کشش بھی اس کا خیال تبدیل نہ کر سکی۔ دولت کی ویسے اسے ہوس بھی کیا تھی۔ خوبصورت آراستہ بنگلہ خدا نے دے دیا تھا — موٹر عامر سا تو لے آیا تھا۔ لڑکی چاہیئے تھی — وہ ثوبیہ سے بڑھ کر اور کون ہو سکتی تھی۔

ثوبیہ کے والدین آمینہ ثمینہ کے کنائے سمجھ رہے تھے۔ وہ خوش تھے اور جہاں تک ہو سکے۔ جلدی اس معاملے کو طے کرنے کے خواہش مند بھی۔ گھر والوں کی طرف سے تو دیر کا سوال ہی نہ تھا۔ ہاں عامر پہلے نوکری تلاش کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی تو پڑھائی کا بوجھ بمشکل اتارا ہے — آپ زندگی بھر کا بوجھ لاد دینا چاہتی ہیں۔ نوکری تو تلاش کر لینے دیں۔ پھر دیکھیں گے — ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ میں بھاگا جا رہا ہوں نہ کوئی اور۔" وہ ہنس کر بہنوں سے کہتا۔

بات معقول تو تھی۔ لیکن اس لگن اور ارمان کا کیا کیجیئے۔ جو بہنوں کے دل میں مچل رہا تھا۔ بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔

اور بالآخر طے یہ پایا۔ کہ رشتہ استوار ضرور کر دیا جائے۔ شادی چار چھ ماہ بعد ہی ہو۔

آصف بھائی" عامر اسے دیکھتے ہی برآمدے کی سیڑھیاں جلدی سے اتر کر لان میں آ گیا۔ اور بغل گیر ہونے کو ہاتھ پھیلا دیئے۔

آصف نے اسے دیکھا۔ سرتاپا دیکھا۔ اور پھر سرد مہری سے ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔ عامر شرمندہ سا ہو گیا۔ آصف کی سرد مہری سے دل میں پیچ و تاب بھی کھایا۔

"انجینئر بن گئے ——؟" آصف نے ہاتھ میں پکڑا اچھوٹا سا اٹیچی کیس فیضی کو تھماتے ہوئے کہا۔

"آپ کی دعا سے۔" عامر کے لہجے میں بھی طنز کی آ گئی۔

"سوٹ کیس اُوپر لے جاؤ ——؟" آصف نے فیضی سے کہا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں وہ کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ آصف اسے جاتے دیکھنے لگا۔

عامر نے بھی پھر کوئی بات نہ کی۔ چار سوا چار سال کے طویل عرصے کے بعد بھی آصف اس سے یوں بیگانوں کی طرح ملا تھا۔ نفرت کی دیوار ابھی تک نہیں گری تھی۔ عامر کیوں اس دیوار کو پھلانگنے کی کوشش کرتا۔ جس بات کو وہ یک سر بھول چکا تھا۔ آصف کے ٹھنڈے رویے نے پھر یاد دلا دی تھی۔

دونوں چند لمحے آمنے سامنے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر عامر گیٹ کی طرف چل دیا اور آصف اندر آ گیا۔

"امی کہاں ہیں؟" اس نے خالی باورچی خانے کو دیکھنے کے بعد فیضی سے پوچھا۔

"جمید صاحب کے ہاں گئی ہیں ——!" فیضی نے جواب دیا۔

"آپ بڑی مدت کے بعد آئے صاحب۔" فیضی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شامدی ہنسی ہنس کر کہا۔

"کیا فرق پڑا فیضی ——؟" آصف بھی مسکرایا۔ "تم خاصے لمبے ہو گئے ہو۔ مجھے یہی فرق نظر آیا۔"

"چائے بناؤں ——؟"

"بنا دو ——!"

آصف کچھ دیر فیضی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اوپر آ گیا۔ کمرہ کافی دیر سے بند پڑا رہنے کی وجہ سے خاصہ گندا ہو رہا تھا۔ بستر کی جگہ پلنگ پر اک میلی سی رنگین دری پڑی تھی۔

آصف کپڑے بدل کر نیچے آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں عامر کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔ فیضی چائے وہیں لے آیا۔

"آپ پئیں گے صاحب؟" فیضی نے عامر سے پوچھا۔

"ایک پیالی اور لے آؤ ——؟" عامر کے کچھ کہنے سے پہلے آصف بولا۔ عامر صرف آصف کو دیکھ کر رہ گیا —— دل ہی دل میں اس کے عجیب و غریب مزاج کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اتنی طویل مدت گزر جانے پر بھی آصف میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی تھی۔

آصف نے خود ہی گفت گو کا آغاز کیا اور دھیمے مگر خنک لہجے میں عامر سے باتیں کرنے لگا۔ عامر بھی اس کے انداز میں بات چیت کرنے لگا۔ چائے کے دوران باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

آصف تو اپنے تین خطوں کے جواب میں ماں کی طرف سے خاموشی سے گھبرا کر چلا آیا تھا۔ اس نے پہلا خط رشتہ کے بارے میں لکھا۔ آٹھ دس دن انتظار میں کاٹ کر پھر یاد دہانی کرائی۔ جواب میں تاخیر اس نے عامر کے آ جانے کی وجہ سے ماں کی عدیم الفرصتی

کو قرار دے کر خود ہی دوبارہ خط لکھ دیا تھا۔ لیکن جب دوسرے خط کا جواب بھی نہ ملا تو گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں تیسرا خط لکھ دیا۔ دس پندرہ دن جان لیوا انتظار کے باوجود جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو اسے تشویش ہوئی۔ سارے معاملے کو طے کرتے وہ خود ہی چھٹی لے کر گھر آ گیا۔

چائے پینے کے بعد عامر باہر چلا گیا۔ اور وہ اوپر آ گیا۔ فیضی نے کمرہ جھاڑ پونچھ دیا تھا۔ ملازمہ بستر بھی بچھا گئی تھی۔ آصف سفر سے تھکا ہوا تھا بستر پر لیٹ کر سگریٹ سلگا لیا اور سگریٹ کے بل کھاتے دھوئیں میں کئی حسین یادوں کے برعکس تھرانے لگے۔ اس کمرے کی فضا میں کتنی رنگین کہانیاں تحلیل ہوئی تھیں۔ آصف کو یوں لگا جیسے ڈھائی برس پہلے کے دن پھر سے لوٹ آئے ہوں۔

آصف ان دنوں کی یادوں میں کھو گیا — اور جب منیرہ اوپر آئی۔ تو وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کافی مدت کے بعد بیٹے کو دیکھا تھا۔ ممتا بے چین ہو گئی۔ جھک کر اس نے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آصف کو نسا گہری نیند میں ڈوبا تھا۔ ہونٹوں اور ہاتھوں کے لمس سے بیدار ہو گیا۔

"سوئے رہو۔" ماں نے سر تھپکا۔ لیکن وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماں نے پیار سے لپٹا کر دعائیں دیں۔ وہ بھی پیار سے ترسے ہوئے بچے کی طرح ماں سے لپٹ گیا۔

ماں بیٹا ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ منیرہ جس موضوع سے بچنا چاہتی تھی آصف اسی کو چھیڑنے کی سوچ رہا تھا۔

"جب میں آیا۔ آپ کہیں گئی ہوئی تھیں۔" آصف نے دانستہ ذکر چھیڑا۔

"ہاں ذرا حمید کے ہاں گئی تھی۔" وہ کتراتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو تین خط لکھے تھے۔" آصف نے دوسرا سرا پکڑا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا؟"

منیرہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ لیکن اس طرح آصف کو دیکھا جیسے اس کی بات ہی نہ سنی ہو۔

"آپ نے جواب کیوں نہ دیا؟" آصف بے چینی سے بولا۔

"کیا جواب دیتی —؟" منیرہ کی آواز جیسے ڈوب گئی۔

"کیوں —؟" آصف ایک دم سے بول اٹھا۔ ماں کے لہجے سے مایوسی کی بو آ رہی تھی۔

منیرہ نے آصف کی طرف دیکھا اور پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پھیکے لہجے میں بولی۔ "دنیا میں ایک ثوبیہ ہی تو نہیں رہ گئی۔ ایک سے ایک بڑھ کر —"

"ماں —!" وہ چیخنے کے انداز میں بولا۔ "میں ثوبیہ کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔"

ماں نے اب کچھ چھپانا بیکار سمجھا۔ آصف کی ذہنی کیفیت کا اسے کیا علم۔ سادگی سے بولی۔ "وہاں عامر کا رشتہ طے ہو رہا ہے آصف۔ مجید کو شروع ہی سے اس رشتہ کی چاہت تھی۔ میں نے تمہیں ایک بار پہلے بھی کہا تھا۔ رشتہ طے ہی سمجھو۔"

"کیا —؟" آصف کی آواز میں ایسی گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی جیسے کئی منزلہ عمارت ایک ہی دھماکے سے گر گئی ہو۔

منیرہ نے گھبرا کر آصف کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گرتی عمارت کے ملبے کی دھول تھی۔ پریشان ہو کر جلدی سے بولی۔ "آصف بیٹے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔ وہ دانت پیس کر مٹھیاں کس زخمناک لہجے میں بولا۔ "یہ باپ بیٹا ہمیشہ میرے حق پر ڈاکہ ڈالتے رہے ہیں۔ لیکن میں — میں انہیں بتا دوں گا۔ اب کے انہوں نے ایسا کیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"

وہ غصے سے کانپتا اٹھ کھڑا ہوا۔ منیرہ اس کے تیوروں سے ڈر گئی۔ ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور سختی سے بولی۔ "مجید اور عامر کو کیا کہتے ہو۔ ثوبیہ کون ہے۔ تمہارے فراق میں مری جا رہی ہے۔ اسے تو شاید تمہارا نام تک بھی یاد نہ ہو۔ اور تم ہو کہ اس کے لیے قیامتیں بپا کرنے چلے ہو۔"

"یہ ناممکن ہے — ثوبیہ — ثوبیہ —؟" اس کی آواز میں گھٹن سی آ گئی۔

"ہونہہ —؟" ماں کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ حقارت سے بولی۔

"ثوبیہ — ثوبیہ کی رٹ — اور اس نے کبھی بھول کر بھی نام نہیں لیا۔ اتنا ہی تمہارے لیے مری جا رہی ہوتی تو عامر سے رشتہ طے ہونے سے انکار کر دیتی۔ دودھ پیتی بچی تو نہیں۔ جو کچھ سوچ سمجھ نہیں سکتی۔ جب اسے پروا نہیں تو تم بھی جہنم میں ڈالو اسے۔ دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔"

"ماں۔ ثوبیہ ایسی نہیں۔ وہ۔ وہ۔ وہ۔" آصف کی آواز ڈوب گئی۔ ماں نے اس کا دل متنفر کرنے کو کئی من گھڑت باتیں بھی کہہ دیں۔ وہ تو ڈر رہی تھی۔ کہیں اس بات پر مجید اور عامر کے ساتھ اس کا تصادم نہ ہو جائے۔ اس نے پالنسہ ٹھیک ہی پلٹا تھا۔ آصف اس اندھے کی طرح جسے راستہ تلاش کرنے کو بصارت کی ضرورت ہو۔ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتا رہ گیا۔

رات کھانے پر اس کا مزاج بے طرح بگڑا ہوا تھا۔ مجید سے وہ رسمی علیک سلیک بھی جانے کس طرح کر پایا۔ عامر باپ سے اشاروں ہی اشاروں میں اس کے متعلق کہہ سن رہا تھا۔ باپ بیٹے کے ہونٹوں پر پڑا چھپتا ہوا طنزیہ تبسم تھا۔ آصف کن طوفانوں میں چکر کھا رہا تھا۔ اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

کھانا ادھورا ہی چھوڑ کر وہ اٹھ گیا۔

"میں سمجھا وقت نے کچھ مزاج تبدیل کر دیا ہوگا۔" عامر نے طنزیہ تبسم سے کہا۔

"توبہ کرو۔" مجید کے لہجے میں استہزا تھا۔

"برسوں بعد ملے ہیں۔ کچھ پتہ ہی نہیں۔"

"وہ ہمیں اپنا تھوڑا ہی سمجھتا ہے۔ ڈیڑھ سال بعد گھر آیا ہے۔ دیکھو کس طرح پیش آیا۔"

"لیکن غیروں سے بھی تو کوئی یوں نہیں پیش آتا۔ اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اخلاق اور آصف دو متضاد چیزیں ہیں بیٹا جی —" مجید نے کبابوں کی پلیٹ

ت سے بیٹے کی طرف بڑھائی۔ تم کن چکروں میں پڑ گئے۔ کھانا کھاؤ۔"

منیرہ چپ چاپ باپ بیٹے کی طنز سنتی رہی۔ شاید دوسرے کمرے میں آصف بھی

ن رہا تھا۔

کیونکہ

اس گفت گو کے بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ زور سے بند کر کے کسی کے باہر جانے

کی آواز آئی تھی۔

"ھوں" عمران نے سارا قصہ سننے کے بعد بڑے متفکرانہ انداز میں حلق سے یہ آواز نکالی۔

آصف اس کے چہرے کی طرف بڑے مضطربانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے عمران کی رائے پر ہی اس کی زیست کی خوشیوں کا مدار ہو گا۔

دونوں دوست ایک عرصے کے بعد ملے تھے۔ لیکن یہ ملاقات کسی خوشی کی ضامن نہ ہوئی۔ الجھنوں اور بکھیڑوں کے چکروں میں دونوں الجھ کر رہ گئے۔ اور ملاقات کی حقیقی خوشی انہی چکروں میں گم کر رہ گئی۔ عمران سوچ میں ہی ڈوبا رہا۔

"کچھ کہو بھی ——؟" آصف کا جیسے اس خاموشی سے دم گھٹنے لگا تھا۔ عمران شیشے کی دیوار کے پار سڑک پر رواں دواں موٹروں کو جیسے گننے لگا۔ کیفے میں بہت لوگ چائے کافی وغیرہ پی رہے تھے۔ کسی کے سامنے مشروبات کی ٹھنڈی بوتلیں پڑی تھیں۔ ہر کوئی اپنے آپ میں مگن نظر آتا تھا۔ عمران اور آصف بھی چائے کے لیے یہاں آ بیٹھے تھے۔ کل آصف کی ملاقات عمران سے نہ ہو سکی تھی۔ آج دفتر ہی میں اسے جا پکڑا تھا۔

اور دفتر سے دونوں سیدھے اس کیفے میں آ بیٹھے تھے۔ اپنا معاملہ جس طرح آن الجھا تھا۔ اس نے سب عمران کے گوش گزار کر دیا تھا۔

"تم ثوبیہ سے ملے۔" اس نے بالآخر سکوت توڑا۔

"نہیں ——؟"

"خط لکھتے ہو اسے؟"

"نہیں؟"

"تمہیں اس سے ملے کافی عرصہ ہو چکا ہے ——؟"

"ہاں —— تقریباً سوا دو سال۔"

"بہت مدت ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"یعنی؟"

"آصف اتنے جذباتی نہ بنو۔ ہر بات ممکن ہے۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ وہ تمہیں بھول گئی ہو ——!" —— اس کے کچھ کہنے سے پہلے آصف نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ عمران کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں۔

یوں لگتا تھا جیسے درد کی اذیت سے پھٹی جا رہی ہوں۔

عمران کو اس پر بڑا ترس آیا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے آصف۔ تمہیں یاد رکھنے کے باوجود وہ کسی سے کچھ کہہ نہ سکتی ہو۔ اس حقیقت سے تو انکار نہ کرو کہ عامر گارشتہ بہرحال تم سے بہتر ہے۔ ہو سکتا ہے۔ والدین کے فیصلے کے سامنے اس کو دم مارنے کی جرأت ہی نہ ہو۔"

"تو پھر ——؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"ایک ہی صورت ہے ——!"

"کون سی؟"

"تم اس سے ملنے کی کوشش کرو۔ ساری بات واضح ہو جائے گی۔"

"اگر —— اگر ——" وہ کچھ کہہ نہ پایا۔

"اگر مگر کیا ——؟" عمران نے صاف صاف کہا۔ "وہ تمہیں بھول گئی ہے۔ تو تم بھی اسے بھلا دو —— اور ——!"

"عمران ——!" اس نے میز پر زور سے مکا مارا۔ چائے کی پیالی چھلک گئی۔ اور ارد گرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہوٹل میں بیٹھے ہو۔" عمران نے آہستگی سے مرزنش کی۔ آصف بھی آداب کی خلاف ورزی سے کچھ خجل سا ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد جب دونوں سڑک پر آئے۔ تو یہ بات طے پا چکی تھی۔ کہ آصف کل کالج جا کر ثوبیہ سے ملے گا۔ کل نہ مل سکا تو پرسوں بہر حال ان دونوں میں بات ٹھکانے لگانا تھی کیونکہ تیسرے دن شام کی گاڑی سے اسے واپس کوئٹہ روانہ ہو جانا تھا۔

رات بڑی کش مکش میں بسر ہوئی۔ جانے کیوں آصف کو بچپن کی اس بھولی بسری گڑیا کا بار بار خیال آ رہا تھا۔ جسے اس نے مجید سے کہہ کر کراچی سے منگوایا تھا۔ اور جسے دیکھتے ہی عامر مچل بیٹھا تھا۔ مجید نے گڑیا چھین کر عامر کے حوالے کر دی تھی۔

اس گڑیا کا اس نے کیا حشر کیا تھا۔؟ اس خیال ہی سے اسے وحشت ہونے لگی تھی لیکن کوشش کے باوجود اس گڑیا کا خیال ذہن سے جھٹکا نہ جا سکا۔

دوپہر سے وہ کالج کے باہر بیتابی سے ٹہلتا ثوبیہ کے گیٹ سے برآمد ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ امید و بیم سے اس کی حالت طوفانوں میں تھپیڑے کھاتے تنکے کی سی ہو رہی تھی۔ ثوبیہ شاید کالج ہی نہ آئی تھی۔ یا لڑکیوں کے ہجوم میں وہ اسے پا ہی نہ سکا۔ دو گھنٹے مسلسل وہاں کھڑے رہنے کے بعد وہ ناکام واپس لوٹ آیا۔ شام کو مزاج اس قدر بگڑا ہوا تھا۔ کہ کسی سے بات کرنا تو درکنار وہ کسی کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔

باپ بیٹا اس کے رویے سے یہی اخذ کر سکے۔ کہ وہ عامر کی بے پناہ کامیابیوں سے جل کر بیٹھا کر رہا تھا۔ دونوں اس کی حالت پر طنز کر کے ہنس رہے تھے۔ آصف ان کے چبھتے طنز سے اور بھی ناخوش تھا۔ وہ تو ثوبیہ سے ملنے کے بعد ہی کچھ کر سکتا تھا۔

دوسرے دن اس کی بے تابیوں اور بے چینیوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ آج شام

پس بھی جانا تھا۔ وقت کم تھا۔ آج بھی ملاقات نہ ہوئی تو کیا ہو گا ——؟

اس نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے۔ کبھی ٹہلنے لگتا۔ کبھی ایک گیٹ پر نظریں گاڑ دیتا۔ حسب معمول کالج کے گیٹ پر تانگے، رکشے، موٹریں اور ٹیکسیاں دور تک قطاروں میں کھڑی تھیں۔ چھٹی ہوتے ہی لڑکیوں کے جمگھٹے گیٹ سے نکل نکل کر ان سواریوں میں بیٹھنے لگے۔

وہ گیٹ پر نظریں جمائے مجسم انتظار کھڑا رہا۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد اسے مقصود نظر آ گیا۔ اس کی روح بصارت بن کر آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اس نے نظر بھر کے دیکھا۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ وہ تانگے پر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے ہلا کر شاید اسے خدا حافظ کہا۔ مسکراہٹ سے الوداعی فقرے کہتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔

جوش جنوں میں وہ دوڑ کر سڑک عبور کر کے اس کے تعاقب میں قدم اٹھانے لگا۔

ثوبیہ رکشے کی طرف بڑھی۔

"ثوبیہ ——؟" اس نے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرتے ہوئے پکارا۔

اپنا نام سن کر وہ پلٹی۔ اپنے سامنے آصف کو پا کر جیسے اسے سکتہ سا ہو گیا۔ آصف نگاہِ شوق محبت بھرے پیغام نچھاور کر رہی تھی۔ وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ثوبیہ ——!" اس نے پیار بھرے لہجے میں پکارا۔

"آپ ——؟" ثوبیہ کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ لیکن اس سرخی میں حیا نہیں شرمندگی کا عنصر غالب تھا۔ ارد گرد گزرتی لڑکیاں پُرمعنی نظروں سے دونوں کو دیکھتی گزر رہی تھیں۔ دو ایک نے تو آوازے بھی کسے۔ جس سے ثوبیہ کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔

بغیر کچھ کہے وہ جانے کو پلٹی۔

"ثوبیہ ——؟" آصف اس کے سامنے آ گیا۔

"کیا کہنا ہے آپ کو ——؟" ثوبیہ نے اس کا راستہ روکا۔ بولی

اسے غصہ بھی آگیا۔ لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی ــــ ؟" لوگ کیا سمجھیں گے ؟ اسے یہی فکر ڈس رہی تھی۔
آصف کو اس کا لہجہ ڈس گیا۔ حساس تو ازلی تھا۔ لہجے کی بیزاری سے کیا کچھ نہ سمجھا۔
پھر بھی شاید اپنے آپ کو فریب دینا انسان کی سرشت ہے۔ جلدی سے بولا۔
"میں نے سنا ہے تمہارا رشتہ عامر سے طے ہو رہا ہے ؟"
"میرے ماں باپ جو کریں گے بہتر کریں گے۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر جلدی سے رکھشے میں بیٹھنے کو بڑھی۔ آصف گنگ سا رہ گیا۔ اور وہ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔
"تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا ثوبیہ ــــ ؟" انتہائی بے چارگی سے آصف یہی کہہ سکا۔
"بچپن کی حماقتیں یاد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ــــ ؟" اس نے دانستہ دو ٹوک جواب دیا۔ اور پھر رکھشے والے سے بولی۔ "چلو رکھشے والے۔"
رکھشا چل دیا ــ اور ــــ آصف رکھشے کے پہیوں ہی کی طرح گردش کرتا ذہن لیے کھڑا رہ گیا۔ شام کی گاڑی سے آصف واپس کوئٹہ جا رہا تھا۔ فسٹ کلاس کی نرم نرم سیٹ کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ دماغ گاڑی کے پہیوں کی طرح چکر کھا رہا تھا۔ ذہن میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ آگ سی لگی تھی تن بدن میں۔
کھڑکی میں بازو ٹکائے ہاتھ سے اپنا گھومتا سر تھامے افق پر نظریں جمائے تھا۔ وہ زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی بھی ہار آیا تھا۔ عامر جیت گیا تھا۔ مجید جیت گیا تھا یہ جیت شاید ان کی تقدیر کی نوازش تھی۔ لیکن آصف یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس جیت کا نمایاں کردار مجید تھا۔
مجید، عامر ــــ عامر، مجید دونوں اس کے ذہن میں اٹھتے بگولوں میں ناچنے لگے۔ انہی دونوں نے اس سے زندگی کی ہر خوشی چھینی تھی۔ اس کا ہر حق غصب کیا تھا۔ نفرت کی جلتی ہوئی لہر اٹھی۔ اور اس نے آصف کا دل و دماغ بھسم کر ڈالا۔
لیکن ثوبیہ ــ ؟ دل میں ایک اور سوال اٹھا۔ مجید اور عامر سے کہیں زیادہ وہ

مورد ار تھی۔ ثوبیہ کے خیال کے ساتھ ہی آصف نے شکست خوردگی کے تباہ کن احساس سے اپنے دماغ کی رگیں سنسناتی محسوس کیں۔
اس کی آنکھیں جلنے لگیں اس کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔
کھڑکی سے ہٹ کر وہ سیٹ پر لیٹ گیا۔ رات خاصی ہو گئی تھی۔ بیرہ کھانا پوچھنے آیا۔ آصف نے صرف پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس طلب کیا۔
لیکن
پانی کا ٹھنڈا گلاس کہیں نس نس میں لگی آگ کو بھی بجھا سکتا تھا ؟

ــــ ؟ ــــ

چلے جانے کے بعد بھی کئی دن تک مجید، عامر اور آمینہ ثمینہ کی گفت گو کا موضوع بنا رہا۔ منیرہ کے سامنے تو سب لیے دیے رہتے لیکن اس کی غیر موجودگی میں آصف کے بارے میں خیال آرائیاں کر کے جانے کس حسِ کی تسکین کا سامان کرتے رہتے۔

"عامر انجینئر بن گیا ہے۔ وہ حسد کے مارے ایسا کرتا رہا۔"

"خود بھی تو افسر بن گیا ہے۔ اب جلن کیسی؟"

"افسری کا مقابلہ عامر سے تو ہونے سے رہا۔ انجینئرنگ کی ڈگری کے سامنے اس چار پانچ سو کی افسری کی کیا وقعت ہے؟ اپنا عامر انشاء اللہ ہزار ڈیڑھ ہزار سے کیا کم ملازمت کرے گا؟"

"اسے تو شکر کرنا چاہیے پڑھ لکھ گیا اور اب کمیشن بھی مل گئی۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو اس گھر میں آ گیا۔ ورنہ ——"

"کسی اور جگہ ہوتا۔ تو یاد کرتا۔ بیوی کی پہلی اولاد کو منہ کون لگاتا ہے ——؟"

آصف کئی دن موضوع بنا رہا —— باپ بیٹے اس کے الٹ، پلٹ مزاج کا مضحکہ اڑاتے رہے۔ ثمینہ کو آصف سے کچھ ہمدردی ضرور تھی۔ لیکن جب سے اسے کمیشن مل گئی تھی۔ وہ بھی اس سے نالاں تھی۔ وہ ایک بار بھی تو اس سے ملنے اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ دن گزرتے گئے۔ آصف پرلے درے آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ عامر کی منگنی کا قصہ پھر سے شروع ہو گیا۔ بہنیں دھوم دھام سے یہ تقریب منانا چاہتی تھیں۔ عامر سادگی سے بات طے کر دینے پر مُصر تھا۔ لیکن پہلے کی طرح ہار عامر ہی کو ماننا پڑی۔ پلڑا بہنوں

ہی بھاری رہا۔ اور جب خرچ کرنے والا مجید تھا تو عامر کے اعتراض کا سوال ہی کیا۔

"پہلے رشتہ تو مانگو جا کر —— منگنی کے پروگرام بعد میں بناتی رہنا۔ کیا خبر رشتہ ملنا بھی ہے نہیں ——؟" مجید نے شانِ تفاخر سے کہہ کر آمینہ ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"واہ جی رشتہ نہ ملے ——؟" ثمینہ جلدی سے بولی "ایسا لائق شریف اور خوبصورت لڑکا مل جائے۔ خدا کا شکر ادا کریں گے حمید چچا۔"

"ہاں ابا جی —— آجکل رشتوں کا جو قحط ہے وہ کسے معلوم نہیں۔ اللہ رکھے عامر ابھی انجینئر بن کر آیا نہیں تھا۔ کہ رشتوں کے لیے لوگ میرے گھر آنے لگے؟" آمینہ بولی۔

"اچھا تمہارے گھر بھی کوئی پہنچا؟" مجید نے خوش ہو کر پوچھا۔

"کوئی ایک دو ——؟" آمینہ بولی۔

"یہ تو آجکل دستور ہی بن گیا ہے؟" منیرہ نے کہا "لوگ بیچارے یہ بھی کیا کریں۔ جوان لڑکیاں پڑھ لکھ کر گھروں میں بیٹھی ہیں۔ لڑکے والے پوچھتے ہی نہیں۔ ادھر لڑکے والے بھی کیا کریں۔ ایک لڑکا لائق ہوتا ہے دس امیدوار آن کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنے آصف کو جب سے کمیشن ملی ہے۔ کوئی دس جگہ سے تو مجھے بھی رشتہ کا کہلوایا جا چکا ہے۔"

"کیوں نہیں؟" ثمینہ بولی "دُور کیوں جائیں۔ میری تین نندیں بیٹھی ہیں ابھی۔ کئی بار میری ساس مجھے کہہ چکی ہیں۔ پہلے تو میں سُنی ان سُنی کر دیتی تھی۔ لیکن اس دن اس نے صاف کہہ ہی دیا ——"

"کیا ——؟"

"یہی کہ تمہارے دونوں بھائی لائق ہو گئے ہیں۔ ایک آدھ رشتہ تو گھر میں کروا دو؟"

"لڑکیاں تو بہت اچھی ہیں۔ پڑھی لکھی بھی اور شائستہ بھی۔"

"اس میں تو شک نہیں لیکن بدلے کا رشتہ ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"اسی لیے تو میں چپ ہو گئی۔ عامر کا تو میں نے کہہ دیا۔ رشتہ پہلے سے طے ہے۔

اب آصف کے لیے میرے پیچھے لگی ہے۔"

ثمینہ نے منیرہ کی طرف مستفسرانہ دیکھا۔ لیکن اس نے تو یہ رشتہ اپنے بھائی کے لیے کرنے کی ٹھانی تھی۔ کوئٹہ جانے سے پہلے آصف ثوبیہ سے بھی کنارہ کش ہو گیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے ماں سے کہہ دیا تھا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا ماں — ثوبیہ بھلا جینے کے قابل ہی ہے —" اس جملے سے اس کی امید بندھ گئی تھی اور آصف کی طرف سے لگاؤ سرے کا بھی ختم ہو گیا تھا۔ یہ جملے اس نے کس طرح کہے تھے۔ اور اس کی حالت کیا تھی۔ منیرہ کو سوچنے کی کہاں فرصت تھی۔ وہ تو خوش تھی۔ اپنی بھتیجی کا کام بن گیا۔ اسی خیال سے اس نے ثمینہ سے صاف صاف کہہ دیا۔ "آصف کا بھی کہیں کر ہی لیں گے۔ ابھی کیا جلدی ہے۔ میرے بھائیوں کے ہاں لڑکیوں کی کمی نہیں — ؟"

کافی دیر تک رشتوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ عامر کی بات دب گئی۔ زمانے پر ہی تبصرہ ہوتا رہا۔ وقت کافی گزرنے پر مجید اٹھتے اٹھتے بولا۔ "اب رشتے کی بات پکی کر ہی دینی چاہیئے۔"

"ہاں جی ضرور۔" منیرہ بھی اپنے کمرے میں جانے کو اٹھی۔

"تو پھر آج ہی طے کر لیں۔ کسے جانا چاہیئے رشتہ مانگنے — ؟" ثمینہ بولی۔

مجید اور پھر بیٹھ گئے۔ صلاح مشورے ہونے لگے۔ طے پایا کہ منیرہ اور مجید پہلے جا کر رشتہ کی بات کریں۔

"کب جانا چاہیئے — ؟"

"کل ہی بسم اللہ کریں!"

"اچھا ٹھیک ہے کل شام چلیں گے۔"

"ہاں حمید بھی گھر پہ ہو گا —"

"بات تو تقریباً طے ہی ہے ابا جی۔ صرف اشارے کی دیر ہے!"

"پھر بھی بیٹیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں کچھ سوچ بچار تو کرنا ہوتا ہی ہے۔" منیرہ نے کہا۔

"وہ سب سوچ بچار کر چکے ہیں۔" ثمینہ نے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

"سچ — ؟" وہ بھی مسکرا کر بولی۔ "مجھے پتہ ہے۔ بات کرتے ہی ہاں ہو جائے گی۔"

"پھر تو تم منگنی کی ابھی سے تیاریاں شروع کر دو!" مجید مسکرایا۔

"بالکل —!"

"منگنی کے لیے کیا کچھ چاہیئے؟"

"کچھ زیادہ نہیں ابا جی۔ صرف ہیرے کی ایک نازک سی انگوٹھی اور لشو کا بھاری سا جوڑا — مٹھائی جتنی آپ کی مرضی۔" ثمینہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

"ابھی کچھ زیادہ نہیں —؟" آمینہ نے پیار سے بہن کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" مجید بولا۔ "اپنی بیٹیا ہیرے کا ہار بھی کتنی قرم لے آئے۔"

"شادی پہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو رسم ہی کرنی ہے۔ نشانی میں انگوٹھی ہی ہوتی ہے۔"

"اچھا سب کچھ ہو جائے گا۔ کل اللہ کا نام لے کر ہم ان کے ہاں جا تو لیں۔"

دوسری شام منیرہ کو لے کر مجید ثوبیہ کے ہاں پہنچا۔ ثوبیہ کی امی انہیں دیکھ کر کھل اٹھی۔ حمید نے بھی پرتپاک خیر مقدم کیا۔

پرتکلف چائے کے بعد مجید نے کھنگار کر گلا صاف کرتے ہوئے آنکھوں سے منیرہ کو اشارا کیا۔ کہ وہ بات کرے۔

"آپ خود ہی کہیں نا —؟" منیرہ ہنس کر بولی۔

"نہیں بھئی! یہ عورتوں کی باتیں ہیں۔ تم ہی کہو —؟"

"یہ اچھی رہی۔ عورتوں کی کیا خاص بات ہے۔ بہتر ہے آپ شروع کریں۔ بات۔"

"کیسی بات!" ثوبیہ کی امی دانستہ انجان بن کر بولی۔

"اے۔ بھابی۔" مجید ہنس کر بولا "یہی رشتوں کی باتیں، عورتیں ہی کرتی ہیں نا۔ آپ سمجھ گئیں نا ——؟"

ثوبیہ کی امّی مسکرا کر چپ ہو گئی۔ مجید بھی زیرِ لب مسکرانے لگا۔ دونوں ان کا عندیہ سمجھ گئے تھے۔ آج کیا سمجھے ایک عرصے سے سمجھ رہے تھے۔

"حمید بھائی! ثوبیہ ہماری بیٹی ہے۔ آپ عامر کو اپنا بیٹا بنا لیں؟" مجید نے کچھ اس طرح کہا۔ کہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بھئی مجھے گول مول باتیں کرنا نہیں آتیں۔ سیدھی سیدھی بات کرتا ہوں۔ بیٹی بھی اپنی بیٹا بھی اپنا۔ کیوں جی ——؟"

"جی ——!" حمید نے مختصر سا جواب دیا۔

"اپنوں میں یہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ دیکھے بھالے ہوئے ہیں سب!" منیرہ بولی۔

منیرہ اور مجید عامر ہی کی باتیں کرنے لگے۔ اس کی صفات گنانے لگے۔ اس کے شاندار مستقبل کے متعلق بتانے لگے۔

بات ڈھکی چھپی تو نہ تھی۔ مجید اور اس کی بیوی بھی سب جانتے تھے۔ لیکن ایک دم سے ہاں نہ کہہ سکے۔ چند دنوں کے بعد جواب دینے کا رسمی تکلف ضروری سمجھا گیا۔ ویسے رضامندی اشارۃً کنایۃً جتلا ہی دی۔ بیٹیاں دینے کی چیز ہوتی ہیں۔ ایسا موزوں رشتہ مل گیا تھا۔ ایسی چاہت سے مانگا جا رہا تھا۔ پھر انکار کی کہاں گنجائش۔

مجید اور منیرہ خوش خوش واپس چلے گئے۔ ثوبیہ کی امّی اور حمید بھی خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ثوبیہ کے کانوں تک بھی خبر پہنچی۔ یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ آمینہ ثمینہ نے تو کئی دفعہ اسے منّی سی بھابی بھی کہہ دیا تھا لیکن آج اس خبر سے وہ گھبرا سی گئی۔ اسے بار بار آصف کا خیال آیا۔ اس خیال کے ساتھ کوئی پرانی یاد وابستہ نہ تھی۔ نہ ہی کسی ادھورے پیار نے کروٹ لی تھی۔ اس خیال کے ساتھ پشیمانی کا رنگ تھا۔ آصف ضدی اور اکھڑ سا آدمی تھا۔ بدلہ لینے

پہ آئے تو اخلاق کی ہر حد توڑ ڈالنے میں قباحت نہیں سمجھتا تھا۔ اس دن کالج اس نے ڈٹ کر جواب دے کر آصف کو مایوس کر دیا تھا۔ کیا عجب وہ کوئی انتقامی قدم اٹھائے۔

وہ کئی دن پریشان رہی۔ کبھی تو دل کو تسلی دے لیتی۔ دیکھا جائے گا۔ میں نے کوئی گناہ تھوڑا ہی کیا ہے۔ گھر میں ساتھ رہنے سے کچھ لگاؤ ہو بھی گیا تو کیا ہوا۔ اپنی ناسمجھی میں کچھ حماقتیں سرزد بھی ہو گئیں۔ ان کے لیے زندگی تھوڑا ہی اجیرن کر لوں گی۔ پھر ڈر کا کا۔ آصف کو کون سے محبت نامے میں نے لکھے تھے۔ جو ثبوت کے طور پر وہ عامر کے سامنے لا رکھے گا۔ اس کے پاس ہے ہی کیا۔ اگر اس نے کچھ کہا بھی تو میں صاف انکار کر دوں گا۔ نہ کوئی ثبوت نہ کوئی گواہ۔ وہ کیا کرے گا۔

وہ دل کو تسلیاں دے دے کر سمجھاتی۔ لیکن کسی وقت اس کا دل بے طرح گھبرانے لگتا۔ محبت مر گئی تھی۔ لیکن ضمیر تو زندہ تھا۔ اس نے آصف سے کیسے کیسے وعدے کیے تھے۔ کیسی کیسی امیدیں دلائی تھیں۔ آصف بھی اس کی طرح اسے بھول گیا ہوتا۔ تو بات اور تھی۔ لیکن کالج آ کر اس نے ثابت کیا تھا۔ کہ وہ اب تک اس کی آس لگائے بیٹھا ہے۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ منگنی کی تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ ثوبیہ کی خوش بختی میں کسے شک تھا۔ ہیرے کی نازک سی لیکن قیمتی انگوٹھی پہن کر اسے خود بھی اپنے جگمگاتے مستقبل کا احساس ہوا۔ آصف پہلے ہی کم سا دل میں گھر کیے بیٹھا تھا۔ ایسا ہوتا بھی تو ہیرے کی جگمگاہٹ میں اس کا خیال ماند پڑ جاتا۔

لیکن

اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی رہی سہی پریشانی بھی مٹتی گئی۔

زندگی نے فریب تو ہمیشہ دیئے تھے۔ لیکن اتنا بڑا جھانسا ۔۔۔؟ آصف کی حالت کئی دنوں تک سنبھل نہ سکی۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ آنکھوں میں وحشت بس گئی۔ چہرے پر مُردنی چھائی رہنے لگی۔

اس کے دوست حیران تھے۔ رُوم میٹ سعید نے کئی بار پوچھا بھی۔ لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ گم صم بیٹھا رہتا۔ دفتر میں بھی جیسے بے سُدھ سا رہتا۔ اس دن اسے بیٹھے بیٹھے چکر سا آگیا۔ گرتے گرتے بچا۔ سعید نہ ہوتا تو تیورا کر فرش پر گرتا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ کچھ دنوں کی رخصت لے لو؟" سعید نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ سہارا دے کر وہ اسے پلنگ تک لے گیا۔

"ٹھیک ہو جائے گی۔" آصف، سر تا پا پسینے میں بھیگ گیا۔

"یوں ٹھیک ہونے سے رہی۔" سعید نے سہارا دے کر اسے بستر پر لٹا دیا۔ "آصف تم تو پسینے میں بھیگ رہے ہو۔ کتنا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارا ماتھا۔ آصف۔ آصف۔"

"ہوں۔" آصف نے غنودگی میں ڈوبتے جواب دیا۔

"ایمبولنس منگواؤں۔ سی ایم ایچ لے چلوں۔" سعید نے جھک کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ آصف نے سر نفی میں ہلا دیا۔ لیکن زبان ہلانے کی ہمت نہ رہی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

"آصف ۔۔۔؟" سعید نے گھبرا کر اسے پکارا۔ لیکن وہ بولا نہیں۔ سعید اس کی کنپٹیاں سہلانے لگا۔ کبھی دل پر ہاتھ رکھتا کبھی نبض پر۔ پہلے تو آصف پر کبھی ایسا دورہ نہیں پڑا تھا۔ ہٹا کٹا

بوط جسم کا آدمی تھا۔

وہ اسے سی ایم ایچ لے جانے کے متعلق ابھی فیصلہ ہی کر رہا تھا کہ آصف نے کروٹ لی۔ آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے یونہی پڑا رہا۔

"اب کیسی ہے طبیعت؟" سعید اس پر جھک گیا۔

"اچھا ہوں۔؟" وہ آہستگی سے بولا۔

"تم نے تو ڈرا ہی دیا۔ میں تو ابھی بیرے کو بلا کر ایمبولنس منگوانے لگا تھا۔"

آصف زخمی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگا۔

"چائے پیو گے ۔۔۔؟"

"ہاں!"

سعید نے برآمدے میں نکل کر بیرے کو پکارا۔ وہ سامنے والے کمرے سے نکل کر شاید دھر ہی آیا تھا۔

"چائے لاؤ۔ خوب اچھی سی۔ گرم اور تیز ہو۔" سعید کہہ کر اندر آگیا۔ آصف اٹھ بیٹھا تھا۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی جھک کر وہ بوٹوں کے تسمے کھول رہا تھا۔

"لیٹے رہو۔ اٹھ کیوں بیٹھے؟"

"وردی بدل کر لیٹتا ہوں۔"

"ہُوا کیا تھا؟"

"پتہ نہیں سعید۔ یوں لگا جیسے دماغ کی ساری رگیں تن گئی ہیں۔ مجھے اس طرح محسوس ہوا۔ جیسے ابھی سر بھک سے اڑ جائے گا۔" اس نے ایک طویل آہ کھینچی۔

"بڑے دنوں سے پریشان ہو۔؟" سعید نے اپنی ٹوپی اتارتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی وردی نہیں بدلی تھی۔

"پریشانیوں مقدر بن گئی ہیں سعید ۔۔۔" وہ ہنسا۔ لیکن اس طرح جیسے ہنسنے کی

کوشش میں کوئی روڑے۔

"شاید تمہارا کوئی پرائیویٹ معاملہ ہے۔ جو تم بتانا نہیں چاہتے؟" سعید اپنے بولوں کے تسمے کھولنے لگا۔

آصف بنا کچھ کہے ساتھ والے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ نیلا سلیپنگ سوٹ پہن کر وہ واپس آیا۔ اور اپنے بستر میں گھس گیا۔ سعید نے اس کے سلیقے تک کمبل پھیلا دیا۔

"دوسرا کمبل ڈال دوں؟"

"بس کافی ہے۔"

"چائے پینے سے طبیعت کچھ بہل جائے گی" کہہ کر سعید بھی کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔

چائے آگئی۔ سعید نے بڑی محبت سے آصف کو چائے پلائی۔ آصف کی پریشانی سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ اتنا ہنس مکھ اور خوش اخلاق دوست ایک دم یوں بجھ جائے۔ تو بات الجھنے ہی کی تھی نا۔

باتوں باتوں میں سعید نے کُرید لیا۔ آصف کی برداشت بھی شاید اب جواب دے گئی تھی۔ غم سہارنے کے قابل نہ رہا تھا۔ دل کی بات سعید سے کہہ ہی ڈالی۔

"بڑے بزدل ہو۔" سعید اس کی نفسیات سے کہاں آگاہ تھا۔ روداد سن کر بولا۔

"اتنی سی ناکامی پر ہمت ہار بیٹھے۔ یہ کوئی بڑی بات تو نہیں۔ تم تو جان کا روگ بنا بیٹھے۔ میں تو آج ڈر ہی گیا۔ واہ۔ وا۔"

آصف بدستور سنجیدہ رہا۔ اس کے دکھ کی گہرائی تک پہنچ ہی کون سکتا تھا۔ ثوبیہ اس کے لیے کیا تھی۔ اسے جان لینا ہر کسی کا کام تو نہیں تھا۔

سعید اسے دم دلاسے دینے لگا۔ "دنیا بڑی وسیع ہے۔ میرے دوست۔ لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ ایک لڑکی کے لیے جان گنوا دینا کم از کم ایک سپاہی کے شایانِ شان نہیں

واپنی آن یوں تو نہیں گنوایا کرتے۔ اپنا دل بہلاؤ۔ دھیان دوسری طرف لگاؤ۔ بھلا دینا چھ مشکل نہیں۔ آجکل لیلیٰ مجنوں کا زمانہ نہیں۔ بچھڑ کر جینے کا ڈھنگ سیکھا جاتا ہے رنے کا نہیں ——"

اس شام سعید زبردستی اسے کلب لے گیا۔ آصف کی اتنے دنوں کی غیر حاضری سے س کے دوست احباب شاکی تھے۔

ں رہے؟"

"رنگ بڑا زرد ہو رہا ہے۔"

"کچھ تھکے تھکے سے لگتے ہو!"

"کہیں باہر گئے ہوئے تھے؟"

دوستوں نے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ آصف کی جگہ سعید چٹ پٹے سے جواب دے کر اسے چھیڑتا رہا۔ بیگم افضال سے بھی وہیں ملاقات ہو گئی۔ "اتنے دن ہو گئے تمہاری راہ دیکھتے۔ کہاں گئے تھے ——؟"

"جہنم کا ٹکٹ کٹا چکا تھا۔ شکر کریں میں واپس لے آیا۔" سعید نے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔" بیگم افضال حسبِ دستور چاہت کا اظہار کرتے بولی۔

کافی دیر ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہا۔ آصف کی ذہنی پریشانیوں نے پیچھا تو نہیں چھوڑا لیکن اس کا دل کچھ بہل ضرور گیا۔

"کچھ پیو گے؟" بیگم افضال کے جانے کے بعد سعید نے شوخ نظروں سے آصف کی آنکھوں میں جھانکا۔ آصف اس کا اشارہ سمجھ کر پھیکے انداز میں مسکرایا۔

پینے کی طلب سے وہ آنکھ نہ کر سکا۔ دونوں اٹھ کر بار میں آگئے۔ سعید نے تو حسبِ عادت ایک پیگ پیا۔ لیکن آصف کی طلب بڑھتی گئی۔ تلخ و ترش گھونٹوں میں اس کے غم جیسے گھلنے لگے۔

وہ شراب کا رسیا نہیں تھا۔ سعید کی سنگت میں کبھی کبھار پی لیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کی تلخی کچھ ایسی راس آئی۔ کہ وہ روز پینے لگا۔ بنا پیئے اسے قرار نہ آتا۔

سعید اس کی کثرت مے نوشی سے پریشان ہو گیا۔ اس نے تو اس دن اس کا دل بہلانے کو پلائی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا۔ کہ وہ یوں بہک جائے گا۔ روپے کے ساتھ صحت بھی برباد کرنے پہ تل جائیگا۔ لیکن آصف نے تو اپنا غم غلط کرنے کا وسیلہ ڈھونڈ لیا تھا تلخیٔ حیات کو ان جرعوں میں ڈبو لیا تھا۔ سعید نے اسے منع کرنے کی کوشش کی۔ بری بات ہے صحت تباہ کر لوگے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے بھلا۔ اچھے خاصے شریف آدمی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔ سعید نے زبردستی اسے بار سے اٹھا کر باہر لے جانا چاہا۔

آصف نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر اس کی بات رد کر دی۔ "شرافت کیا ہے۔؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ پاکیزگی کے قصے۔ یہ شرافت کے اصول۔ یہ اخلاق و کردار کی حد بندیاں سب فضول۔ ان کا کوئی مقصد نہیں۔ کوئی مقصد نہیں۔ سب بے معنی چیزیں ہیں۔"

سعید نے دیکھا وہ نشے میں تھا۔ نوبت یہاں تک آئے گی سعید۔ سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا۔ آصف اپنی روش سے ہٹا نہیں۔ اس نے ایسا دھچکا کھایا۔ کہ سعید کی کوششوں کے باوجود لڑکھڑاتا اس دلدل میں آن پھنسا جس میں پھنسنے سے کبھی عمران نے بھی اسے بچایا تھا۔ لیکن شراب میں تلخیوں کو ڈبونے کے باوجود وہ پارے کی طرح مضطرب و بیقرار رہنے لگا۔ زندگی کا بھیانک خلا کسی طور پورا نہ ہوا۔ سکون ناآشنا طبیعت اور بہکنے لگی۔ ثوبیہ، عامر اور مجید تینوں نام اس کے ذہن میں اٹھتے۔ بگولوں میں ہمہ وقت گردش کرتے رہتے۔ قصوروار کون تھا۔ اس تجربے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ وہ لٹ گیا تھا۔ برباد ہو گیا تھا۔ زندگی کی ہر خوشی اس سے چھن گئی تھی۔ تینوں برابر کے قصوروار تھے۔ اس کی نظر میں تینوں مجرم تھے۔

اب اس کا دل پر دقت ان مجرموں سے نپٹنے کے متعلق الجھا رہتا۔ غم کا چرکا اس

نے سہہ لیا تھا۔ لیکن زخم میں کسک ہر وقت اسے انتقام پہ اکسانے لگی۔ نفرت کی جبی ہوئی تہیں اور دبیز ہو گئیں۔ عورت پر سے اعتماد اٹھ گیا۔

ثوبیہ کے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے فضا میں اچھال دینے کی شدید تمنا محسوس کرتا تھا۔ مجید کے سینے میں گولی اتار دینے کا کئی دفعہ منصوبہ بنایا۔ عامر کا سینہ چھلنی کر کے مجید کو تڑپتا دیکھنے کی حسرت کئی دفعہ جی میں مچلی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ اس کی نس نس میں لگی آگ بجھنے کی بجائے اور بھڑک رہی تھی۔ شعلے خطرناک ہو رہے تھے۔ ان کی آتشیں زبانیں مجید اور عامر اور ثوبیہ کی ہر خوشی چاٹ لینے کو بے قرار نظر آتی تھیں۔

—

"بڑے دنوں بعد شکل دکھائی"۔۔۔ بیگم افضال نے گلہ کیا۔ کہاں رہتے ہو۔ آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔؟"

"اب روز آیا کروں گا۔"

"بہت آئے۔"

"نہیں یقین کریں۔ آیا کروں گا۔ آپ کی صحبت میں مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔"

آصف کی بات پر بیگم افضال ہنسنے لگی۔ ڈرائنگ روم میں وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی۔ پھر چائے کے بہانے اٹھ گئی۔ اس کی جگہ اس کی چھوٹی بہن ذکیہ آ بیٹھی۔ رضیہ تو اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ ہاں ذکیہ آصف سے چپکے چپکے محبت کی پینگیں بڑھانے کے تصور میں ضرور ڈوبی رہتی تھی۔ بیگم افضال بہن کے رجحان سے واقف تھی۔ اس لیے اسے آصف کے پاس بھیج دیا۔

"شکر ہے آپ کو بھی ہمارے ہاں آنے کا خیال آیا۔" ذکیہ نے روٹھے روٹھے شاکی لہجے میں کہا۔ آصف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ پلکوں کو بڑے حسین انداز میں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھنے لگی۔ ہونٹوں کو سکیڑ سمیٹ کر خفیف سی لرزش کے باوجود کچھ نہ کہا۔ لمبے لمبے پالش زدہ ناخنوں والے سفید سفید ہاتھوں کو مسلنے لگی۔

آصف اسے پوری آنکھیں کھولے دیکھتا رہا۔ یہ حسین انداز اس کا جانا پہچانا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن ۔۔۔ لیکن دوسرے لمحے اس کے لب بھنچ گئے۔ یہ لڑکیوں کے مردوں کو کوٹ لینے کے انداز تھے۔ جھانسا۔ فریب۔ دھوکہ۔ اس کے دماغ

ہار گیں سنسنانے لگیں۔

ہر لڑکی ثوبیہ ہے۔ ہر لڑکی فریبی دھوکا باز ہے۔ ہر لڑکی ناگن ہے ۔۔۔ لٹیری۔ ڈاکو ٹ کر چل دیتی ہے۔ آصف کے ذہن میں قیامت کا شور اٹھنے لگا۔ طوفان مچلنے لگے۔ و تیز تیز سانس لیتے ہوئے ذکیہ کو دیکھنے لگا۔

ذکیہ اس کی خاموشی سے الجھ کر گلدان کے پھول نوچنے لگی تھی۔ آصف کا ذہنی طوفان یں لقطے پر آ کر رک گیا۔ قیامت ایک موڑ پر آ کر جامد ہو گئی۔ ذکیہ اسے ثوبیہ لگی۔ جیسے ثوبیہ کیہ کے پیکر میں ڈھل کر ایک بار پھر لوٹنے کے لیے آ گئی ہو۔

لیکن ۔ اب وہ اس کا وار چلنے نہیں دے گا۔ لوٹنے سے پہلے ہی اسے لوٹ لے گا۔ تقدس، پاکیزگی، شرافت، اخلاق و کردار کے اصول سب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے ۔۔۔ بالکل اس طرح جس طرح ہیبت ناک زلزلے کے بعد بلند و بالا عمارتیں ملبے کے ڈھیر بن کر بکھر جاتی ہیں۔ اور ۔۔۔ جب ذکیہ اپنے دل سے مجبور ہو کر اس کے قریب آ بیٹھی اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تو ۔۔۔ اس کی نظریں بدل گئیں۔ اب تک ان نظروں میں دوستی کا وقار تھا۔

لیکن اب ۔۔۔ اک بھوک تھی۔ وحشت ناک بھوک۔

"آصف۔ آپ کچھ نہیں سمجھتے ۔۔۔" ذکیہ بے خودی میں کہہ گئی۔

"سب کچھ سمجھتا ہوں ذکیہ ۔۔۔" وہ اس کے ہاتھوں کو انتہائی جذبات انگیز طریق سے دبا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسا۔

ذکیہ معصومیت کے ہاتھوں فریب کھا گئی۔ لیکن آصف کی نظروں میں وہ ثوبیہ ہی کی طرح تھی۔ ثوبیہ جس سے انتقام لینے کو اس کی نس نس بے چین و بے قرار تھی۔ ذکیہ اس کی محبت میں ڈوبتی گئی۔ آصف اسے جھانسے دیتا گیا۔ اب تو اسے محبت کے دکھاوے کا گر آ گیا تھا۔

بیگم افضال اپنی کامیابی پر خوش تھی۔ آصف اور ذکیہ کو اکٹھے بیٹھنے باہر آنے جانے کے موقعے دینے لگی۔ افضال نے دو ایک بار ٹوکا بھی۔ آصف کی کثرتِ مے نوشی کے متعلق چرچے اس کے کانوں تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن بیگم افضال نے اس کی ایک نہ سنی۔

آصف ذکیہ کو لیے لیے پھرا۔ کبھی ہوٹل، کبھی سینما۔ کبھی کلب اور کبھی آبادی سے دور خاموش ویرانوں میں۔ ذکیہ اس کی محبت میں ڈوبتی چلی گئی۔ وہ اسے سبز باغ دکھلاتا رہا۔

جب وہ اس کے چوڑے کندھے سے سر لگا کر بے خود سی ہو کر کہتی۔ آصف کیا تم بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو۔ جتنا میں ——— تمہیں ———"

تو وہ نیم باز نظروں سے اسے دیکھ کر ہونٹوں میں طنزیہ سی مسکراہٹ کو بمشکل دبائے ہوئے بڑے عیاشانہ طریق سے کہتا۔ "میری محبت کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں ذکیہ ——— میرے پیار کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

ذکیہ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا بازو زور سے دباتی۔ آنکھیں بند کر کے بیخودی کے عالم میں بازو سے لپٹ جاتی۔ تو آصف کا جی چاہتا۔ بالوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالے۔ دھکا دے کر اس کا سر دیوار سے ٹکرا دے۔

دنیا کی ہر لڑکی اسے ثوبیہ جز نظر آتی تھی۔ ذکیہ کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اینگلو پاکستانی مس روبرٹا صدیق سے بھی عشق کی دنیا بسا رکھی تھی۔ نازک سی روبرٹا اس تنومند، حسین اور متوالے سے نوجوان کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی۔

آصف بڑی خوبصورتی سے دونوں سے عشق نبھا رہا تھا۔ محبت کے فریب دے رہا تھا۔ پیار کے جھانسے میں دونوں کو پھنسا رہا تھا۔ عورت پر اس کا اعتماد رہا ہی نہیں تھا۔ شرافت کے آداب بھلا چکا تھا۔ پھر اس سے خلوص کی توقع ہی کیوں کر کی جا سکتی تھی۔ اس شام وہ ذکیہ سے ملنے گیا۔ تینوں بہنیں شاید سینما کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔

"تم بھی چلو آصف۔ اچھا ہوا آ گئے۔" بیگم افضال نے کہا۔

"کہاں؟"

"پکچر۔"

"کوئی اچھی پکچر نہیں۔؟"

"نہ سہی۔ ذرا تفریح ہو جائے گی۔"

"تو آپ شوق سے کریں تفریح۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔"

"آپ کیا کریں گے؟ واپس چلے جائیں گے؟" ذکیہ نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں رکنے کی التجا تھی۔

"رک جاؤں گا لیکن چائے پی کر۔" آصف مسکرا کر بولا۔ اس نے جیسے التجا قبول کر لی۔

"تم بنا دو چائے ذکی ——" بیگم افضال نے جلدی سے کہا۔ "خانساماں تو نہیں ہو گا اس وقت۔"

"دیر ہو جائے گی باجی۔" رضیہ نے کہا۔

"ذکی نہ جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے؟" آصف نے کہا۔ وہ بڑے شاطرانہ طریق سے بیگم افضال کو دیکھ کر ہنسا۔

"لو بھئی ذکیہ سنبھالو اپنے مہمان کو۔" آزاد خیال بہن نے شاید موقع غنیمت جانا۔

ذکیہ بھی یہی چاہتی تھی وہ بولی۔ "آپ دونوں جائیں۔ ہم بھی چائے پی کر پہنچ جائیں گے۔"

"منظور ہے۔" آصف بولا۔

دونوں بہنیں تیار ہو کر چل دیں۔ ذکیہ باورچی خانے میں جا کر چائے بنانے لگی۔ آصف ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز ہو کر رسالہ دیکھنے لگا۔ ذکیہ چائے بنا کر لے آئی۔ آصف رسالہ دیکھنے میں منہمک تھا۔ ذکیہ نے چائے کی پیالی بنائی اور پھر چمچ سے پیالی بجا کر اسے متوجہ کیا۔ آصف جیسے کسی بھیانک خواب سے چونک اٹھا۔ ثوبیہ بھی یونہی پیالی بجا کر اسے مخاطب کیا کرتی تھی۔

آصف ذکیہ کو گھورنے لگا ... ذکیہ شرما شرما کر مسکرانے لگی۔ ہونٹوں کو سمیٹنے سکیڑنے

کا اندازہ کیا تو بنیہ ہی کا نہیں تھا۔ آصف اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں ذکیہ ثوبیہ کے پیکر میں ڈھلتی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے سامنے ذکیہ نہیں ثوبیہ بیٹھی ہے۔

ذکیہ اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر تھی۔ پیار و محبت کے اظہار کا موقع ملا تھا۔ اس کے قریب آ بیٹھی۔ اتنی قریب کہ آصف کے جوان جسم کی گرمی سے وہ موم کی طرح پگھلنے لگی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں۔ چائے نہیں پئیں گے ——؟" اس نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

آصف نے کچھ کہنے کی بجائے گردن کو خم دے کر اسے دیکھا۔ "آصف"۔ ذکیہ اس کی آنکھوں کے سحر میں کھو گئی۔ اس کے کندھے پر بڑی بے تکلفی سے سر ٹکا دیا۔

آصف نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی۔ اس کے ہونٹ ذکیہ کے بالوں سے چھو گئے۔ پھر اس کا بازو ذکیہ کی کمر کے گرد کیا۔ اور دوسرے لمحے اس کی گود میں آ رہی۔

اور —— پھر —— جذبات کے تقاضے بپھر گئے۔ کردار و اخلاق کے اصول بکھر گئے۔ شرافت کی حد بندیاں ٹوٹ گئیں۔ اور حیوانیت، نسوانیت کو نگل گئی۔ بھروسے اور اعتماد کا جنازہ اٹھ گیا۔

ذکیہ شاید اس طوفانی حادثے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ تیار نہ تھی۔ سانحہ گزر جانے پر بلک بلک کر روئی۔ لیکن آصف اس کے رونے پر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ سکون و اطمینان کا سرور بڑا طرب ناک تھا۔ خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس رگ رگ میں کروٹیں لینے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا سارا اضطراب، ساری ذہنی بے قراری اور سارا دماغی انتشار، آسودگی اور طمانیت سے ہم کنار ہو گیا ہو۔

وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتا رہا۔ ذکیہ اس کی ذہنی کیفیتوں کو کہاں جانتی تھی۔ روتی رہی۔ آصف اسے روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ اور۔ پھر۔ جیسے شیر کے منہ کو لہو لگ جاتے۔ آصف نے کچھ دنوں بعد روبرٹا کے ساتھ کھیلے جانے والے ڈرامے کو بھی اسی انجام کو پہنچا دیا۔

لیکن آصف کی بھوک مٹنے کی بجائے بڑھتی گئی۔ انتقام کی آگ سرد ہونے کی بجائے اور بھڑکتی گئی۔ اس کی گرسنہ نظریں ہر وقت تاک میں رہتیں۔ گھاگ شکاری کی طرح شکار کو گھیر گھار

کر اپنے حلقے میں لانے کا گر اسے بڑی اچھی طرح یاد آ گیا تھا۔

ایک دو تین اور پھر کئی لڑکیوں سے اس نے یہ کھیل بیک وقت کھیلا۔ بھوک مٹائی۔ تشنگی کو بجھایا۔ اضطراب وقتی طور پر دب جاتا۔ بے قراری لمحاتی وقفے کے لیے رک جاتی۔ لیکن روح میں لگی آگ نہ بجھ پاتی۔ وہ وحشی درندہ بن گیا۔ شریف لوگ اس کے سائے سے کترانے لگے۔ آوارہ اور لفنگے کے لفظ اس کے نام کے ساتھ چسپاں کیے جانے لگے۔

لیکن اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ اس رات ایک بجے لوٹنے پر سعید نے اسے سرزنش کی۔ وہ بھی اس کی سرگرمیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ ایسی باتیں چھپتی بھی کہاں ہیں۔

اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا: "تم شریف آدمی تھے آصف۔ یہ کیا کرتے پھرتے ہو؟"

"جینے کا ڈھنگ سیکھ رہا ہوں میرے دوست۔ جینے کا۔ زندہ رہنے کا۔ سمجھے!"

آج وہ پھر شراب کے نشے میں دھت تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے لباس تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سعید اس کی حالت پر کفِ افسوس مل کر رہ گیا۔

——

رنگ

برنگی برقی قمقموں سے سارا گھر لعلۂ نور بنا ہوا تھا۔ چمن میں رنگ برنگے شامیانے لگے تھے۔ شوخ رنگوں کی بہت سی کرسیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں پھول دار قالین کے گرد صوفے پڑے تھے اونچے اونچے گھنے درختوں میں روشنی کے بلب کچھ اس طرح الجھائے گئے تھے۔ یوں گمان ہوتا جیسے سبزے میں آگ لگ گئی ہو۔ روشنیوں کا دھندلا دھندلا غبار آسمان کو بھی روشن کیے ہوئے تھا۔ ان روشنیوں کے سامنے ستارے بھی ماند پڑ گئے تھے۔

بینڈ نے ایک سُریلی دُھن چھیڑی۔ خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ بینڈ کی آواز تیز ہوتی گئی۔ یوں جیسے ہر سُو نغموں کی بارش ہو رہی ہے۔ آصف بے قراری کے عالم میں خالی پنڈال میں ٹہلتا پھر رہا تھا۔ کبھی کرسی پہ بیٹھتا، کبھی صوفے پر۔

بینڈ نغمہ سرائی میں مصروف تھا۔ بہت سے لوگوں کی بیک وقت آمد پر آصف اٹھ کر گیٹ کی طرف گیا۔ پھولوں سے سجی عامر کی بادامی مرسیڈیز گیٹ سے لگ چکی تھی۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک ہجوم موٹر کے گرد جمع ہو گیا۔

آصف گیٹ کے قریب ایک طرف کھڑا محوِ نظارہ تھا۔ زرق برق لباس اور زیوروں کی جگمگاہٹ سے ماحول بڑا حسین و رنگین بن گیا تھا۔ بینڈ کی دھن اور لوگوں کی باتوں کا شور آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ ہجوم کو چیرتی ہوئی ثمینہ آگے بڑھی۔

"ذرا راستہ دو بھئی۔ دلہن کیسے موٹر سے باہر نکلے گی؟" اس نے دروازے کے قریب کھڑی لڑکیوں سے کہا۔

لڑکیاں بمشکل سمٹ سمٹا کر ایک طرف کو ہوئیں۔ "آیئے باجی!" ثمینہ نے آمینہ کے لیے قت تمام راستہ بنایا۔

"تم ہی سہارا دے کر نکال لاؤ دلہن کو۔" آمینہ عورتوں اور لڑکیوں کے درمیان پھنسی کھڑی تھی۔

"نہیں آپ آگے آئیں۔" ثمینہ نے کہا۔

کار کی پچھلی سیٹ پر عامر کے پہلو میں ثوبیہ زرنگار سی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ عامر نے کمخواب ی شیروانی پہن رکھی تھی۔ ہاروں سے لدا پھندا وہ کوئی شہزادہ دکھائی دے رہا تھا۔

کار کا دروازہ کھلا۔ آمینہ آگے بڑھی۔ اللہ کا نام لے کر اس نے دلہن کو تھاما اور کار سے باہر نکالا۔ دوسری طرف سے ثمینہ نے پکڑا۔ عامر بھی اترا اور دلہن کے پیچھے جیسے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ ثوبیہ اتنی جھکی ہوئی تھی۔ کہ آصف کو پنجوں کے بل ہو کر اچک کر اسے دیکھنا پڑا۔

مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ بینڈ نے نغمہ بن کر اور دھم چھیڑی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے سب گیٹ میں داخل ہوتے۔ دھکم پیل میں کئی بچے گر گئے۔ عورتیں اپنے قیمتی لباس مسلنے سے بچاتیں آگے بڑھیں۔

مجید سیاہ شیروانی اور قراقلی ٹوپی میں اپنی عمر سے دس سال چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ چہرے پہ پھولوں سے کہیں شگفتہ مسکراہٹ، آج وہ کتنا خوش تھا۔ اس کے انگ انگ سے جیسے خوشیوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ مبارک سلامت کے شور میں وہ اٹھلا کر قدم رکھتا آگے بڑھا۔

آصف نے اسے مسکراتے دیکھا۔ بے چینی سے رخ پھیر کر پھر ادھر دیکھنے لگا۔ جدھر عورتوں کے ہجوم میں گھری وہ زرنگار گٹھڑی جا رہی تھی۔

برآمدہ پار کر کے سب سامنے والے وسیع و عریض کمرے میں جمع تھیں۔ ایک مسند بچھی تھی۔ گاؤ تکیے کے سہارے ثوبیہ کو بٹھا دیا گیا تھا۔ عورتیں اور بچے اب بھی اوپر گرتے پڑتے تھے۔ روشنیوں کی جھال میں چمکتے لباس اور دمکتے چہرے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔

آج تو ماں نے بھی سفید چمکیلا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا وہ تاثر تو نہیں تھا۔ جو مجید کے چہرے پر تھا۔ تاہم وہ بھی ہنس رہی تھی۔ مسکرا مسکرا کر مبارک دینے والوں کو جواب دے رہی تھی۔

"ابا جان! بہو سلام کر رہی ہے؟" آمینہ نے مجید کے کمرے میں آتے ہی ہنس کر کہا۔

"سلامی دیں بھائی!" کسی رشتے کی بھابی نے کہا۔

"بہت اچھا۔ بہت اچھا۔" مجید خوش خوش آگے بڑھا۔

"کیا سلامی دے رہے ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"پانچ سو روپیہ۔" مجید اترا کر بولا۔

"کم ہیں۔ دلہن نہیں لیتی" کسی منچلے نے کہا۔

"پانچ سو اور سہی۔" مجید خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

"بس کافی ہیں۔" ایک اور آواز آئی۔ "اب ہٹو بھی مجید بھائی۔ کسی اور کو بھی دلہن کا منہ دیکھنے دو۔"

مجید ہٹ کر اک طرف کھڑا ہو گیا۔ "عامر کہاں گیا۔ اسے بھی دلہن کے ساتھ بٹھاؤ۔"

"بلاؤ اسے۔"

"ایک گاؤ تکیہ اور لے آؤ۔"

عامر کو بلایا گیا۔ آصف ایک طرف کھڑا یہ تماشا بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ عامر کا چہرہ اس کی چمکیلی شیروانی سے بھی زیادہ چمک رہا تھا۔ سر پہ آڑی سنہری ٹوپی تھی۔ گلے میں سلمے کے ہار تھے۔ وہ اک شان فاخرانہ سے آگے بڑھا اور ثوبیہ کے قریب مسند پر بیٹھ گیا۔

ثوبیہ کچھ اور سمٹ گئی۔ اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔ جانے کہاں سے مراثنیں آن ٹپکیں۔ دولہا دلہن کے سہاگ گیت لہک لہک کر گانے لگیں۔ ڈھولک کی آواز سے کان پھٹنے لگے۔ ایک البیلی سی سانولی میراثن اٹھ کر ناچنے لگی۔ اس کی تانبے ایسی رنگت روشنیوں کے سیلاب

میں کندنی نظر آنے لگی۔

اچھا خاصا زور ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آمینہ ثمینہ بھی جوش میں آ کر اٹھیں۔ اور بھائی بھاوج کے صدقے واری ہوتے ہوئے ڈھولک کی تھاپ پر ناچنے لگیں۔ خوشی سے قدم خود بخود اٹھ رہے تھے۔ ناچ کیا تھا۔ خوشیوں کے لبالب پیمانوں کے چھلکنے کا انداز تھا۔

"تم سلامی نہ دو گے دلہن کو — بھابی کو دیکھو تو آگے بڑھ کر!" کسی بھاری بھرکم عورت نے آصف کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"ضرور دیکھوں گا۔" آصف اس کے ساتھ کھنچتا چلا آیا۔

"جگہ دو بھئی۔ جلیٹھ صاحب آئے ہیں۔ سلامی دینے۔" شاید ثمینہ نے کہا۔

"تھوڑی نہ لینا۔ انکار کر دینا۔" دلہن کے کان میں کسی شوخ سی لڑکی نے اونچی آواز میں سرگوشی کی۔ سب ہنسنے لگے۔

آصف آگے بڑھا۔ مسند کے قریب گھٹنے کے بل یوں جھکا۔ جیسے کوئی پجاری دیوتا کے حضور میں جھک کر نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہے۔ کسی نے ثوبیہ کا سرخ جالدار ٹشو کا بھاری دوپٹہ پیچھے سرکا دیا۔ بھاری گوٹے کناری اور کرن کی جھالر نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنا دیا۔

آصف نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر اک حیا آلود تبسم تھا۔ ہونٹ بڑے خفیف لیکن حسین انداز میں کانپ رہے تھے۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے گلے میں بیش قیمت گلوبند — ہار نکلس اور جانے کیا کیا تھا۔ ماتھے کا جھومر اس کے نصیب ہی کی طرح چمک رہا تھا۔

"بہت دیکھ لیا۔ اب جیب ڈھیلی کرو۔" کسی نے کہا۔

آصف نے ثوبیہ پر نظریں جمائے ہاتھ جیب میں ڈالا۔ اور — جب اس نے ہاتھ باہر نکالا۔ تو اہل محفل پر لرزا سا طاری ہو گیا۔ کئی عورتیں خوف زدہ ہو کر کمرے سے باہر نکل

بھاگیں۔ عامر کا رنگ بھی دُھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید پڑ گیا۔ مجید کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں چھ بور کا پستول تھا۔

"آصف! ماں چیخی۔

"آصف!" آئینہ غش کھا کر گرنے لگی۔

"آصف!" ثمینہ نے اس پر جھپٹنا چاہا۔

لیکن تڑتڑاتی تین گولیاں ثوبیہ کے سینے کے پار ہو گئیں۔ آصف نے ایک قہقہہ لگایا۔ عامر غصے سے تلملا کر اٹھا لیکن چوتھی گولی اس کا سینہ چھلنی کر گئی۔ آصف نے اک اور قہقہہ لگایا۔ مجید تیورا کر گرا۔ اور گرتے گرتے دو گولیاں اس کے سینے میں بھی پیوست ہو گئیں۔ خون میں لت پت تڑپتی لاشیں دیکھ کر آصف قہقہے لگانے لگا۔ کمرہ بالکل خالی ہو گیا تھا۔ روشنیوں کا سیلاب رُک گیا تھا۔ اندھیرے اُمنڈ آئے تھے۔ ویرانیاں مسلط ہو گئی تھیں۔ اور آصف لاشوں کو پاؤں کی ٹھوکریں لگاتے قہقہے پر قہقہہ لگا رہا تھا۔

"آصف — ! روم میٹ سعید نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ کب سے سوئے ہوئے آصف کو دیکھ رہا تھا۔ آصف پہلے دو ایک بار ہنس کر پھر چپ ہو گیا تھا لیکن جب اس نے مسلسل قہقہے لگانے شروع کیے۔ تو وہ بستر سے نکل کر اس کے پلنگ کے قریب آ گیا۔ پہلے آہستگی سے ہلایا۔ لیکن جب وہ خواب سے بیدار نہ ہوا۔ تو خاصہ زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہوں۔" آصف نے ایک لمبی ہُوں کے بعد کروٹ بدلی۔

"ہوش میں آؤ۔" سعید نے اس کا سر ہلایا۔ "کیا ملا جو یوں ہنس رہے ہو؟"

"آں — آ — ں۔" آصف نے اَدھ کھلی آنکھوں سے اپنے اوپر جھکے ہوئے سعید کو دیکھا۔ دھیمی دھیمی روشنی میں اسے ہیولہ سا نظر آیا۔

"کیا بات ہے؟" سعید نے پوچھا۔

"کیوں۔" آصف نے غنودگی میں آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

سعید نے بتی روشن کر دی۔ آصف کے دیوانہ وار قہقہوں سے وہ بڑا پریشان ہوا تھا۔ آصف چند لمحے آنکھیں جھپکتا رہا۔ جب وہ حواس میں آیا۔ اور اسے حقیقت کا احساس ہوا۔ تو خونخوار نظروں سے سعید کو دیکھ کر بولا۔ "تمہیں کس نے کہا تھا جگانے کو۔ ظالم کہیں کے۔ میں کتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا۔"

"کسی پاگل خانے کی سیر کر رہے تھے شاید۔" سعید اس کی نظروں کو نظر انداز کر کے اپنے بستر میں گھس گیا۔

"پاگل خانے کی نہیں۔ عامر اور ثوبیہ کی شادی کی تقریب دیکھ رہا تھا۔" آصف نے اس کی طرف منہ کر کے کروٹ بدلی۔ "اللہ قسم! لطف آ گیا۔"

"چلو خواب میں تو دیکھ لی دلہن۔" سعید نے مذاق سے کہا۔

"چھ گولیاں۔ تین لاشیں۔" آصف جیسے بڑبڑایا۔

"کیا بک رہے ہو۔؟" سعید نے اس کی طرف دیکھا۔ آصف کی آنکھوں میں وحشت ناک سا تاثر تھا۔

آصف نے اپنا سارا خواب اس کے گوش گزار کر دیا۔

"میں تمہاری رائے پر بالکل عمل نہیں کروں گا سعید!" آصف پختگی سے بولا۔ "میں شادی میں ضرور شریک ہوں گا۔ ضرور —! وہ بڑے خوفناک اور بھیانک طریق سے ہنسا۔ سعید کو اس ہنسی میں اس کے خوفناک اور بھیانک ارادے کی جھلک نظر آئی۔

"ابھی شادی میں دو ہفتے باقی ہیں۔ دیکھا جائے گا۔ تم آرام سے سو جاؤ — ابھی — بتی بجھا دوں —؟"

سعید نے دانستہ کروٹ دوسری طرف بدل لی۔ وہ آصف سے اس بارے میں اس وقت کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آصف نے دو ایک بار آواز بھی دی لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے گہری نیند سو گیا ہے۔ لیکن وہ سویا نہیں تھا۔ وہ تو آصف کو شادی میں شرکت سے روک لینے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ خواب کو حقیقت بنا دینا آصف سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔

نے جانے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ کیا کیا ہلا دے دیے۔ اور آصف ان بہلاووں میں آ گیا۔ بہرحال شادی ہو گئی۔ آصف کو نشہ ہی میں رہا۔ ویسے اس دن اس کی حالت دید کے قابل تھی۔ بے آواز چیخ رہا تھا۔ بے صدا تڑپ رہا تھا۔ شراب تو اس دن اس نے اس قدر پی کہ ہوش ہی سے بیگانہ ہو گیا۔ سعید اس دن اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ شراب بے تحاشا پینے سے بھی منع نہیں کیا۔ شاید اس کے دکھ کی گہرائیوں کا اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ دل تڑپ تڑپ گیا اس کی محرومی پر۔

لیکن شادی کے کوئی ایک ماہ بعد آصف کو لاہور جانا پڑا۔ سرکاری ڈیوٹی پر۔ جسے روک لینا سعید کے بس میں نہیں تھا۔ آصف ان دنوں کچھ سکون پذیر تو تھا۔ وہی شراب اور عورت۔ وہی دلچسپیاں۔ جیسے دنیا میں اس کے لیے باقی رہ گئی تھیں۔ پھر بھی از راہِ احتیاط جانے سے پہلے سعید نے اسے اچھا خاصہ لیکچر دے ڈالا۔

آصف اس کی نصیحتیں سن کر مسکرا دیا۔ اور اس کے اصرار پر ان پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ بھی کیا۔ آصف سعید کے کہنے کے مطابق میس ہی میں ٹھہرا۔ تین دن کا کام تھا۔

لیکن پہلے ہی دن کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے گھر جانے کی خواہش بے طرح محسوس کی۔ کیپٹن سرور کا سکوٹر لے کر وہ تین بجے کے قریب گھر چل دیا۔ وردی میں گیا۔ اس کے ذہن میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بالکل خالی الذہن وہ گھر کی جانب اڑا جا رہا تھا۔

فروری کے نکھرے موسم میں دن بے حد حسین لگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا میں نرم نرم سی تپش کا احساس بڑا جانفزا تھا۔ فضا میں پھولوں کی [illegible]

سعید میں آ گیا۔

آصف نے سکوٹر گیٹ کے اندر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ چمن میں کوئی نہیں تھا۔ تین چار کرسیاں ایک گھنے درخت کے نیچے پڑی تھیں۔ گھاس بڑی نفاست سے کٹی تھی۔ روشوں میں پھولوں نے آگ سی لگا رکھی تھی۔ کہیں کہیں سائے دار درختوں میں نیلی پیلی کاغذی جھنڈیاں ابھی تک سرسرا رہی تھیں۔

آصف نے ایک گہری سانس لے کر ان الجھی ہوئی کاغذی جھنڈیوں کو دیکھا، اور پھر سوچ میں ڈوبا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا برآمدے میں آ گیا۔ مجید کے قہقہے پر وہ اپنی سوچ سے چونکا۔ وہ کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

آصف دوسری طرف جانے کی بجائے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا تھا آصف پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ مجید، ثوبیہ اور عامر کی نظریں بیک وقت اس پر پڑیں۔ آصف نے بھی ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ اور — پھر — اس کی نظریں ثوبیہ پر رک پڑیں۔

ثوبیہ درمیانی صوفے کے ایک طرف بیٹھی تھی۔ کیسری بنارسی، بھاری بھاری پلوؤں والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کو بڑے حسین انداز میں سیٹ کروایا تھا۔ کانوں میں لمبے لمبے کندنی آویزے تھے گلے میں چوڑا سا ساڑھی کی سانت کا کندنی گلوبند تھا۔ ہونٹوں پر ساڑھی کی مناسبت سے اسی رنگ کی لپ اسٹک لگی تھی۔ آنکھوں کو پنسل کی مدد سے بنا رکھا تھا۔ ننگے بے داغ ڈھلانی شانوں کو ساڑھی کے پلو سے ڈھانپنے کی کوشش کی تھی۔ شاید مجید کی وجہ سے حیا کا مظاہرہ یوں کرنے پر مجبور تھی۔

عامر اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اور مجید دائیں ہاتھ صوفے پر بیٹھا تھا۔ درمیانی میز پر پانڈنی کی نفیس کٹو میں سوکھا پھل پڑا تھا۔ ثوبیہ چلغوزے چھیل کر مجید کے سامنے رکھ رہی تھی۔ منیزہ وہاں نہیں تھی۔

آصف ساکت سا کھڑا رہا۔ نہ اس نے کسی کو سلام کیا۔ نہ اسے کسی نے بلایا۔ چند ثانیے خاموش ہی رہی جیسے ہر کوئی ٹھٹک کر رہ گیا ہو۔

"آئیے۔ آئیے ——" عامر نے پھیکے تبسم کے ساتھ خاموشی کو توڑا۔ آصف کو اس کی آواز کہاں سنائی دے رہی تھی۔

اس کے کانوں میں تو یہ جملہ اُتر رہا تھا "لو گڑیا تمہاری ہو گئی عامر۔ بالکل تمہاری" آصف کو جانے کیسے وہی گڑیا یاد آ گئی تھی۔ گڑیا عامر —— عامر گڑیا —— آصف کا سر چکرانے لگا۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ کانوں میں اترتا زہر قاتل بننے لگا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ چہرے پر اذیت ناک تاثر تھا۔ اس نے ہاتھ سے اپنے گھومتے سر کو تھاما۔ اور تیزی سے کمرے سے نکل کر کوریڈور کی طرف گیا۔

"ہونہہ ——" عامر حقارت سے ہنسا۔ "عجیب آدمی ہے سلام نہ دُعا"

"افسر بن گیا۔ لیکن رہا وحشی کا وحشی۔" مجید نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔

"اس وحشی کو تو میں نے انسان بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لیکن ——"

ثوبیہ جملہ ادھورا چھوڑ کر بڑے دلربا انداز میں عامر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر ہنسی۔ عامر بھی جواباً مسکرا دیا۔

ثوبیہ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر عامر کو آصف کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ اپنی جذباتی حرکتوں پر پردہ ڈال گئی۔ واقعہ اس طرح تراش کر سنایا۔ کہ بات بھی بن گئی۔ اور حقیقت بھی نظر نہ آئی۔ عامر کے دل میں کبھی میل آنے کا سوال ہی نہ رہا۔

آصف نے تینوں کے طنزیہ جملے سن لیے۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی۔ وہ تینوں اسی پر تبصرہ کرتے رہے۔ اور آصف تیزی سے چوبی زینے پر چڑھتا اوپر چلا گیا۔

اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ آگ —— چاروں طرف جلتی۔ آگ کی لپٹیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کیا کم چکرایا تھا۔ اس پر طنز و تمسخر۔ تن بدن میں آگ نہ لگتی تو کیا ہوتا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ ایک خالی کرسی پر گر گیا۔ اس کا سر ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اور کانوں میں طنز کی سیال آگ ابھی تک اتر رہی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ جانے کیا کیا

سوچ رہا تھا۔

کافی دیر اس کی حالت سنبھل نہ سکی۔ کبھی بے تابی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کبھی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ کبھی دانت پیسنے لگتا۔ انتقامی حس تڑپ رہی تھی۔ طنز کے تیروں نے اس حس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ شاید وہ سعید کی باتوں پر عمل کر ہی لیتا۔ لیکن اب۔ اب ایسا ممکن ہی نظر نہ آ رہا تھا۔

وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ سوچیں قیامت کے موڑ مڑتی رہیں۔ طوفانوں سے ٹکراتی رہیں۔ لیکن بالآخر یہ سوچیں اک انجام میں ڈھل گئیں۔ اس انجام کے تصور سے ہی وہ جھوم اٹھا۔ اس کے بھنچے ہونٹ مسکراہٹ آشنا ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہ کرسی سے اچھل پڑا۔ یوں جیسے کوئی بڑا ہی دقیق مسئلہ حل کر لیا ہو۔ مسئلہ جیسے کوئی میدان مار لیا ہو۔

اس کی مسکراہٹ کا کیا رنگ تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں کس طرح کی روشنی تھی۔ یہ صرف دیکھنے ہی سے پتہ چل سکتا تھا۔ وہ جتنا مضطرب و بے قرار تھا اتنا ہی پُرسکون نظر آنے لگا۔ آگ کی لپٹیں جیسے ٹھنڈی راکھ کا ڈھیر بن گئی تھیں۔

گنگناتا ہوا وہ اٹھا۔ الماری کھولی۔ سفید قمیض اور پاجامہ نکال کر پہنا۔ وردی احتیاط سے ہینگر میں ڈال کر الماری میں لٹکا دی۔

"آصف بیٹے!" منیرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"کب آئے بیٹا؟" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ اٹھتے ابال کو پوری طرح سے قابو میں کرتے ہوئے اس نے ماں کو سلام کیا۔ ماں نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ دعائیں دیتے ہوئے بولی۔

"ابھی آئے ہو؟"

"ہاں ہاں ماں! کچھ ہی دیر ہوئی

کیسے رہے۔؟" بہت دنوں بعد آئے۔ کبھی خط بھی نہیں لکھتے؟" ماں اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھے بغیر کہے گئی۔

"شادی ہو گئی ماں مبارک ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ماں کو ہنسی میں کچھ بناوٹ سی محسوس ہوئی۔ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بڑی شان دار شادی ہوئی ہو گی؟" اس نے پھر کہا اور ماں نے پھر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "یوں کیوں دیکھ رہی ہو ماں۔ شادی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ کچھ بتاتی ہی نہیں ہو۔" وہ خلافِ معمول بڑی شگفتگی سے کہہ رہا تھا۔

"خود ہی آ جاتے۔" ماں نے آہستگی سے کہا۔ "دیکھ لیتے شادی۔"

"خواہش تو بہت تھی۔ لیکن چھٹی نہ مل سکی۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ میں شامل ہو جاتا۔ تو سب کو دھڑکا ہی لگا رہتا۔ کہیں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ کیوں ماں ——؟" وہ عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"کرنا کیا تھا؟" ماں نے پوچھا۔ آصف کی شگفتہ مسکراہٹوں کی تہہ میں بیٹھی ہوئی قیامت اسے کہاں نظر آتی تھی۔ ذرا سا خدشہ ابھرا تھا۔ وہ ان مسکراہٹوں نے مٹا دیا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے یوں کہا جیسے بہت بڑا جھوٹ بولا ہو۔ "آپ کی بات کر رہا ہوں۔ اپنی نہیں۔ آپ کو دھڑکا لگا رہتا۔"

"مجھے خواہ مخواہ۔ ایسی کونسی بات تھی ——؟"

"کوئی بھی نہیں۔ مجھے اس کی کیا پروا۔ بالکل معمولی سی لڑکی ہے۔"

"فکر نہ کرو بیٹے۔ تمہارے لیے اتنی اچھی دلہن لاؤں گی۔ کہ بس!"

"واقعی۔ واقعی۔؟" وہ ہنس دیا۔ "حسین سی۔ چاند سی صورت والی۔ کیوں ماں۔ ثوبیہ کیا چیز ہے۔ پری لانا۔ پری!"

"دیکھ لینا ایسی ہی لاؤں گی۔"

"کب لاؤ گی؟"

"جب کہو گے؟"

"میں آج ہی کہوں تو؟"

"تو میں آج ہی بات چیت شروع کر دوں گی۔"

"واہ وا۔ ماں ہوئی نا۔ جو بات بیٹے نے منہ سے نکالی۔ اسی وقت پوری کر دی۔ زندہ باد ماں۔ زندہ باد!"

آصف کی باتوں سے ماں خوش ہو کر مسکرانے لگی۔ آصف نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ماں نے شفقت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

آصف کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"کیوں؟" ماں اس کی ہنسی کی کھوکھلی گونج سے گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں! سوچ رہا ہوں۔" وہ چپ ہو گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی۔ یہی کہ۔ تم مجھے شروع سے اسی طرح پیار کرتیں۔ تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"تو کیا شروع سے تمہیں پیار نہیں کرتی تھی کیا۔ پگلا کہیں کا۔ چل آ نیچے۔" ماں سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "دیکھو آصف۔ ثوبیہ کے سامنے۔ میرا مطلب ہے۔ یعنی۔ کچھ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا مطلب ہے۔ سمجھ گئے نا ——؟"

"ہاں ماں۔" وہ بڑے سعادت مندانہ طریق سے مسکرایا۔ "میں کوئی پاگل ہوں۔ بیتی باتیں یاد کرنے سے کیا حاصل۔ دوسروں کی زندگی خواہ مخواہ تلخ بناؤں گا۔"

"جیتے رہو۔" ماں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ جہاں نئے خانساماں کو رات کے کھانے کے لیے ہدایت دینا تھیں۔

آصف ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مجید وہاں نہیں تھا اور ثوبیہ بھی ابھی ابھی کمرے سے

نکل کر گئی تھی۔

"ہلو عامر ——!" آصف نے کہا۔

عامر نے چونک کر یوں دیکھا جیسے خواب سے بیدار ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

"شادی کی مبارک ہو بھئی۔ میں تو کوشش کے باوجود شامل نہ ہو سکا۔"

"ہم انتظار ہی کرتے رہے۔" عامر نے کوشش کر کے جواب دیا۔ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

آصف اتنی اپنائیت سے مبارک جو کہہ رہا تھا۔

"ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟" آصف مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"سوات۔" عامر اب بھی حیرت زدہ سا تھا۔ لیکن آصف اس سے یوں گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ اور عامر" اس کی عادت ہی ایسی ہے۔" سوچ کر اطمینان سے جواب دینے لگا۔ سوات کے بارے میں کافی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔

"ثوبیہ کہاں گئیں؟" اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"شاید کپڑے بدلنے۔" عامر نے کہا۔

"دلہن ہیں نا۔ بس دن رات یہی کام ——" آصف ہنسا۔ عامر بھی ہنسنے لگا۔

رات کے کھانے پر سبھی خوش و خرم تھے۔ آصف خوب چہک رہا تھا۔ مجید کو جس والہانہ پن اور محبت سے شادی کی مبارک دی تھی۔ وہ بھی حیرت زدہ ہونے کے بعد اب ضرورت سے زیادہ ہی خوش نظر آ رہا تھا۔

ثوبیہ کا نکھار کچھ ماند سا پڑ گیا تھا۔ شاید ضمیر کی کوئی چبھن اذیت دے رہی تھی۔ آصف جب بھی اس کی طرف دیکھتا وہ نظریں بچا لیتی۔ باتیں بھی بہت کم کر رہی تھی۔ عامر نے دو ایک بار چپ ہونے کی وجہ پوچھی۔ تو اس نے سر درد کا عام فہم بہانہ بنا دیا۔

آصف زیر لب مسکرانے لگا۔ لیکن جلد ہی باتوں میں مگن ہو گیا۔ وہ کتنا مطمئن، کتنا پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس فضا کی طرح جو کسی طوفان سے پہلے پُرسکون ہو جاتی ہے۔ کھانا

ختم ہوتے ہی مجید نے عامر سے کہا۔ "آمینہ کی طبیعت کھیک نہیں۔ ذرا اسے جا کر دیکھ نہ آئیں؟"

"صبح چلے جائیں گے۔" منیزہ نے کہا۔

"صبح مجھے وقت نہیں ملتا۔ ابھی کونسا زیادہ وقت ہوا ہے۔ عامر موٹر میں لے چلے گا۔ زیادہ دیر نہ ٹھہریں گے۔" مجید بولا۔ منیزہ کی اب انکار کی طاقت ہی کیا تھی۔ تیار ہو گئی۔ ثوبیہ کھانا ختم کرتے ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"جاؤ بیٹے ذرا گاڑی نکالو۔" مجید نے کہا۔

"اچھا ابا جان" وہ اٹھ بیٹھا۔

"ثوبیہ چلے گی ساتھ۔" مجید نے کہا۔

"میرے خیال میں نہیں جائے گی۔ اس کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔"

"خیر ہم جلد ہی واپس آ جائیں گے۔"

"گھنٹے پون گھنٹے تک لوٹ آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے!"

عامر گاڑی نکالنے چل دیا۔ مجید اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیزہ نے آصف سے کہا۔

"تم بھی چلو۔ دیکھ آنا آمینہ کو۔ کافی دنوں سے اسے بخار آ رہا ہے۔؟"

آصف نے شائستگی سے انکار کر دیا۔ میں بہت تھک گیا ہوں امّی۔ میرا بستر لگوا دیں ذرا۔ میں آرام کروں گا۔" "بستر تو لگوا چکی ہوں۔ خیر کل ضرور اسے دیکھ آنا۔" "اچھا۔" آصف اٹھ کر اوپر چلا گیا۔ اس کے خیالات پھر گڈمڈ ہو گئے تھے۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں درندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہونٹوں پر بڑی ہی پُرفریب اور شیطانی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"آہا ہا۔ ہا۔" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس کی ساری سوچیں جس انجام میں ڈھل گئی تھیں اس کے لیے موقع اسے اتنی جلدی مل جائے گا۔ اسے اس بات کا یقین ہی نہ آتا تھا۔

"کون ——؟ اوہ ۔ آپ ——! " ثوبیہ اسے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر گھبرا سی گئی ۔ جلدی سے پلنگ پر بیٹھ کر اس نے کمبل اپنے اوپر ڈال لیا ۔ اس نے شب خوابی کا مہین گلابی لباس پہن رکھا تھا ۔ خوبصورت لیس دار گاؤن دور الماری میں رکھا تھا ۔ اس لیے بے پردگی کے خیال سے کمبل ہی قریب نظر آیا ۔ اس نے جلدی سے اپنا مہین لباس سے چھلکتا جسم کمبل میں چھپا لیا ۔

" اوہو " آصف جیسے غنودگی میں بڑبڑایا ۔ کتنا حسین منظر دیکھا تھا ۔ اس نے ثوبیہ کو یوں تو پہلے بھی دیکھا تھا ۔ لیکن اب —— اب تو شعلہ قیامت بن چکا تھا ۔ کلی نکھر کر پھول بن گئی تھی ۔ آصف کے حواس پر جیسے نشہ سا چھا گیا تھا ۔ مہین لباس میں انگڑائیاں لیتی کافر جوانی کسی شراب سے کیا کم تھی ۔

" آپ —— ؟ " ثوبیہ اسے اپنی طرف قدم اٹھاتے دیکھ کر گھبرا گئی ۔

" جی ۔ ہیں ۔ ! " وہ آنکھ کے بند گوشے سے اسے دیکھ کر بڑے ہی شاطرانہ طریق سے مسکرایا ۔ " گھبرا کیوں گئیں ۔ کوئی اجنبی تو نہیں تمہارا جانا پہچانا ہوں ۔ "

ثوبیہ سرتاپا کانپ گئی ۔ لیکن حواس بجا رکھتے ہوئے ذرا تیزی سے بولی " آپ اس طرح میرے کمرے میں کیوں چلے آئے ۔ کم از کم آواز تو دے لی ہوتی ۔ "

" آہا ہا ہا —— " وہ بھیانک طریق سے ہنسا " یہ تکلفات اب ضروری ہو گئے ہیں شاید کوئی زمانہ تھا ۔ کہ ایک دوسرے کی روحوں میں اترنے کی قید نہ تھی لیکن اب ہا ہا ہا ۔ "

ثوبیہ نے نظر بھر کر اسے دیکھا ۔ وہ آصف نہیں ۔ کوئی لوفر آوارہ لفنگا دکھائی دے

رہا تھا ۔ شرابی بدمست ۔ بہکا ہوا ۔ اس کی آنکھیں ؟ اُف توبہ —— ! ثوبیہ کا دل بیٹھ گیا ۔ آنکھیں تھیں جیسے دو آتش فشاں دہک رہے ہوں ۔

آصف اسے متبسم ہونٹوں لیکن آگ برساتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھا ۔ ثوبیہ نے گھبرا کر اسے دیکھا ۔ کمبل میں اور سمٹ سکڑ گئی ۔ آصف کے چہرے پر بڑی ہی گھناؤنی مسکراہٹ تھی ۔ اس کے تیوروں سے ثوبیہ خوف زدہ سی ہو گئی ۔

" آصف ! —— " اس نے انتہائی بیچارگی سے کہا ۔

" آصف نہیں وحشی کہو ۔ وحشی ۔ " وہ ایک دم گرجا ۔ اس کے ہونٹوں سے تبسم غائب ہو گیا ۔ اس کی آنکھوں میں خباثت کا غبار اور گہرا ہو گیا ۔

" وحشی ۔ ! جسے تم نے انسان بنانے کی پوری پوری کوشش کی ۔ لیکن —— " آصف رکا ۔ اس نے بھوؤں کی دائیں کمان اوپر کھینچ کر نظروں کے کھولتے ہوئے طنز کی اس پر جیسے بارش کر دی ۔ " لیکن جو انسان نہ بن سکا ۔ یہی کہنا تھا نا —— ؟ "

ثوبیہ نے خوف کی سرد سی لہر اپنے سارے جسم میں اٹھتی محسوس کی ۔ آصف نے آگے بڑھ کر جھپٹ کر اس کا کمبل پرے ہٹانا چاہا ۔ آصف کا ہاتھ کمبل کی بجائے اس کے گریبان پر پڑا ۔ اور جھٹکے سے لیس دار گریبان کئی جگہ مسک گیا ۔

" یہ کیا بے ہودگی ہے ۔ " وہ غصے سے سرخ ہو کر چیخی ۔ گھبراہٹ اور خوف سے اس کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا ۔

" آہا ہا ہا —— ہا —— " آصف نے ایک خوفناک اور دل ہلا دینے والا قہقہہ لگایا ۔ " ہماری باتیں تمہیں بیہودہ لگتی ہیں اب —— ہاں جی —— وقت وقت کی بات ہے ۔ جو جی چاہے کہہ لو ۔ کہنے کا حق رکھتی ہو —— پورا —— پورا حق —— قہقہہ لگا کر آصف مڑا ۔ ثوبیہ کی جان میں جان آئی ۔ جلدی سے گریبان کے کھلے بٹن بند کرنے لگی ۔

لیکن —— آصف کمرے سے گیا نہیں ۔ واپس پلٹ کر اس نے دروازے کی

چٹخنی چڑھادی۔

"آصف ۔ !" ثوبیہ خوف اور گھبراہٹ کے باوجود زور سے چیخی ۔ "دروازہ کیوں بند کیا ہے ۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے بیہودہ کہیں کے ۔ کیوں بند کی چٹخنی ۔"

"ابھی بتائے دیتا ہوں ۔" وہ مڑا اور ثوبیہ کے قریب آگیا ۔ ثوبیہ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوگیا ۔ سارا جسم جیسے شدید زلزلے کی زد میں آیا ہوا تھا ۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے ۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے ۔ حیرت اور غم سے جیسے سکتہ ہوا جارہا تھا ۔

آصف کے تیور خطرناک تھے ۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بیچارگی سے بولی ۔ "تم ۔۔۔ تم کیا کررہے ہو ۔ کیا ۔ کیا کہنا چاہتے ہو ۔ ؟"

"میں ۔ !" وہ اس کے قریب آکر قدرے جھکتے ہوئے بولا ۔ "میں تمہیں بتانے آیا ہوں ثوبیہ ۔۔۔ کہ وحشی انسان بن جائے تو عظیم ہے ۔ لیکن انسان وحشی بن جائے تو اس کی بربریت کا اندازہ نہیں ہوسکتا ۔"

"آصف ۔۔۔" ثوبیہ کی آواز اک لمبی چیخ تھی ۔ ڈر کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا ۔ سانس چھاتی میں رکنے لگا ۔ سرتاپا کانپنے لگی ۔

آصف نے اس کا کمبل پرے پھینکا ۔ ثوبیہ نے اپنے چھلکتے وجود کو سمیٹ کر چھپانے کی کوشش کی ۔ سارا بدن پانی پانی ہوگیا ۔ آصف نے ایک قہقہہ لگایا ۔ کتنی حسین ہو ۔ میری جان کتنی حسین ۔" آصف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ۔ ثوبیہ تڑپ کے کمرے سے نکل بھاگنے کا ارادہ کیا ۔ وہ پلنگ سے کودی ۔ فوم ربڑ والا لچکیلا سپرنگ دار پلنگ چرچرایا ۔

لیکن دوسرے لمحے اس سے کہیں زوردار آواز پیدا ہوئی ۔ آصف نے ثوبیہ کو پکڑ کر پلنگ پر دھکیل دیا تھا ۔ آصف کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا ۔ خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا ۔

"بچ کر نکلنا چاہتی ہو ۔ وہ غصے سے گرجا اور دانت پیستے ہوئے بولا ۔" اس وہم

کو دل سے نکال دو ۔ آج میں اس تنہائی سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا ۔ آج تمہیں بتاؤنگا کہ وحشی کیسا ہوتا ہے ۔ زہریلی ناگن تم نے میری نس نس میں زہر گھول دیا ہے ۔ سہارا دے کر پٹخا ہے ۔ ہاتھ تھام کر گرایا ہے ۔ بے وفا لڑکی ۔"

ثوبیہ پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی ۔ اس کا سارا جسم بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا ۔ ہاتھ پاؤں میں ٹھنڈے پسینے آرہے تھے ۔ اب تو بالکل برف کے تودے بن گئے ۔

"خدا کے لیے آصف ! اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے ۔

آصف نے اس کی بے بسی پر ایک اور قہقہہ لگایا ۔ ثوبیہ کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آگئے ۔ وہ زوردی ۔ بے اختیاری سے رودی ۔ لیکن ترس کا سوال ہی کہاں تھا ۔

"تم نے میرے سینے میں ناسور ڈالا ہے ثوبیہ ۔ میری محبت کا مذاق اڑایا ہے میری چاہت ، میرے ولولے ، میرے پیار کا تمسخر اڑایا ہے ۔ مجھے لوٹ کر تم نے میرے ازلی دشمنوں کو شاد کیا ہے ۔ تمہارا کیا خیال ہے ۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا ؟"

"آصف ۔ خدا کے لیے آصف ۔ ثوبیہ کی گگھی بندھ گئی ۔

"جب مجھ پر کسی نے ترس نہیں کھایا ۔ تو میں کسی پر کیوں ترس کھاؤں ۔ تم سب نے مجھے لوٹا ہے ۔ میں تم سب کو لوٹ لوں گا ۔ تمہارے دلوں میں ناسور ڈال دوں گا ایسا داغ دوں گا جسے چھپائے بھی نہ بن پڑے اور دکھائے بھی نہ بنے ۔ جس آگ میں میں جل رہا ہوں ۔ اس سے کہیں زیادہ تباہ کن شعلے تم پر برساؤں گا ۔ ذلیل عورت اپنے مہیب انجام کو تیار ہوجا ۔"

"مجھے مار ڈالو آصف ۔ لیکن ۔۔۔ لیکن ۔" وہ کانپتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی ۔ اس میں اب تو چیخنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی ۔ چیخنے کا فائدہ بھی کیا تھا ۔ گھر میں تھا ہی کون ۔ سب نوکر بھی جاچکے تھے ۔

"میرا گلا دبا آصف ۔ لیکن ۔۔۔" وہ تڑپ کر بولی ۔ رکتے ہوئے چیخی ۔

"یہ بھی سوچا تھا۔ لیکن کہیں۔ میری آگ اس طرح ٹھنڈی نہیں ہو سکتی تھی۔ نہیں ہو سکتی تھی۔ نہیں۔ نہیں ہو سکتی تھی۔"

وہ طوفانوں کی طرح بپھر رہا تھا۔ وہ درندوں کی طرح گرج رہا تھا۔ ثوبیہ نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ گرداب میں پھنسی بے سہارا کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔

آصف پلنگ پر بیٹھتے ہی اس پر جھک گیا۔ وہ چیخی۔ چلائی۔ ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن ایک بپھرے ہوئے وحشی کے سامنے اس کی کیا طاقت و مجال تھی۔ اس کی مزاحمت، اس کی چیخ و پکار۔ اس کی آہ و زاری کسی کام نہ آئی۔

آصف نے اسے بے دردی سے لوٹ لیا۔ زمین آسمان لرز اٹھے۔ ہوائیں دم بخود ہو گئیں۔ فضا ساکت ہو گئی۔

"ذلیل عورت۔" آصف نے بے دم سی ثوبیہ پر حقارت سے ایک نگاہ ڈالی۔ ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر بھی وہ زور زور سے قہقہے لگاتا رہا۔ پھر اطمینان سے وردی پہنی۔ اور نیچے آ گیا۔

ثوبیہ اب تک نیم بے ہوشی کے عالم میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کا خوبصورت لباس بے ترتیب تھا۔ گریبان تار تار تھا۔ گردن سینے بازوؤں اور چہرے پر نیل پڑ گئے تھے بالوں کی بناوٹ الجھ گئی تھی۔ جسم نیم برہنہ اور داغ داغ تھا۔

ایک خاموش فریاد کی طرح بستر پر پڑی تھی۔ آصف اسے غور سے دیکھتے ہوئے اپنی روح میں سکون و اطمینان کی لہریں سی اٹھتی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اضطراب کو قرار آ گیا تھا۔ آج وہ خلا بھی پُر ہو گیا تھا۔ جو ہر لڑکی کو لوٹ لینے کے باوجود بھی قائم رہتا تھا۔

وہ ثوبیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں وہی گڑیا گھوم رہی تھی۔ اس گڑیا اور ثوبیہ میں بڑی مناسبت نظر آ رہی تھی۔ کچھ ایسا ہی حشر اس نے اس گڑیا کا بھی کیا تھا۔

جب بھی اسے انگ انگ میں سکون و اطمینان کی لہریں اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ اور اب بھی خوشی کا پاگل کر دینے والا احساس حواس پر نشے کی طرح چھا رہا تھا۔

بچپن میں عامر اور مجید سے انتقام لینے کو اس نے اپنی جان سے زیادہ عزیز گڑیا توڑ پھوڑ ڈالی تھی۔ اور اب اسی حس کے تحت اس نے ثوبیہ کو روند ڈالا تھا۔

ثوبیہ ——! جو اس کا مقدس پیار تھی۔ جو اس کی روح تھی۔ زندگی تھی اور جسے بڑی بڑی جذبات انگیز تنہائیوں میں بھی اس نے بُری نظر سے دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔

لٹی پٹی ثوبیہ کو دیکھ کر اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ اور پھر دیوانہ وار قہقہے لگاتا رہا۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ نظریں ثوبیہ پر جمی تھیں۔ قہقہوں کی گونج سے فضا تھرا رہی تھی۔ وہ خود پاگل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قہقہوں میں خوشی کی گونج نہیں تھی۔ نفرت، حقارت اور تمسخر کا زہر گھلا تھا۔

اور جب عامر دروازے میں داخل ہوا تو اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ سر تا پا دیکھا۔ اس کے قہقہے رکے نہیں بلکہ کچھ اور زوردار ہو گئے۔ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی عامر کی نظر ثوبیہ پر پڑی۔ اس کے پاؤں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔

"ثوبیہ۔!" وہ چیخ کر اس کی طرف بڑھا۔ بے اختیار اسے بازوؤں میں دبوچ کر چیخا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ عامر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ سب کچھ سمجھنے کے باوجود کچھ نہ سمجھ سکا۔

آصف نے پھر قہقہہ لگایا۔ قہقہے کی آواز پر مجید بھی ادھر ہی چلا آیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔ "جو یوں ہنس رہے ہو۔" عامر ثوبیہ ثوبیہ پکار رہا تھا۔ اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مجید بھی جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

"کیا ہوا ثوبیہ کو؟" وہ عامر کی پشت پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"ایک وحشی نے لوٹ لیا۔" آصف کے جملے کے ساتھ ہی اس کی نظروں نے ثوبیہ

کا جو حشر دیکھا۔ تو کھڑا رہنے کی ہمت نہ رہی۔ منہ سے کوئی بات ہی نہ نکل سکی۔ ثوبیہ کو دیکھنے کے بعد مزید کسی وضاحت کی کیا ضرورت رہی تھی۔ وہیں قالین پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے مجید نے اپنا سر تھام لیا۔

آصف خوشی سے جیسے دیوانہ ہو گیا۔ بچپن کا وہ سین نظروں میں گھوم گیا۔ جب وہ چھوٹی گڑیا سے لپٹ کر عامر رو رہا تھا۔ اور غم و غصہ سے مجید بے دم سا ہو گیا تھا۔

روح میں وہ کیف زا احساس اترتا محسوس کر کے جیسے آصف کی عمر بھر کی محرومیوں اور ناکامیوں کو تسکین مل گئی۔ زندگی کے جھلسے ہوئے لمحوں پر جیسے ایک دم بارش کے چھینٹے پڑنے لگے۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا۔

"یہ۔ یہ۔" مجید کا سانس ہی ٹھیک سے نہیں آ رہا تھا۔ آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ آصف کو کھلی بے نور سی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ آصف نے مجید، ثوبیہ اور عامر کو دیکھا۔ اُن کی تڑپ پر اس نے اب اور بھرپور گونج دار اور بھیانک قہقہہ لگایا۔

"یہ۔ یہ کیا۔ کیا تو نے۔ ذلیل کمینے۔" مجید سر تھامے بولا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اور چہرے پر مُردنی چھائی جا رہی تھی۔

"تمہارے سینے میں ناسور ڈال دیا ہے۔ وہ جھنجھلائے ہوئے بھیڑیے کی طرح بولا۔ "تمہارا کلیجہ چیر ڈالا ہے۔" عامر تھر تھر کانپتے ہوئے ثوبیہ پر گرا جا رہا تھا۔ حواس پر تو جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ اتنا ظالم وار۔ اتنا شدید دھچکا۔ وہ خود بھی جیسے ہوش سے دُور ہوا جا رہا تھا۔

"تم نے ہمیشہ میرا حق چھینا۔" آصف خوف ناک انداز میں غرایا۔ "میری خوشیاں ہمیشہ اپنے بیٹے کی جھولی میں ڈال دیں۔ ہمیشہ مجھے محرومیت کے داغ دیئے۔ تم جلاد ہو۔ عامر بھی جلاد ہے۔ ثوبیہ بھی جلاد ہے۔ میری محبت کا تمسخر اڑا کر وہ چین سے رہ سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔ ذلیل عورت ہو تم۔ میری محبت کو روندا۔ پامال کیا۔ آج میں نے ان سب

ابدلہ لے لیا ہے۔ تمہارے سینے پر وہ داغ لگایا ہے۔ جو بن کر دہکتا رہے گا۔ تم تینوں اس لگائے کی جلن سے تڑپو گے۔ یہ جلن کبھی نہیں مٹے گی۔ کبھی۔ نہیں مٹے گی۔ کبھی نہیں مٹے گی۔ تم ہمیشہ تڑپو گے۔ تینوں۔ تم تینوں۔ مجھے مار ڈالو۔ پھر بھی یہ جلن نہیں مٹے گی۔"

اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ اور پھر قہقہے لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔ منیرہ جلدی سے اس رف آئی۔ مزدور کی آوازوں اور قہقہوں سے گھبرا گئی تھی۔

"آصف۔" اس نے تیزی سے باہر جاتے آصف کو پکارا۔

لیکن وہ رکا نہیں۔ تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

"ذلیل کمینے۔" منیرہ کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے عامر کی گونج سنائی ی۔ پھر تیزی سے وہ باہر لپکا۔

لیکن آصف جا چکا تھا۔ آج اسے تسکین مل گئی تھی۔ آج خلا پُر ہو گیا تھا۔ خوشی اپاگل کر دینے والا احساس رگ رگ میں کروٹیں لے رہا تھا۔ اس احساس کی لذت سے سرشار وہ سکریٹر کو پوری رفتار سے چھوڑے میس کی طرف چلا جا رہا تھا۔

اس بات سے بے خبر۔ کہ۔ عامر بھرا پستول لیے گاڑی کو ستر میل کی رفتار پر چھوڑے ں کے تعاقب میں آ رہا ہے۔

رضیہ بٹ

"فرح"۔ وزیر آباد

(سلطان احمد خوش نویس، گجرات، ۷۳ء)